إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا (الحديث)

خُطباتِ راشدی

جلد دوم

افادات

مفکر اسلام حضرت مولانا زاھد الراشدی

شیخ الحدیث جامعہ نصرت العلوم

ترتیب

قاری جمیل الرحمٰن اختر

ناشر

الشریعہ اکیڈمی

خطبات راشدی

—— جلد دوم ——

افادات

ابو عمار زاہد الراشدی

مرتب

قاری جمیل الرحمن اختر

ناشر

الشریعہ اکیڈمی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

کتاب .... خطباتِ راشدی (جلد دوم)
افادات .... ابو عمار زاہد الراشدی
مرتب .... قاری جمیل الرحمٰن اختر قادری
معاون .... خبیب الرحمٰن
طباعت .... سنہ 1437ھ بمطابق سنہ 2016ء
صفحات 369
ناشر .... الشریعہ اکیڈمی
ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ
فون: 055-4271741/400394

واحد تقسیم کار
انجمن خدام الاسلام حنفیہ قادریہ
042-36862816,0300-9496702

لائبریری
الشریعہ اکادمی
۳۸۰۷

فہرس

حرف اول 05

خطبات

1) اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت (1) 09
2) اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت (2) 18
3) اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم 25
4) فہم قرآن 32
5) قرآن و حدیث 40
6) قرآن مجید کے آداب 49
7) رمضان اور قرآن 56
8) قرآن کی تلاوت 69
9) حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم 75
10) علم حدیث سے محدثین کا استدلال 83
11) امام بخاریؒ اور علم حدیث 89
12) قادیانیوں کے متعلق علماءِ کرام کا مؤقف 98
13) منصب رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم 105
14) سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ 114
15) امام ابو حنیفہؒ کا سیاسی ذوق 120
16) فقہ حنفی تدوین کا مرحلہ 129

(17	ہم حنفی کیوں ہیں؟	142
(18	امام ابوحنیفہؒ کی فقہ	151
(19	حج کا سبق	162
(20	عید قربان کا فلسفہ	171
(21	مدارس کی تعلیم	181
(22	دینی طلباء سے خطاب	191
(23	آج کے حالات میں علماءِ کرام کی ذمہ داریاں	202
(24	علماءِ کرام اور جدید دور کے تقاضے	210
(25	امت مسلمہ کو درپیش چیلنجز	216
(26	امت مسلمہ کے مسائل اور علماءِ کرام کا کردار	225
(27	نیم ملا خطرہ ایمان	231
(28	دعوت و تبلیغ کا دینی فریضہ	240
(29	تدریسی عمل میں استاد کا کردار	249
(30	اسلام اور مغربی تعلیم میں فرق	264
(31	اُخروی زندگی	298
(32	انسانی حقوق اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	307
(33	انسانی حقوق کا مغربی فلسفہ	315
(34	اسلامی معیشت	322
(35	مکالمہ بین المذاہب	330
(36	خطابت اس کے دائرے	337
(37	توبہ اور استغفار کی ضرورت	347
(38	تذکرہ فاروقؓ اور حسنینؓ	352
(39	تحفظ سنت	358

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ اوّل

اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، نبی محترم، نبی محتشم اور آپ کے اصحاب و آل پر لاکھوں کروڑوں درود وسلام۔

ہوں لاکھوں سلام اس آقا پر بت لاکھوں جس نے توڑ دیئے
دنیا کو دیا پیغام سکوں طوفانوں کے رخ موڑ دیئے
اس محسن اعظم نے کیا کیا نہ دیا انسانوں کو
منشور دیا دستور دیا کئی راہیں دیں کئی موڑ دیئے

بندہ عرض گزار ہے کہ ہر کام کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں ایک وقت مقرر ہے۔ بندہ لاکھ چاہے بھی تو آگے پیچھے نہیں ہوتا اور وقت مقرر کا علم بھی اُس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کام ہو نہ جائے۔ خطبات راشدی (جلد اول) کی اشاعت اول کے بعد ہی (اب دوسرا ایڈیشن چل رہا ہے) کوشش تھی کہ جلد دوم منظر عام پر آجائے لیکن بسیار کوشش کے نہ آسکی۔ پھر جلد اول کی اشاعت اول ختم ہوگئی تو احباب کی طرف سے بہانے بہانے سے مطالبہ بھی ہونے لگا۔ جس سے ارادہ بنتا بھی تھا اور ٹوٹتا بھی۔ اصل بات تھی کہ ابھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وہ وقت نہیں آیا تھا۔

باعث تاخیر کچھ اپنی بیماری بھی بنی اور ایام بیماری میں چند مضامین کو آڈٹ کیا بھی۔ اور پھر وہ مسودہ گھر میں ہی کہیں کھوگیا، اور اس کا ڈیٹا کمپیوٹر میں تلاش کیا گیا تو وہاں بھی نہ دارد، کیونکہ یہ کام کمپیوٹر پر میرے بڑے بھائی انیس الرحمن اطہر صاحبؒ کر رہے تھے، وہ 2013ء میں انتقال فرما گئے۔ نہ وہ مسودہ ملا، نہ ڈیٹا پھر سے مضامین جمع کیے اور اب اس

قابل ہوئے کہ ان کو ترتیب لگا کر شائع کر دیا جائے۔صاحبِ خطبات حضرت مفکر اسلام دنیائے اسلام کے عظیم مذہبی و دینی سکالر علامہ زاہد الراشدی مدظلہ جو کسی تعارف کے محتاج نہیں ،اپنی طرز کے واحد دانشور بھی ہیں،اور پوری دنیائے کفر کی کارستانیوں پر نظرِ عمیق رکھنے والے مفکر بھی۔خطیب بھی اپنی طرز کے ہیں،اپنے والدؒ کی مسندِ حدیث پر بیٹھ کر حدیث پڑھانے والے محدث بھی اپنی طرز کے۔اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر سلامت رکھے اور ہمیں ان سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

اس جلد میں تقریباً 39 خطبات ہیں اصل میں یہ خطبات و بیانات مولانا کے بیانات کا خلاصہ ہوتے ہیں جو پڑھ کر ایک عام آدمی سے اعلیٰ تعلیم یافتہ تک اچھے انداز میں بات کو سمجھ جاتا ہے۔اگر ایک خطیب اور عالم جو مفید معلومات کا ذخیرہ اپنے پاس رکھنے والا ہو وہ تھوڑی سی محنت کرے تو اِس کے ایک خطبہ سے کتنے ہی موضوعات کے عنوان قائم کر کے اچھے انداز میں اپنے سامعین تک مسائل کی وضاحت کر سکتا ہے۔قارئین کرام! اس کی پروف ریڈنگ میں حتی الامکان کوشش کی ہے کہ غلطی نہ رہے پھر بھی اگر آپ کو غلطی نظر آئے تو ضرور نشان دہی فرما کر شکریہ کا موقع دیں،نیز درخواست ہے کہ حضرت کو اور راقم کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں،راقم بھی دعا گو ہے۔راقم حضرت مولانا علامہ زاہد الراشدی مدظلہ العالی کا خطبات کی ترتیب و اشاعت کی ذمہ داری سونپنے پر ممنون ہے۔

فقط یکِ از خدام

امام اہلسنتؒ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر

قاری جمیل الرحمن اخترؔ قادری نقشبندی مجددی

فاضل نصرت العلوم

وفاق المدارس العربیہ، پاکستان

0300-9496702

بسم الله الرحمن الرحيم

اللہ اور رسول کی اطاعت

''14 نومبر 2011ء اتوار کو بعد نماز عشاء ''امام بخاری'' مسجد'' بروک لین (نیویارک) میں خطاب''

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

محترم بزرگو، دوستو اور ساتھیو!

اس مسجد میں پہلے بھی کئی بار حاضری اور آپ حضرات کے ساتھ ملاقات ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ کا فضل اور مہربانی ہے کہ اس نے ہمیں ایک بار پھر اس مسجد میں جمع ہونے، نماز عشاء باجماعت پڑھنے اور اس کے بعد دین کی کچھ باتیں کہنے سننے کے لئے جمع کر دیا، اللہ تعالیٰ ہماری نماز قبول فرمائیں، مل بیٹھنا قبول فرمائیں، کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق دیں اور دین کی جو بات سمجھ میں آئے اس پر عمل کی توفیق سے بھی نواز دیں، آمین یارب العالمین۔

اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ضروری ہے:

آج آپ حضرات سے دو تین مسئلوں پر تھوڑی تھوڑی بات کرنا چاہوں گا، ایک یہ کہ قرآن کریم میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کریں اور اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی بھی اطاعت کریں. اللہ تعالیٰ اور ان کے

رسول ﷺ دونوں ہمارے مستقلاً مطاع ہیں اس لئے ہم پر جس طرح اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری ضروری ہے اسی طرح جناب نبی اکرم ﷺ کے احکام کی بجا آوری بھی ضروری ہے کیونکہ جس طرح قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت سے کاموں کا حکم دیا ہے، ان کے ساتھ جناب نبی اکرم ﷺ نے بھی ہمیں بہت سے احکام دیے ہیں، دین دونوں کے احکام کی پیروی کا نام ہے اور جب تک دونوں کی اطاعت نہیں ہوگی دین مکمل نہیں ہوگا۔

مثلاً نماز کو لے لیجئے جو اسلام کے فرائض میں سب سے اہم فریضہ ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے سینکڑوں آیات میں نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ اس کی پابندی کی تلقین کی ہے۔ اس کے ترک پر اپنی ناراضگی اور جہنم کے عذاب سے ڈرایا ہے اور اس کی اہمیت واضح فرمائی ہے لیکن کہیں یہ نہیں بتایا کہ دن رات میں ہم نے کتنی نمازیں پڑھنی ہیں، نمازوں کے اوقات کیا ہیں، اس کی رکعات کتنی ہیں، ہر رکعت میں رکوع اور سجدے کتنے ہیں اور نماز کی ترتیب اور کیفیات کیا ہیں؟ یہ سب باتیں ہمیں جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات اور سنت سے ملتی ہیں کیونکہ نماز کی تفصیلات سے نبی اکرم ﷺ نے امت کو آگاہ فرمایا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے احکام اور جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات و اعمال دونوں کو جمع کریں گے تو نماز مکمل ہوگی اور ہم صحیح طریقہ سے نماز پڑھ سکیں گے لیکن اگر جناب نبی اکرم ﷺ کی حدیث وسنت کو (نعوذ باللہ) نظر انداز کر کے صرف قرآن کریم کی بنیاد پر نماز پڑھنا چاہیں گے تو ایک نماز بھی نہیں پڑھ سکیں گے، یہی صورت حال اسلام کے باقی فرائض اور دین کے دوسرے احکام کی ہے کہ اَطِیْعُوا اللہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ دونوں کو جمع کر کے ہی ہم ان کی بجا آوری کر سکیں گے۔

اس بات کی مزید وضاحت کے لئے قرآن کریم کی دو آیات کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔ جب مسلمانوں کو اجازت ملی کہ وہ سفر میں نماز قصر کر سکتے ہیں اور چار رکعتوں کی بجائے سفر میں وہ دو رکعت ادا کریں گے تو قرآن کریم میں اس حکم کے ساتھ یہ شرط مذکور ہے کہ اِنْ

خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اگر تمہیں خوف ہو کہ کافر تمہیں آزمائش میں ڈال دیں گے یعنی حالت جنگ میں یا دشمنوں کے علاقہ سے گزرتے ہوئے تمہیں خطرہ ہو کہ دشمن کہیں اچانک حملہ نہ کر دیں تو چار کی بجائے دو رکعتیں پڑھ لو اور سنت ونفل کو چھوڑ دو، اس طرح یہ قصر اور دوگانہ نماز حالت جنگ اور دشمن کے حملہ کے خطرہ کے ساتھ مشروط قرار پاتی ہے لیکن جناب نبی اکرم ﷺ جب حجۃ الوداع کے سفر پر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو آتے جاتے نماز قصر پڑھتے رہے حالانکہ کسی طرف سے کوئی خطرہ کی بات نہیں تھی اور نہ ہی دشمن کے خطرے کا کوئی دور دور تک امکان تھا، اس پر حضرت عمرؓ کو اشکال ہوا کہ قصر کی نماز تو قرآن کریم نے حالت خوف کے ساتھ مشروط کی ہے مگر ہم حالتِ امن میں بھی قصر نماز پڑھتے جا رہے ہیں .انہوں نے یہ اشکال جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو جناب رسول اللہ ﷺ نے بہت خوبصورت جواب دیا کہ ''اللہ تعالیٰ کا صدقہ کیوں واپس کرتے ہو؟'' اس کا میں اپنی زبان میں یوں ترجمہ کیا کرتا ہوں کہ ہم حالت امن میں قصر کرتے جا رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے نہیں روکا تو تم کیوں بات کرتے ہو؟ ظاہر بات ہے کہ وحی کا سلسلہ تو جاری تھا اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی اجازت نہ ہوتی تو وحی آ جاتی کہ ایسا کیوں کر رہے ہو؟ جب وحی میں اس عمل سے منع نہیں کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی حالتِ امن میں قصر کی اجازت ہوگئی ہے اس طرح حالتِ جنگ میں قصر نماز اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے اور حالت امن میں قصر نماز جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ سے ہے اور جس نکتہ کی طرف میں توجہ دلانا چاہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ دونوں قصروں میں احکام اور ثواب واجر کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔

قرآن کریم کی ایک اور آیت مقدسہ سورۃ البقرہ آیت نمبر 283 کو بھی دیکھ لیں کہ جب یہ حکم نازل ہوا کہ مسلمانو! آپس میں جب تجارت کا کوئی بڑا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور اس پر گواہ بنا لیا کرو تا کہ بعد میں کوئی تنازعہ کھڑا نہ ہو اس کے ساتھ ہی یہ حکم ہوا کہ

''وَاِنْ کُنْتُمْ عَلٰی سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا کَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ''

اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے کی سہولت موجود نہیں پاتے تو رہن کا معاملہ کر لیا کرو کہ جس کے ذمہ قرض ہے وہ ضمانت کے لئے کوئی چیز رہن کے طور پر دوسرے فریق کے قبضہ میں دے دے جو رقم کی ادائیگی کے بعد واپس کر دی جائے۔

رہن کے احکام واضح ہیں جو آپ حضرات نے متعدد بار سنے ہوں گے اور یہ رہن کاروبار اور قرضوں میں آج بھی ہر جگہ چلتا ہے لیکن یہاں جو بات توجہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے رہن کو سفر کی حالت اور لکھنے کی سہولت موجود نہ ہونے کی صورت کے ساتھ خاص کیا ہے، اقامت کی حالت اور لکھنے کی سہولت موجود ہونے کے حالات اس میں شامل نہیں ہیں مگر رہن کے احکام وضوابط میں فقہاء کرام نے کہیں بھی اس کا فرق نہیں رکھا اور سفر وحضر ہر حالت میں رہن کا تعامل امت میں جاری چلا آ رہا ہے، یہ حالتِ اقامت کا رہن کہاں سے آ گیا؟ اس پر محدثین اور فقہاء کرام رحمہ اللہ تعالیٰ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک واقعہ کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں ایک یہودی کے پاس اپنی زرہ رہن رکھ کر اس سے غلہ ادھار لیا تھا جبکہ نہ سفر کا معاملہ تھا اور نہ ہی لکھنے کی سہولت مفقود تھی، یہاں فقہاء فرماتے ہیں کہ حالتِ سفر کا رہن تو قرآن کریم سے ثابت ہے جبکہ حالتِ اقامت کا رہن جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت مبارکہ سے ثابت ہے اور دونوں رہنوں میں احکام ومسائل کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لئے میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ دین صرف قرآن کریم کے احکام کو ماننے اور اللہ تعالیٰ کے فرامین کی اطاعت کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات اور سنن مبارکہ بھی اسی طرح واجب الاطاعت ہیں جس طرح قرآن کریم کے احکام کی اطاعت ضروری ہے۔

قرآن کریم کی تشریح وہی مانی جائے گی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی:

دوسری بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو بھی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت پر موقوف کیا ہے اور ارشاد ربانی ہے کہ ''مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ

فَقَدْ اَطَاعَ اللهَ'' جس نے رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اس لئے کہ قرآن کریم کے احکام وفرامین کی شرح وتعبیر میں فائنل اتھارٹی جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے، قرآن کریم کی کسی آیت، جملہ یا لفظ کی جو تشریح جناب نبی اکرم ﷺ نے کی ہے وہی اس کا اصل معنیٰ ہے اور وہی اس آیت، جملہ یا لفظ سے اللہ تعالیٰ کی مراد ہے، اسی طرح قرآن کریم کے کسی حکم پر جس طرح جناب نبی اکرم ﷺ نے عمل کیا ہے، وہی اس پر عمل کی فائنل شکل ہے اس سے ہٹ کر قرآن کریم کے کسی حکم پر عمل کی کوئی اور کیفیت اختیار کی جائے گی تو وہ قرآن کریم پر عمل تصور نہیں ہوگا، قرآن کریم پڑھتے ہوئے اور اس کے احکام کو سمجھتے ہوئے بعض جگہ اشکال پیدا ہو جاتا ہے، یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، خود حضرات صحابہ کرامؓ کو بھی بعض آیات قرآنی کے سمجھنے میں اشکال ہو جاتا تھا، احادیث میں بیسیوں واقعات اس سلسلہ میں مذکور ہیں اور بسا اوقات تو قرآن کریم کی آیت اور جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشاد میں بظاہر تعارض محسوس ہونے لگتا تھا لیکن اس قسم کا کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو حضرات صحابہ کرامؓ جناب نبی اکرم ﷺ سے ہی رجوع کرتے تھے اور اس کی وضاحت میں جناب نبی اکرم ﷺ جو بھی فرما دیتے وہی اس آیت کریمہ کا صحیح مصداق سمجھا جاتا تھا اور اللہ تعالیٰ کی منشا و مراد قرار پاتا تھا، اس سلسلہ کے بہت سے واقعات میں سے ایک واقعہ کا تذکرہ کر رہا ہوں، بخاری شریف کی روایت ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ ''مَنْ حُوْسِبَ عُذِّبَ'' جس کا حساب کتاب ہوا اسے ضرور عذاب ہوگا، یہ شرط جزا ہے جس میں لزوم ہوتا ہے اور ظاہر معنیٰ یہی بنتا ہے کہ جس کا حساب کتاب ہوا وہ عذاب سے نہیں بچے گا۔

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! قرآن کریم تو فرماتا ہے کہ ''اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا وَّیَنْقَلِبُ

اِلٰی اَھْلِهٖ مَسْرُوْرًا'' سورۃ الانشقاق آیت 7 تا 9 جس کو اس کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا گیا اس کا آسان سا حساب ہوگا اور وہ اپنے گھر والوں کے پاس خوش خوش واپس جائے گا بلکہ ایک جگہ قرآن کریم میں یوں ہے کہ ''فَیَقُوْلُ ھَآؤُمُ اقْرَءُوْا کِتٰبِیَهْ اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ فَھُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ''آؤ میرا نامہ اعمال اور رزلٹ کارڈ دیکھو، مجھے یقین تھا کہ مجھے یہی نتیجہ ملے گا پس وہ خوشی کی زندگی میں ہوگا۔

حضرت عائشہؓ کا مطلب یہ تھا کہ قرآن کریم کی ان آیات کی رو سے حساب کتاب کے بعد بھی بہت سے لوگوں کو نجات اور خوشی ملے گی جبکہ جناب نبی اکرم ﷺ فرما رہے ہیں کہ'' مَنْ حُوْسِبَ عُذِّبَ'' جس کا حساب ہوا سے عذاب دیا جائے گا۔

بظاہر یہ تعارض قرآن کریم اور حدیث نبوی ﷺ میں نظر آتا ہے کہ قرآن کریم کچھ اور فرما رہا ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ کچھ اور کہہ رہے ہیں لیکن جناب نبی اکرم ﷺ نے ایک جملہ میں جواب دیا اور بات صاف کر دی نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ذَاکَ الْعِرْضُ یَا عَائِشَةَ! اے عائشہؓ جس حساب کی بات قرآن کریم میں کی گئی ہے وہ صرف پیشی ہے کہ سرسری پیشی پر ایک آدھ سوال کے ساتھ نجات کا پروانہ مل جائے گا'' اَمَّا مَنْ نُوْقِشَ فَقَدْ عُذِّبَ ''،لیکن جس کا مناقشہ ہوا یعنی جس کا ریکارڈ طلب کر لیا گیا وہ عذاب سے نہیں بچتا، میں اس کی ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں انکم ٹیکس کی ادائیگی کے لئے تاجر حضرات حساب کتاب کا گوشوارہ پیش کرتے ہیں، انکم ٹیکس آفیسر نے اگر اس گوشوارے پر ایک دو سوال کر کے بات نمٹا دی تو جان چھوٹ گئی لیکن اگر اس نے تفصیلی حساب کتاب کے لئے ریکارڈ طلب کر لیا تو مارے گئے۔

یہاں جس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ بظاہر تعارض قرآن کریم کی آیت اور جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشاد میں دکھائی دے رہا ہے مگر یہاں بھی وضاحت کی اتھارٹی جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے کہ انہوں نے جو وضاحت کر دی وہی فائنل

ہے اور وہی اس آیت کریمہ سے اللہ تعالیٰ کی مراد ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ "مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللہ" کا یہ مطلب ہے کہ قرآن کریم کی کسی آیت کا جو مطلب اور مفہوم جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول یا عمل سے طے کر دیا ہے اس پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت شمار ہوگی اور اگر کوئی اپنی مرضی کرنا چاہے گا کہ میں تو قرآن کریم کی اس آیت یا جملے سے یہ سمجھتا ہوں تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

جبکہ تیسری بات آپ حضرات کی خدمت میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی کسی آیت یا جملے کا مفہوم سمجھنے میں بسا اوقات اس کا پس منظر معلوم نہ ہونے کی وجہ سے دقت پیش آتی ہے اور جب تک وہ پس منظر معلوم نہ ہو آیت کریمہ کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آتا، اس پر بھی احادیث میں متعدد واقعات موجود ہیں جن میں سے ایک کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

قدامہ بن مظعونؓ بدری صحابی ہیں، حضرت عمرؓ کے برادر نسبتی اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ماموں تھے، انہیں حضرت عمرؓ نے ایک صوبے کا گورنر بنایا تو وہاں سے رپورٹ آئی کہ حضرت قدامہ بن مظعونؓ کبھی کبھی شراب پیتے ہیں۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے انکوائری کرائی تو بات درست ثابت ہوئی۔ انہیں مدینہ منورہ طلب کر لیا گیا، وہ جب پیش ہوئے تو امیر المومنینؓ کے استفسار پر انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ کبھی کبھی شراب پیتے ہیں اور وجہ یہ بیان کی کہ کبھی کبھی شراب پینے کی قرآن کریم نے اجازت دی ہے۔ اس کی دلیل انہوں نے یہ بیان کی کہ قرآن کریم کی جن آیات میں شراب کی حرمت بیان کر کے اس کے پینے سے حتمی طور پر منع کیا گیا اور شراب نوشی کو شیطانی عمل اور نری گندگی قرار دیا گیا ہے، ان میں سے ایک آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ "لَیۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیۡمَا طَعِمُوۡۤا اِذَا مَا اتَّقَوۡا وَّاٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" ان لوگوں پر جو ایمان لائے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں کوئی حرج نہیں اگر انہوں نے چکھ لی۔ حضرت قدامہ بن مظعونؓ کا

استدلال ''فِیْمَا طَعِمُوْا'' سے تھا کہ تھوڑی بہت چکھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے اس لئے میں بھی کبھار پی لیتا ہوں، حافظ ابن حجرؒ نے ''الاصابۃ'' میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کر کے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت قدامہؓ کے اس استدلال کو مسترد کر دیا اور ان پر شراب نوشی کی حد جاری کی، مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جب شراب کی حرمت کا حتمی حکم جاری ہوا اور اسے ''رجس'' قرار دے کر اس سے قطعی طور پر منع کر دیا گیا تو بعض صحابہ کرامؓ کو اشکال ہوا کہ جب یہ گند اور نجاست ہے تو ہمارے جو ساتھی اس کی حرمت کے اعلان سے پہلے شراب پیتے تھے اور ان میں سے بہت سے اسی حالت میں فوت بھی ہو گئے ہیں ان کا کیا بنے گا؟ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ جو ایمان اور عمل صالح والے لوگ ایمان وتقوی کے ساتھ اس سے قبل شراب پیتے رہے ہیں ان پر کوئی حرج نہیں ہے اس لئے کہ جب شراب حرام نہیں ہوئی تھی تو پینے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا گویا اس ''فیما طعموا'' کا تعلق مستقبل سے نہیں بلکہ ماضی سے ہے لیکن میں آپ حضرات سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ اگر اس آیت کریمہ کا یہ پس منظر ہمیں معلوم نہ ہو تو کیا اس کا صحیح مطلب اور مصداق ہم سمجھ پائیں گے؟

بہت سے لوگوں کو قرآن کریم کی بعض آیات کو سمجھنے اور ان کے صحیح مطلب تک پہنچنے میں دشواری اس لئے پیش آتی ہے کہ وہ اس آیت کریمہ کے حوالہ سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قولی یا عملی تشریح کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور آیت کے شان نزول اور پس منظر سے واقفیت کی زحمت گوارا نہیں کرتے بلکہ اپنے فہم اور علم کے زور سے آیت کریمہ کا مفہوم ومصداق طے کرنے کی کوشش میں گمراہ ہو جاتے ہیں۔

اس لئے آج کی میری ان گزارشات کے خلاصے کے طور پر یہ بات ذہن میں رکھیے کہ ہم پر صرف قرآن کریم کے احکام کی اطاعت فرض نہیں بلکہ ان کے ساتھ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کی پیروی بھی اسی طرح فرض ہے اور قرآن کریم کی کسی آیت، جملے یا

لفظ کی وہی تشریح وتعبیر حتمی ہے جو جناب نبی اکرم ﷺ نے اپنے قول یا عمل کے ساتھ کی ہے اور اگر قرآن کریم کی کسی بات کو سمجھنے میں دقت پیش آئے تو جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت وحدیث کے ساتھ ساتھ اس آیت کریمہ کے شان نزول اور پس منظر کو سمجھنا بھی ضروری ہے، اس کے بغیر قرآن کریم کا صحیح معنیٰ ومفہوم متعین نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن وسنت پر صحیح طریقہ سے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اللہ اور رسول کی اطاعت

''10 جنوری 2012ء کو ماڈل ٹاؤن (ہمک) اسلام آباد میں بعد نماز مغرب جامع مسجد الیاس اور بعد نماز عشاء جامع مسجد رحمانیہ میں درس قرآن کریم کا خلاصہ''

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

امابعد!

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مسلمانوں کو جہاں اپنی اطاعت کا حکم دیا ہے وہاں اس کے ساتھ ہی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم بھی دیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اس لئے جہاں اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری ہم پر فرض ہے وہاں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی بجا آوری بھی ہماری دینی ذمہ داری ہے، اللہ تعالیٰ نے شریعت کے بہت سے احکام ہمیں قرآن کریم میں براہِ راست دیے ہیں اور بہت سے احکام جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بالواسطہ صادر فرمائے ہیں اور وہ احکام بھی دراصل اللہ تعالیٰ ہی کے احکام ہیں۔

تفسیر قرطبی میں روایت مذکور ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے کہ ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے احرام باندھا ہوا ہے لیکن احرام کی دو چادروں

کے علاوہ کوئی سلا ہوا کپڑا بھی پہن رکھا ہے، حضرت ابن مسعودؓ نے اس کے قریب جا کر اسے بتایا کہ مرد کے لئے احرام کی حالت میں سلا ہوا کپڑا پہننا جائز نہیں ہے، اس نے فوراً سوال کر دیا کہ کیا یہ مسئلہ قرآن کریم میں ہے؟ میں کہا کرتا ہوں کہ کوئی ہم جیسا کمزور مولوی ہوتا تو جواب دیتا کہ یہ مسئلہ قرآن کریم میں تو نہیں ہے اور اس پر وہ شخص یہی کہتا کہ مولوی صاحب جاؤ اپنا کام کرو مگر وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تھے فرمایا کہ ہاں یہ قرآن کریم میں ہے، اس نے پوچھا کہ کہاں ہے؟ تو فرمایا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے کہ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا اللہ تعالیٰ کے رسول جو کچھ تمہیں دیں وہ لے لو اور جو چیز نہ دیں اس سے رک جاؤ، اللہ تعالیٰ کے رسول تمہیں جو کچھ فرمائیں اس پر عمل کرو اور جس چیز سے منع کریں اس سے باز رہو اور میں نے خود جناب نبی اکرم ﷺ سے سنا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مرد کو حالت احرام میں سلا ہوا کپڑا پہننے کی اجازت نہیں ہے، اس لئے یہ قرآن کریم کا حکم ہے کہ مرد حالت احرام میں سلا ہوا کپڑا نہ پہنے، گویا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس بات کی وضاحت فرمائی کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات بھی قرآنی تعلیمات کا حصہ ہیں اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور اللہ رب العزت کے نمائندہ ہیں اور نمائندہ جو کچھ بھی کہتا ہے اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ اس کی بات اس اتھارٹی کی بات سمجھی جاتی ہے جس کا وہ نمائندہ ہوتا ہے اس لئے قرآن کریم کے ارشادات اور جناب نبی اکرم ﷺ کے فرمودات میں اتنا ہی فرق ہے کہ قرآن کریم میں مذکور احکامات اللہ تعالیٰ نے براہ راست ارشاد فرمائے ہیں جبکہ جناب نبی اکرم ﷺ کے ذریعے بہت سے احکامات بالواسطہ بھی دیے ہیں اور دونوں قسم کے احکام کی اطاعت مسلمانوں کے ذمہ واجب ہے، شریعت اسلامیہ کے بہت سے احکام ایسے ہیں جو قرآن کریم اور حدیث نبوی ﷺ دونوں پر عمل کرنے سے مکمل ہوتے ہیں ورنہ ادھورے رہ جاتے ہیں اور ان پر عمل مشکل ہو جاتا ہے مثلاً یہی نماز ہے جو ہم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے

باجماعت ادا کی ہے، قرآن کریم نے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے اس کی پابندی کی تلقین کی ہے، وقت پر نماز پڑھنے کی تاکید کی ہے اور نماز میں سستی یا نماز نہ پڑھنے پر جہنم کے عذاب کی وعید سنائی ہے، سینکڑوں آیات قرآنی میں یہ بات موجود ہے لیکن قرآن کریم میں کسی جگہ بھی یہ بیان نہیں کیا گیا کہ دن میں پانچ نمازیں پڑھنی ہیں، فجر میں دو رکعت فرض ہیں اور مغرب میں تین رکعت فرض ہیں، ایک رکعت میں دو سجدے ہیں اور ایک رکوع ہے اور نماز کی دیگر تفصیلات یہ ہیں، اگر قرآن کریم کی آیات اور جناب نبی اکرم ﷺ کی سنن واحادیث کو جمع نہ کیا جائے تو سرے سے نماز کی ترتیب ہی قائم نہیں ہو پاتی اور نہ ہی نماز صحیح طور پر پڑھی جا سکتی ہے۔

مسند دارمی کی روایت کے مطابق ایک بار حضرت عمران بن حصینؓ سے کسی شخص نے ایک سوال کر کے یہ تقاضہ کیا کہ اس سوال کا جواب قرآن کریم میں سے دیں تو انہوں نے سخت ناراضگی کا اظہار فرماتے ہوئے اس سے پوچھا کہ تم نے فجر کی نماز میں جو دو رکعتیں پڑھی ہیں وہ قرآن کریم میں کہاں ہیں؟

شریعت کے بعض احکام ایسے ہیں جن کا ایک حصہ قرآن کریم میں مذکور ہے لیکن اسی حکم کا دوسرا حصہ ہمیں حدیث وسنت میں ملتا ہے اور دونوں مل کر ایک حکم کو مکمل کرتے ہیں مثلاً سفر میں نماز قصر کرنے کا حکم قرآن کریم میں اس شرط کے ساتھ مذکور ہے کہ ''اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' اگر تمہیں خوف ہو کہ دشمن تمہیں آزمائش میں ڈال دے گا یعنی تم پر حملہ کر دے گا تو ''فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ'' کوئی حرج نہیں کہ تم نماز میں قصر کر لو اور چار رکعت کی بجائے دو رکعت پڑھ لو، اس آیت کریمہ کی رو سے قصر نماز کا حکم حالت خوف اور حالت جنگ کے ساتھ مشروط ہے اور اس میں حالت امن میں قصر کی نماز سمجھ میں نہیں آتی، چنانچہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق حجۃ الوداع سے واپسی پر حضرت عمرؓ نے جناب نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ قرآن کریم نے تو سفر کے

دوران اور خوف اور دشمن کے حملہ کے امکان کی صورت میں قصر کی نماز کی بات کی ہے جبکہ ہم حجۃ الوداع کے سفر میں جو ہمارا انتہائی پر امن سفر ہے اور کسی طرف سے کوئی خوف نہیں ہے آتے ہوئے اور جاتے ہوئے نماز قصر کرتے جا رہے ہیں، جناب نبی اکرم ﷺ نے اس کا دلچسپ جواب دیا کہ عمرؓ! یہ اللہ تعالیٰ کا صدقہ ہے واپس کیوں کرتے ہو؟ اس کا ترجمہ میں اپنی زبان میں یوں کیا کرتا ہوں کہ اے عمرؓ! ہم حج کے لئے آتے ہوئے اور حج کر کے واپس جاتے ہوئے نماز قصر کرتے جا رہے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے اس پر کچھ نہیں کہا تو تم کیوں بولتے ہو؟

ظاہر بات ہے کہ حالت امن کا یہ قصر جناب نبی اکرم ﷺ کا عمل ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس پر ٹوکا نہیں اور منع نہیں کیا تو وحی کی خاموشی کی وجہ سے اس عمل نے اللہ تعالیٰ کے حکم اور مہربانی کا درجہ حاصل کر لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرما کر ہمیں حالت امن میں بھی قصر نماز کی اجازت دے دی ہے، جسے جناب نبی اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کے صدقہ سے تعبیر فرما رہے ہیں۔

اب غور فرمائیے کہ حالت جنگ کا قصر تو قرآن کریم میں مذکور ہے لیکن حالت امن کا قصر جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ میں ملتا ہے اور دونوں قصروں میں کوئی فرق نہیں ہے اسی لئے امت تب سے ان دونوں پر یکساں عمل کرتی آ رہی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں حکم ہے کہ جب آپس میں قرض کا کوئی معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور اس پر گواہ بنا لیا کرو تا کہ بعد میں کوئی تنازعہ نہ ہو، اس حکم کے ساتھ یہ فرمایا گیا ہے کہ:

”وَإِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَّقْبُوْضَةٌ“

اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ تو قرض کی ضمانت کے لئے کوئی چیز رہن کے طور پر اپنے قبضہ میں لے لو گویا قرآن کریم نے رہن کی اجازت سفر کی حالت میں اور لکھنے

پڑھنے کی سہولت میسر نہ آنے کی صورت میں دی ہے مگر رہن کے احکام حالت سفر اور حالت قیام دونوں میں جاری ہیں، کاتب میسر آنے یا نہ آنے کی دونوں حالتوں میں رہن کی یکساں اجازت ہے اور اس پر چودہ سو سال سے عمل ہو رہا ہے، سوال یہ ہے کہ حالت قیام میں اور کاتب میسر ہونے کے باوجود رہن کی بات قرآن کریم میں تو نہیں ہے یہ کہاں سے آ گئی؟ اس پر فقہاء کرامؒ یہی فرماتے ہیں کہ یہ رہن جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ سے ملتا ہے کہ آنجناب ﷺ نے مدینہ منورہ میں قیام کے دوران اور لکھنے کی سہولتیں موجود ہونے کے باوجود ایک یہودی کے پاس زرہ رہن کے طور پر رکھ کر اس سے غلہ ادھار لیا تھا اس طرح رہن کی ایک صورت کا ذکر قرآن کریم میں ہے اور دوسری صورت جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت میں مذکور ہے اور احکام کے لحاظ سے دونوں رہنوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور دونوں حالتوں میں رہن کے شرعی احکام یکساں طور پر جاری ہوتے ہیں۔

اسی طرح ترمذی شریف کی روایت کے مطابق ایک شخص نے حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ سے سوال کیا کہ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے کہ "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ" اے ایمان والو! تم پر اپنا فکر کرنا لازم ہے اگر تم ہدایت پر قائم ہو تو کوئی دوسرا شخص اگر گمراہ ہوتا ہے تو تمہیں اس کا کوئی نقصان نہیں ہے۔

اس آیت کا ظاہری مفہوم یہ بنتا ہے کہ دوسرے لوگ گمراہ ہوتے پھریں تمہیں اس کا کوئی ضرر نہیں ہے، اس لئے تم صرف اپنی فکر کرو اگر اس کا مطلب یہی ہے تو قرآن کریم میں جگہ جگہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جو حکم دیا گیا ہے اور کفر و شرک اور گمراہی سے دوسروں کو بچانے کی جو کوشش اہل ایمان کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے اس کی کیا حیثیت ہے؟

حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ نے اس سوال کے جواب میں پہلی بات یہ فرمائی کہ "علی الخبیر سقطت" تم یہ بات پوچھنے کے لئے خبردار کے پاس آئے ہو اس لئے کہ یہی سوال

میرے ذہن میں بھی آیا تھا اور میں نے جناب نبی اکرم ﷺ سے پوچھ لیا تھا، آپ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا کہ امر بالمعروف کرتے رہو اور نہی عن المنکر کا عمل جاری رکھو ہاں جب ایسا وقت آجائے کہ خود رائی اور خواہش پرستی غالب آنے لگے اور اپنے ایمان کی حفاظت مشکل ہو جائے تو پھر پہلے اپنی فکر کرو گویا صرف اپنی فکر کرنے کا یہ حکم عام حالات میں نہیں بلکہ اس صورت میں ہے کہ جب فتنوں کے ہجوم میں اپنے ایمان کو بچانا مشکل دکھائی دینے لگے تو پھر دوسروں کی فکر کرنے سے پہلے اپنے ایمان کی حفاظت کی فکر کرو۔

بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق قرآن کریم کی مذکورہ آیت کریمہ کے بارے میں اس وضاحت کی ضرورت خلیفہ اول حضرت ابو بکرؓ کو بھی پیش آئی تھی جب جناب نبی اکرم ﷺ کے وصال کے بعد بہت سے قبیلے مرتد ہو گئے اور حضرت ابو بکرؓ نے ان کی سرکوبی کے لئے مختلف محاذوں پر جہاد کا اعلان کیا تو بہت حضرات کے ذہن میں اسی آیت قرآنی کے حوالہ سے اشکال پیدا ہوا تھا کہ قرآن کریم تو صرف اپنی فکر کرنے کی بات کرتا ہے اور یہ فرماتا ہے کہ دوسروں کے گمراہ ہو جانے کا تم پر کوئی ضرر نہیں ہے تو حضرت صدیق اکبرؓ یہ معرکہ آرائی کیوں کر رہے ہیں؟ چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ نے خطبہ جمعہ میں اعلان فرمایا کہ لوگو! قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کے بارے میں مغالطہ کا شکار نہ ہونا کیونکہ میں نے جناب نبی اکرم ﷺ سے خود سنا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سر انجام دیتے رہنا، البتہ جب ایسا وقت آجائے کہ خود رائی اور خواہش پرستی کے عروج کے زمانے میں جب اپنا ایمان خطرے میں نظر آنے لگے کہ تو پھر پہلے اپنی فکر کرنا تم پر لازم ہے۔

ان گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ دین کے احکام قرآن کریم اور حدیث وسنت کو جمع کرنے اور دونوں پر عمل کرنے سے مکمل ہوتے ہیں ورنہ دین ادھورا رہ جاتا ہے اسی لئے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ '' اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت بھی کرو بلکہ ایک مقام پر اس سے بھی آگے کی بات فرمائی کہ ''مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہ ''جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ کی اطاعت کی اس لئے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاں ہمارے لئے مطاع کی حیثیت رکھتے ہیں وہاں قرآن کریم کے احکام کی تشریح اور قرآن کریم کی کسی آیت یا جملہ سے اللہ تعالیٰ کی مراد اور منشا بیان کرنے میں اتھارٹی بھی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے، اس طرح جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے احکام کی اطاعت تو اپنی جگہ فرض ہے جبکہ اس کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کے احکام پر عمل اور ان کی بجا آوری کی عملی صورتیں بھی ہمیں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ ہی ملتی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کے بغیر ہم اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کی منزل بھی حاصل نہیں کر سکتے ۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن وسنت پر صحیح عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اطاعت رسول ﷺ

"19 فروری 2011ء کو النور ریسٹورنٹ پنجن کسانہ میں جمعیۃ علماء اہل سنت ضلع گجرات کے زیر اہتمام منعقدہ سیرت کانفرنس سے خطاب کا خلاصہ"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

اما بعد!

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ○ (القرآن)

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اللہ ﷺ کی"۔

میرے اور آپ سب کے لئے یہ سعادت کی بات ہے کہ ہم یہاں جناب سرور کائنات ﷺ کے ذکر مبارک کے لئے جمع ہیں اور نبی اکرم ﷺ کی سنت و سیرت کے تذکرہ کے حوالہ سے مل بیٹھے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمارا مل بیٹھنا قبول فرمائیں، کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق دیں اور جو بات دین کی علم میں آئے اس پر عمل کی توفیق سے بھی نوازیں، آمین۔

جناب سرور کائنات ﷺ کا تذکرہ جس حوالہ سے بھی ہو اور جس پہلو سے بھی ہو باعث برکت ہے، باعث ثواب ہے، باعث رحمت ہے اور باعث ہدایت ہے اور آنحضرت ﷺ

کے ذکر مبارک سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں، ظاہر بات ہے کہ میرے سامنے آپ میرے کسی دوست کا اچھے انداز میں تذکرہ کریں گے تو مجھے خوشی ہوگی، اللہ تعالیٰ کے حبیب کا ذکر کرنے سے اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوتے ہیں اور رحمت و برکات سے نوازتے ہیں۔

حضور نبی اکرم ﷺ کے ذکر سے اجر و ثواب بھی ہوتا ہے، رحمت و برکت کا نزول بھی ہوتا ہے اور ہدایت اور راہ نمائی بھی ملتی ہے اور سب سے بڑا پہلو یہی ہے کہ ہم سرور کائنات ﷺ کا ذکر کر کے ان کی سنت و سیرت سے راہ نمائی حاصل کریں اسی سے ہمیں دنیا و آخرت کی سعادت اور نجات حاصل ہوگی۔

جناب نبی اکرم ﷺ کے تذکرہ کے سینکڑوں پہلو ہیں اور ہر پہلو کے بیسیوں رخ ہیں اس لئے سیرت طیبہ پر گفتگو کرنے والوں کو سب سے پہلے اس امتحان کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ سیرت مبارکہ کا کون سا پہلو بیان کیا جائے اور کون سا پہلو چھوڑ دیا جائے اور یہ "کون سا چھوڑ دیا جائے" کا پہلو زیادہ آزمائش والا ہوتا ہے کہ حبیب خدا ﷺ کی سیرت کا کوئی پہلو بھی ایسا نہیں جسے چھوڑ دینے کا آسانی کے ساتھ فیصلہ کیا جاسکے مگر ظاہر ہے کہ مختصر وقت میں بات صرف ایک ہی پہلو پر ہوسکتی ہے اور وہ بھی اختصار کے ساتھ، اس لئے میں آج کی اس محفل میں آپ حضرات کے سامنے سیرت طیبہ ﷺ کے صرف ایک پہلو پر چند گزارشات پیش کرنا چاہوں گا کہ کیا جناب نبی اکرم ﷺ کا منصب صرف یہ تھا کہ وہ لوگوں تک اللہ تعالیٰ کا دین اور احکام پہنچا دیں یا دین میں خود بھی کوئی اتھارٹی رکھتے تھے؟ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرم ﷺ کی اطاعت کا حکم اور اس کے ساتھ ساتھ اتباع کا حکم بھی دیا ہے اطاعت کا معنیٰ ہے حکم ماننا اور اتباع کا مفہوم اس سے کچھ مختلف ہے جس میں حکم ماننے کے ساتھ نقش قدم پر چلنا بھی شامل ہے جسے ہم فالو کرنا کہتے ہیں، نبی اکرم ﷺ جو حکم دیں اس کی تعمیل ہم پر ضروری ہے اور جس طریقے سے وہ کام کر کے دکھائیں اس کی پیروی بھی ہماری ذمہ داری ہے یعنی جو حکم وہ دیں وہ مانیں اور جیسے وہ کریں ویسے ہم کریں۔

دین میں جس طرح قرآن کریم اتھارٹی ہے اسی طرح جناب اکرم ﷺ بھی اتھارٹی ہیں اور قرآن کریم نے اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ کہہ کر دونوں کی اطاعت کا حکم دیا ہے یہ بات میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ ہمارے آج کے دور میں یہ بیماری مسلسل پھیلتی جا رہی ہے کہ کوئی مسئلہ بیان کریں خواہ وہ جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کے حوالہ سے ہی بیان کیا جائے تو کوئی نہ کوئی صاحب یہ سوال کر دیتے ہیں کہ کیا یہ مسئلہ قرآن کریم میں ہے؟ بظاہر یہ سوال اس لئے ہوتا ہے کہ قرآن کریم سے بھی یہ مسئلہ بیان ہو جائے لیکن اس کے پیچھے اکثر یہ ذہن کارفرما ہوتا ہے کہ اگر قرآن کریم میں یہ مسئلہ بیان ہوا ہے پھر تو ٹھیک ہے لیکن اگر قرآن کریم اس مسئلہ میں خاموش ہے تو پھر اس پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں ہے، یہ بات بہت خطرناک ہے کیونکہ اس مسئلہ میں یہ شرط لگانا کہ وہ صرف قرآن کریم سے ہی بیان کیا جائے اس سے جناب نبی اکرم ﷺ کے خود اتھارٹی ہونے کی نفی ہوتی ہے، العیاذ باللہ۔

یہ سوال کہ کسی مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا جائے کہ کیا یہ قرآن کریم میں موجود ہے؟ بہت پرانا ہے، تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ ایک بار بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے کہ کسی شخص کو دیکھا کہ وہ طواف کر رہا ہے اور اس نے احرام کی دو چادریں باندھنے کے علاوہ کوئی سلا ہوا کپڑا بھی پہن رکھا ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے اسے متوجہ کر کے فرمایا کہ بھائی! احرام کی حالت میں مرد کے لئے سلا ہوا کپڑا پہننے کی اجازت نہیں ہے، اس نے پلٹ کر سوال کیا کہ کیا یہ مسئلہ قرآن کریم میں ہے؟ میں اس موقع پر عرض کیا کرتا ہوں کہ کوئی ہمارے جیسا ڈھیلا ڈھالا مولوی ہوتا تو کہتا کہ جی یہ مسئلہ قرآن کریم میں تو نہیں ہے مگر وہ بہت تگڑا مولوی تھا حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ تھے فرمایا کہ ہاں یہ مسئلہ قرآن کریم میں موجود ہے، اس لئے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ......

''وَمَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡهُ وَمَا نَهَاكُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوۡا'' (سورۃ الحشر آیت نمبر 7)

اور جناب نبی اکرم ﷺ سے میں نے خود سنا ہے کہ احرام کی حالت میں مرد کے لئے سلا ہوا کپڑا پہننا جائز نہیں ہے۔

یعنی جناب نبی اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کے نمائندہ اور رسول ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ جو کہیں وہ کرو اور جس سے روکیں رک جاؤ، کیونکہ نمائندہ اور رسول کی حیثیت سے جناب نبی اکرم ﷺ کی ہر بات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے تو اس سوال کا جواب اس انداز سے دیا مگر حضرت عمران بن حصینؓ اس قسم کے سوال پر غصے میں آگئے تھے، مسند دارمیؒ کی ایک روایت کے مطابق حضرت عمران بن حصینؓ سے کسی شخص نے کوئی مسئلہ پوچھا اور ساتھ شرط لگا دی کہ مسئلہ قرآن کریم سے بیان فرمائیں، حضرت عمران بن حصینؓ نے اس سوال کو پسند نہیں کیا اور الٹا اس شخص سے سوال کر دیا کہ تم نے صبح کی نماز میں کتنی رکعتیں پڑھی تھیں؟ اس نے جواب دیا کہ دو رکعتیں پڑھی تھیں فرمایا کہ کیا صبح کی دو رکعتوں کا ذکر قرآن کریم میں ہے؟ قرآن کریم تو نہ نمازوں کی تعداد بیان کرتا ہے، نہ رکعتوں کا ذکر کرتا ہے اور نہ ہی یہ بتاتا ہے کہ ایک رکعت میں سجدے کتنے ہیں اور رکوع کتنے ہیں؟ یہ ساری تفصیلات جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ سے ملتی ہیں اس لئے جس طرح قرآن کریم کے حکم پر نماز پڑھنا فرض ہے اسی طرح جناب نبی اکرم ﷺ کی بتلائی ہوئی تفصیلات اور طریقے کے مطابق نماز پڑھنا بھی فرض ہے، یہی صورت حال باقی فرائض مثلاً زکوٰۃ، روزہ اور حج کی بھی ہے۔

میں اس کی ایک مثال اور بھی دینا چاہوں گا کہ حالت سفر میں نماز دوگانہ پڑھنے کا حکم ہے مگر قرآن کریم میں اس اجازت کی یہ شرط ہے ......

”فلیس علیکم جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوۃِ اِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا“ (سورۃ النساء آیت نمبر 101)

سفر میں نماز قصر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اگر تم دشمن کی طرف سے آزمائش میں

ڈالے جانے کا خوف رکھتے ہو یعنی اگر دشمن کا خوف ہو تو نماز دوگانہ پڑھ سکتے ہو، اس کا ظاہری مطلب یہ بنتا ہے کہ قصر نماز کا تعلق حالت جنگ اور حالت خوف سے ہے اور حالت امن میں اس کی گنجائش نہیں ہے، یہ اشکال سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے ذہن میں آیا جب وہ حجۃ الوداع میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھے اس سارے سفر میں آتے ہوئے اور جاتے ہوئے جناب نبی اکرم ﷺ نے دوگانہ نماز پڑھی، حضرت عمرؓ کو خیال آیا کہ فتح مکہ اور جزیرۃ العرب پر غلبہ اور کنٹرول کے بعد تو حالت خوف باقی نہیں رہی اور خاص طور پر حجۃ الوداع کا سفر اسلام کے غلبہ اور قوت کے بھرپور اظہار کا سفر ہے اب ہم دوگانہ نماز کیوں پڑھ رہے ہیں جبکہ قرآن کریم نے قصر نماز کو "اِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" کے ساتھ مشروط کیا ہے؟ انہوں نے اس اشکال کا تذکرہ جناب نبی اکرم ﷺ سے کیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہربانی ہے اسے واپس کیوں کر رہے ہو؟ میں اس کا ترجمہ یوں کیا کرتا ہوں کہ ہم حالت امن میں قصر کر رہے ہیں اور وحی کا سلسلہ بھی جاری ہے مگر اللہ تعالیٰ اس سے منع نہیں فرما رہے تو تم اس مہربانی پر اشکال کا اظہار کیوں کر رہے ہو؟

میں یہاں جس بات پر بطور خاص توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ حالت خوف میں قصر نماز ہم قرآن کریم کے حکم کے مطابق پڑھتے ہیں مگر حالت امن میں قصر نماز جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت کی وجہ سے پڑھتے ہیں اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اس لئے کہ جس طرح قرآن کریم دین میں اتھارٹی ہے اسی طرح جناب نبی اکرم ﷺ بھی اللہ تعالیٰ کے رسول اور نمائندہ ہونے کی وجہ سے اتھارٹی ہیں اور جس طرح قرآن کریم کے حکم سے کوئی عمل واجب ہوتا ہے اسی طرح جناب نبی اکرم ﷺ کے حکم سے بھی عمل واجب ہو جاتا ہے کیونکہ جناب نبی اکرم ﷺ کا کوئی بھی ارشاد یا عمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے نکیر نہ ہونے کی صورت میں حکماً وحی کا درجہ اختیار کر لیتا ہے اور وحی کی خاموشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہی کا حکم بن جاتا ہے۔

حضرت امام شافعیؒ اس مسئلہ میں ایک قدم اور آگے بڑھ گئے ہیں، تفسیر قرطبیؒ میں ہے کہ حضرت امام شافعیؒ سے مسئلہ پوچھا گیا کہ کیا حالت احرام میں بھڑ مارنا جائز ہے تو فرمایا کہ ہاں جائز ہے فرمایا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے'' مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا'' اور جناب نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ'' عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ'' اور حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ بھڑ مارنا حالت احرام میں جائز ہے۔ گویا حضرت عمرؓ کا فرمان جناب نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے اور نبی اکرم ﷺ کا فرمان اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، یہاں ایک فرق کی وضاحت ضروری ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کا ہر ارشاد براہ راست قرآن کریم کا حصہ تو نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی'' مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا'' کے مطابق قرآنی تعلیمات کا حصہ ضرور ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے ارشاد کا مطلب یہی ہے اور حضرت امام شافعیؒ کے فرمان کا مقصد بھی یہی ہے۔ ابو داؤد شریف کی ایک روایت میں جناب نبی اکرم ﷺ نے خود بھی اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ ''الا وانی أوتيت القرآن ومثله معه'' خبردار مجھے قرآن کریم بھی دیا گیا ہے اور اس جیسے اور احکام بھی دیے ہیں، اسی ارشاد گرامی میں جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس چیز کو میں حرام قرار دیتا ہوں وہ بھی ویسے ہی حرام ہے جیسے وہ چیز حرام ہے جسے قرآن کریم نے حرام کہا ہے۔

اس موقع پر ایک صاحب نے چٹ کے ذریعہ سوال کیا کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے اپنے اوپر شہد حرام کیا تھا جس سے قرآن کریم نے منع فرما دیا تھا اس کا جواب مولانا زاہد الراشدی نے یہ دیا کہ جناب نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں صورت حال یہ تھی کہ آپ کی کوئی بات اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف ہوتی تو اس پر وحی کے ذریعہ نکیر ہو جاتی تھی اور ایسی چند باتوں کا قرآن کریم میں ذکر موجود ہے لیکن جناب نبی اکرم ﷺ کے وصال اور وحی کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد آپ ﷺ کا ہر وہ ارشاد اور عمل وحی کا درجہ اختیار کر گیا ہے جس

پر آپ ﷺ کی زندگی میں وحی کے ذریعہ نکیر نہیں ہوئی مثلاً قران کریم نے خنزیر کو حرام کیا ہے مگر کتے کا ذکر نہیں کیا اور کتے کے حرام ہونے کا اعلان جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا جس پر وحی خاموش رہی ہے اس لئے جیسے خنزیر حرام ہے اسی طرح کتا بھی حرام ہے۔

حضرات محترم!

میں نے جناب نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کے صرف ایک پہلو پر مختصراً کچھ گزارشات پیش کی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف پیغامات پہنچانے کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ وحی اور پیغامات پہنچانے کے ساتھ ساتھ اس پر عمل کے لئے نمونہ اور اسوہ بھی تھے اور دین پر عملدرآمد کے حوالہ سے آئیڈیل کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے جس طرح قرآن کریم کے ارشادات کی تعمیل ضروری ہے اسی طرح جناب نبی اکرم ﷺ کے فرمودات اور سنتوں کی پیروی بھی لازم ہے، بلکہ قرآن کریم نے یہ فرمایا ہے کہ ”مَن یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللهَ“ جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی گویا اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی وہی قبول ہوگی جو جناب نبی اکرم ﷺ کی اتباع کی صورت میں ہوگی۔ ¾ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

فہم قرآن کے دو صحیح راستے

"جامع مسجد امین، فیصل آباد میں درس قرآن کریم کی تکمیل کے موقع پر خطاب"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاِتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اما بعد!

ہم قرآن کریم کے حوالہ سے ایک تقریب میں جمع ہیں، آپ کے خطیب و امام مولانا مفتی محمد سعید صاحب نے چار سال میں آپ کو درس کے ذریعہ پورا قرآن کریم ترجمہ وتفسیر کے ساتھ سنایا ہے جو بڑی سعادت کی بات ہے اور امید ہے کہ وہ اس مبارک سلسلہ کو دوبارہ بھی شروع کریں گے، میں اس سعادت پر مفتی صاحب اور آپ سب دوستوں کو مبارک باد دیتے ہوئے فہم قرآن کریم کے ایک پہلو پر کچھ گزارشات پیش کرنا چاہوں گا دعا کریں کہ اللہ رب العزت مجھے مقصد کی باتیں عرض کرنے کی توفیق دیں اور پھر ان پر ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق سے بھی نوازیں، آمین یارب العالمین۔

فہم قرآن کے حوالہ سے بیسیوں پہلو ہیں جن کے بارے میں عرض کیا جا سکتا ہے اور ان کی ضرورت بھی ہے لیکن آج میں صرف اس ایک پہلو پر گزارش کروں گا کہ قرآن کریم کا ترجمہ پڑھتے ہوئے کسی تفسیر کا مطالعہ کرتے ہوئے یا درس سنتے ہوئے قرآن کریم کی کسی آیت کے مفہوم کے بارے میں ذہن الجھ جائے، مغالطہ لگ جائے، غلط فہمی پیدا ہو

جائے، کنفیوژن ہو جائے، کوئی اشکال سامنے آجائے تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے۔

جہاں تک مغالطہ لگ جانے یا الجھن پیدا ہونے کی بات ہے یہ فطری بات ہے، انسانی ذہنوں میں بہت زیادہ تفاوت ہے اس لئے کہیں نہ کہیں غلط فہمی ہو ہی جاتی ہے اور ذہن کنفیوژن کا شکار ہو جاتا ہے بڑے بڑے لوگوں کو مغالطے لگ جاتے ہیں، حضرات صحابہ کرامؓ کو بعض آیات کے سمجھنے میں غلطی لگ جاتی تھی اور وہ بڑی بڑی الجھنوں کا شکار ہو جاتے تھے لیکن ان کے پاس اس کا ایک سیدھا سا حل موجود تھا، کہ وہ ایسی کسی بھی الجھن پر جناب نبی اکرم ﷺ سے رجوع کرتے تھے اور نبی اکرم ﷺ اس آیت کا جو مفہوم بیان کرتے اور اشکال کا جو حل پیش کرتے اس پر ان کا اطمینان ہو جاتا، ظاہر بات ہے کہ نبی اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور اللہ کے نمائندے ہیں وہ قرآن کریم کی کسی آیت کا مفہوم بیان کرتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوتا ہے اور وہی اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی منشا ہوتی ہے۔

حدیث کی کتابوں میں اسی سلسلہ میں بیسیوں واقعات موجود ہیں ان میں سے بات سمجھانے کے لئے ایک دو کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔

عدی بن حاتمؓ جناب نبی اکرم ﷺ کے معروف صحابی ہیں، حاتم طائی کے بیٹے ہیں، اسلام قبول کرنے سے پہلے عیسائی تھے، اسلام قبول کیا، قرآن کریم پڑھا تو ایک جگہ ان کا ذہن اٹک گیا قرآن کریم کی سورۃ التوبہ آیت نمبر 13 میں اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کے بارے میں کہا ہے کہ

"اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ الخ"

انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ تعالیٰ کے ورے رب بنا لیا تھا، عدیؓ کہتے ہیں کہ ہم جب عیسائی تھے تو اپنے علماء اور مشائخ کو رب نہیں کہتے تھے اور نہ ہی رب کا

درجہ دیتے تھے، انہوں نے اشکال جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا جس کی ظاہری صورت یہ تھی کہ خدانخواستہ قرآن کریم نے ایک خلاف واقعہ بات کہہ دی ہے۔

جناب نبی اکرم ﷺ نے عدیؓ سے پوچھا کہ کیا تمہارے ہاں علماء و مشائخ کو حلال و حرام میں رد و بدل کا اختیار تھا یا نہیں؟ عدیؓ نے کہا کہ یہ تو تھا یعنی مسیحیوں کے ہاں ان کے علماء و مشائخ کو یہ اتھارٹی حاصل تھی کہ وہ جس چیز کو حلال کہہ دیں وہ حلال ہے اور جسے حرام کہہ دیں وہ حرام ہے۔

یہ اختیار آج بھی کیتھولک عیسائیوں میں پاپائے روم کو اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں میں آرچ بشپ آف کنٹربری کو حاصل ہے کہ وہ کسی بھی چیز کو حلال یا حرام قرار دے سکتے ہیں ،جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ علماء و مشائخ کو اس اختیار اور اتھارٹی کا حامل سمجھنا ہی ان کو ''اَرْبَاباً مِنْ دُوْنِ اللہِ'' سمجھنا ہے اور قرآن کریم نے اسی کی نشاندہی کی ہے جبکہ اسلام میں یہ اختیار کسی کو حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی کسی چیز کو حرام کرسکیں یا اللہ تعالیٰ کی حرام قرار دی ہوئی کسی چیز کو حلال بتاسکیں، تھوڑی دیر کے لئے سوچیں کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے سوا کسی کو یہ اختیار دیتے تو کس کو دیتے؟

ظاہر بات ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو جناب نبی اکرم ﷺ ہی اس کے حق دار تھے کہ انہیں حلال و حرام میں رد و بدل کا اختیار دیا جاتا لیکن یہ بات نبی اکرم ﷺ سے ہی اللہ تعالیٰ نے سورۃ التحریم پارہ نمبر 28 میں فرمائی ہے کہ ''لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللہُ لَكَ'' جو چیز اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے حلال کی ہے اسے آپ کیسے حرام قرار دے رہے ہیں؟ اسی لئے ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حلال یا حرام کہا ہے اسے تبدیل کرنے کا اگر جناب نبی اکرم ﷺ کو اختیار نہیں ہے تو پھر کائنات میں کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اسے حلال و حرام میں رد و بدل کی اتھارٹی تسلیم کیا جائے لیکن میں اسی حوالہ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی اس آیت کے مفہوم میں حضرت عدیؓ کو اشکال ہوا تو انہوں نے جناب نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رجوع کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی جو وضاحت فرمائی اس پر ان کا اطمینان ہو گیا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ بھی معروف صحابہ کرامؓ میں سے ہیں، صف اول کے جرنیل تھے اور بہت بڑے ڈپلومیٹ بھی تھے، ترمذی شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں نجران کے علاقے میں اسلام کی دعوت کے لئے بھیجا جو عیسائیوں کا علاقہ تھا، انہوں نے وہاں جا کر جب قرآن کریم پر ایمان لانے کی دعوت دی تو وہاں کے عیسائی نے قرآن کریم پر ایک اعتراض کر دیا جس کا جواب مغیرہ بن شعبہؓ نہ دے سکے اور وہاں سے واپس آگئے۔

وہ اعتراض یہ تھا کہ قرآن کریم نے حضرت مریم علیہا السلام کا تذکرہ ایک مقام پر ''یَا أُخْتَ هَارُونَ'' کہہ کر کیا ہے اور انہیں ھارون کی بہن قرار دیا ہے، عیسائی علماء نے کہا کہ ھارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے اور مریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ تھیں دونوں کے درمیان صدیاں حائل ہیں اس لئے حضرت ہارون اور حضرت مریم علیہما السلام کیسے آپس میں بہن بھائی ہو سکتے ہیں؟

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے اس کا جواب نہ بن پڑا اور انہوں نے مدینہ منورہ واپسی پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اس کا تذکرہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بندۂ خدا تو اتنی سادہ سی بات بھی ان سے نہیں کہہ سکا کہ وہ لوگ اپنے بچوں کے نام انبیاء کرام علیہم السلام کے ناموں پر برکت کے لئے رکھا کرتے تھے اور حضرت مریم علیہا السلام کے بھائی کا نام بھی ہارون تھا جو حضرت ہارون علیہ السلام کے نام پر رکھا گیا تھا، یہاں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو قرآن کریم کی ایک آیت کے بارے میں الجھن میں ڈالا گیا تو انہوں نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رجوع کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وضاحت پر ان کا اطمینان ہو گیا۔

اس لئے میں آپ حضرات سے پہلی گزارش یہ کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کو سمجھنے کی کوشش میں کہیں نہ کہیں الجھن ہوسکتی ہے مغالطہ لگ سکتا ہے جہاں ایسا ہو تو سب سے پہلے جناب نبی اکرم ﷺ کی طرف رجوع کریں گے، اپنی طرف سے دھکا نہیں کریں گے اور کسی آیت کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کے ارشاد یا عمل سے راہ نمائی مل جائے تو پھر کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ بسا اوقات کسی بات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اس کے بیک گراؤنڈ سے واقفیت ضروری ہو جاتی ہے اور جب تک اس کی بیک گراؤنڈ سامنے نہ آئے اس کے صحیح مفہوم تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے، اس حوالہ سے بھی احادیث میں متعدد واقعات موجود ہیں، ان میں سے ایک دو واقعات عرض کرنا چاہوں گا۔

قرآن کریم کی سورۃ بقرہ آیت نمبر 158 میں صفا مروہ کی سعی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا" جو شخص حج کرے یا عمرہ کرے تو کوئی حرج نہیں کہ وہ صفا مروہ کی سعی بھی کرے، اس جملہ کے ظاہری مفہوم کا تقاضہ یہ ہے کہ صفا مروہ کی سعی کی صرف اجازت دی گئی ہے اور وہ حج یا عمرہ میں کوئی ضروری امر نہیں ہے، یہ اشکال صحابہ کرامؓ کے دور میں بھی سامنے آیا، بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت عروۃ بن زبیرؒ نے ام المومنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں یہ اشکال پیش کیا، ام المومنینؓ نے جواب دیا کہ جاہلیت کے دور میں قریش اور ان کے بعض حلیف قبائل حج اور عمرہ میں بیت اللہ کے طواف کے بعد صفا مروہ کی سعی کرتے تھے لیکن اوس اور خزرج کے لوگ صفا مروہ کی سعی نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی جگہ قدید کے مقام پر واقع بت خانے "مناۃ" میں جایا کرتے تھے اور صفا مروہ کی سعی کو جاہلیت کی علامت قرار دیا کرتے تھے لیکن جب فتح مکہ کے بعد مناۃ اور دیگر بت خانے توڑ دیے گئے تو اوس اور خزرج کو جو دونوں انصار مدینہ کے قبیلے تھے اشکال ہوا کہ وہ بیت اللہ کے طواف کے بعد کہاں جائیں

گے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے انصار مدینہ سے کہا کہ صفا مروہ کی سعی جاہلیت کی بات نہیں بلکہ شعائر اللہ کی تعظیم کی بات ہے اس لئے کوئی حرج نہیں ہے کہ بیت اللہ کے طواف کے ساتھ صفا مروہ کی سعی بھی کر لی جائے، ام المومنینؓ کا ارشاد ہے کہ "لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ" کا جملہ انصار مدینہ کے لئے کہا گیا ہے جو اسے حرج اور جاہلیت کی بات سمجھا کرتے تھے، ام المومنین حضرت عائشہؓ کی اس وضاحت کی روشنی میں غور فرمائیں کہ اگر یہ وضاحت سامنے نہ ہو اور اس آیت کا یہ بیک گراؤنڈ جسے ہماری اصطلاح میں شان نزول کہا جاتا ہے علم میں نہ ہو تو اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا اور اسی وجہ سے آج بھی بعض متجددین اسی شبہ کا شکار ہیں جس کا اظہار حضرت عروہ بن زبیرؓ نے کیا تھا لیکن ان کا شبہ ام المومنینؓ کی وضاحت کے بعد دور ہو گیا تھا جبکہ ہمارے دور کے بعض متجددین مسلسل مغالطہ کا شکار ہیں۔

حضرت قدامہ بن مظعونؓ بدری صحابی تھے، حضرت عمرؓ کے برادر نسبتی تھے اور ان کے دور خلافت میں غالباً بحرین کے گورنر تھے، ان کے بارے میں رپورٹ ہے کہ وہ کبھی کبھی شراب پیتے تھے، انکوائری کرائی گئی تو رپورٹ درست ثابت ہوئی، حضرت عمرؓ نے انہیں طلب کر لیا اور پوچھا تو انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ کبھی کبھی تھوڑی بہت پیتے ہیں اور اس لیے پیتے ہیں کہ قرآن کریم نے اس کی اجازت دے رکھی ہے، انہیں قرآن کریم کی سورۃ المائدہ آیت نمبر 93 سے مغالطہ ہوا تھا جو شراب کی حرمت و ممانعت کے بعد ہے اور جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ "لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْا" جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کئے ان پر کوئی حرج نہیں جو انہوں نے تھوڑی بہت چکھ لی۔

حضرت عمرؓ کو ان کی زبان سے یہ سن کر سخت غصہ آیا اور فرمایا کہ اگر تم بدری صحابی نہ ہوتے تو میں تمہاری چمڑی اتار دیتا، خدا کے بندے یہ تمہارے بارے میں نہیں کہا گیا بلکہ جب شراب کی حرمت و ممانعت کا اعلان ہوا اور اسے قرآن کریم میں "رجس" گندگی

قرار دیا گیا تو بعض صحابہؓ کو اشکال ہوا کہ ہمارے جو بھائی شراب کی حرمت کے اعلان سے پہلے پیتے تھے اور اسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں تو کیا یہ ''رجس'' (گندگی) ان کے پیٹوں میں ان کے ساتھ گئی ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے انہوں نے شراب کی حرمت سے پہلے جو شراب پی لی ہے اس میں ان پر کوئی حرج نہیں ہے، گویا ''لا جناح'' شراب کی حرمت کے بعد کے لئے نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے کے حوالہ سے ہے۔

یہاں بھی میں اس بات پر غور و فکر کی دعوت دوں گا کہ اگر اس آیت کا یہ شان نزول سامنے نہ ہو جو حضرت عمرؓ بیان کر رہے ہیں تو اس کا صحیح مفہوم سمجھنا بھی ممکن نہیں ہے، اور اسی وجہ سے اس آیت کے بارے میں بھی بعض متجددین مغالطے کا شکار ہیں اور لوگوں کو مغالطہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

حضرات محترم!

میں نے چند واقعات آپ کو یہ بات سمجھانے کے لئے پیش کیے ہیں کہ قرآن کریم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے مغالطے اور الجھن کا شکار ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے یہ فطری چیز ہے اور بڑے بڑے لوگ بڑے بڑے مغالطوں کا شکار ہوتے رہے ہیں لیکن اس کا حل یہ نہیں ہے کہ ہم ان مغالطوں پر اڑ جائیں یا انہیں اپنی عقل اور سمجھ سے ہی حل کرنے کی کوشش کرتے رہیں بلکہ ایسے کسی بھی مغالطے، الجھن، غلط فہمی، کنفیوژن اور اشکال کو دور کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی منشا سمجھ کر قبول کر لیا جائے اور دوسرے نمبر پر یہ ضروری ہے کہ جس آیت کریمہ کے بارے میں الجھن پیدا ہو رہی ہے اس کے بیک گراؤنڈ کے معلوم کرنے کی کوشش کی جائے جو ظاہر ہے کہ کسی صحابیؓ سے معلوم ہو گی۔ کوئی صحابیؓ ہی یہ بتائے گا کہ یہ آیت کب نازل ہوئی تھی اور کس ماحول اور تناظر میں اس کا نزول ہوا تھا۔

اس طرح قرآن کریم کے صحیح فہم کیلئے ہمارے پاس دو راستے اور معیار ہیں، ایک سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرا اقوال صحابہ کرامؓ ان دو اصولوں کو اگر ہم پلے باندھ لیں تو قرآن کریم کو سمجھنے میں کہیں بھی کوئی الجھن پیش نہیں آئے گی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں فہم قرآن کریم کی نعمت سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

قرآن وحدیث

''رمضان المبارک 1432ھ کے پہلے عشرہ کے دوران مکی مسجد بروک لین نیویارک میں مختلف نشستوں سے خطاب''

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اما بعد!

مکی مسجد کے خطیب و امام حافظ محمد صابر صاحب نے فرمایا کہ میں چار پانچ روز تک یہاں مقیم ہوں تو نماز فجر کے بعد ایک حدیث بیان کر دیا کروں میں نے سوچا ہے کہ حدیث بیان کرنے کی بجائے حدیث نبوی ﷺ کے بارے میں مختصراً کچھ بیان ہو جائے جو تھوڑا تھوڑا کر کے چار پانچ روز میں مکمل کر دوں گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔

حدیث عربی زبان میں بات چیت اور گفتگو کو کہتے ہیں لیکن جب ہم مذہبی حوالہ سے حدیث کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے مراد ہر وہ بات ہوتی ہے جو جناب نبی اکرم ﷺ سے منقول و منسوب ہو یا ان کے بارے میں کسی روایت میں مذکور ہو، کسی قول عمل یا واقعہ میں جناب نبی اکرم ﷺ کا ذکر آجائے تو وہ حدیث بن جاتا ہے اور حدیث نبوی ﷺ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ کے بقول تمام دینی علوم کا سرچشمہ ہے۔

رمضان المبارک میں ہم قرآن پاک عام دنوں سے زیادہ پڑھتے سنتے ہیں اور یہاں

بھی تراویح میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد روزانہ قرآن پاک سماعت کر رہی ہے، قرآن کریم کے ساتھ حدیث کا کیا تعلق ہے؟ اس پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔

قرآن کریم تک رسائی کا ذریعہ حدیث مبارکہ:

پہلی بات یہ ہے کہ حدیث نبوی ﷺ قرآن کریم تک پہنچنے کا ذریعہ ہے ہم قرآن کریم کے الفاظ جملوں اور آیات تک حدیث کے ذریعہ ہی پہنچتے ہیں اگر حدیث کا واسطہ درمیان میں نہ ہو تو قرآن کریم تک پہنچنا ممکن ہی نہیں ہے۔ مثلاً یہ ہمارے علم میں ہے کہ قرآن کریم کی پہلی آیات جو نازل ہوئی تھیں وہ سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات ہیں۔

اَقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ○ (سورۃ العلق)

ہر صاحب علم مسلمان یہ جانتا ہے اور اس پر ایمان رکھتا ہے کہ یہ پانچ آیات قرآن کریم کی وہ پہلی آیات ہیں جو غار حرا میں جناب نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئی تھیں مگر یہ بات ہمیں معلوم کیسے ہوئی؟ اور کس ذریعہ سے ہم نے ان پانچ آیات تک رسائی حاصل کی؟ یہ ذریعہ حدیث نبوی ﷺ کی وہ روایت ہے جس میں غار حراء کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ پر وحی کے نزول کے آغاز کی کیفیات ذکر کی گئی ہیں، اگر یہ واقعہ اور اس کے بارے میں یہ روایات ہمارے علم میں نہ ہوں اور ہم ان پر یقین نہ رکھیں تو قرآن کریم کی ان پانچ آیات تک رسائی کا ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

سب سے پہلے تلاوت ہونے والی سورت:

اسی طرح ہم یہ جانتے ہوئے بھی کہ پہلی آیات کریمہ سورۃ العلق والی ہیں لیکن جب ہم قرآن کریم کی تلاوت شروع کرتے ہیں تو سورۃ العلق کی پانچ آیات سے نہیں بلکہ سورۃ الفاتحہ کی سات آیات کی تلاوت سے آغاز کرتے ہیں اور پورے قرآن کریم کی تلاوت اس

ترتیب سے نہیں کرتے جس ترتیب سے وہ نازل ہوا تھا، ترتیب کی اس تبدیلی کا ہمارے پاس کیا جواز ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کی دلیل یہی ہوگی کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے اسے اس ترتیب کے ساتھ پڑھنے کا حکم دیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے کون سی آیت اور سورت کس ترتیب کے ساتھ پڑھنے کا حکم دیا ہے یہ بات ہمیں کس ذریعہ سے معلوم ہوئی ہے اور قرآن کریم کی ترتیب نبوی ﷺ معلوم کرنے کا ذریعہ ہمارے پاس کیا ہے؟ یہی کہ کوئی صحابی نبی اکرم ﷺ سے روایت کرے گا کہ فلاں سورۃ نبی اکرم ﷺ نے اس ترتیب کے ساتھ پڑھی ہے اور فلاں آیت کو اس ترتیب کے ساتھ تلاوت کیا ہے یہ روایت جو قرآن کریم کی ترتیب کے بارے میں کوئی صحابی بیان کر رہا ہے یہی حدیث کہلاتی ہے، اور قرآن کریم کی اس ترتیب تک رسائی کا ذریعہ ہمارے پاس حدیث کے سوا کوئی نہیں ہے پھر قرآن کریم کے اس ''مصحف'' کو دیکھ لیجئے جو ہمارے پاس موجود ہے اور ''مصحف عثمانی'' کہلاتا ہے۔

سب سے پہلے قرآن کریم کس کے دور میں اور کس نے مرتب کیا؟

قرآن کریم کو اس ترتیب کے ساتھ کتابی شکل میں حضرت زید بن ثابتؓ نے خلیفہ وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حکم سے لکھا تھا، جناب نبی اکرم ﷺ کے دور میں قرآن کریم کتابی شکل میں مرتب نہیں تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی اس لئے کہ حفاظ کرام بکثرت موجود تھے اور ویسے بھی اس معاشرے میں حافظہ اور یادداشت پر اس قدر اعتماد کیا جاتا تھا کہ لکھنے پڑھنے کو کمزوری سمجھا جاتا تھا، اس کی ضرورت حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں مختلف جنگوں میں حافظ قرآن صحابہ کرامؓ کی کثرت کے ساتھ شہادت کی وجہ سے محسوس کی، اس کی بنا احتیاط اور تحفظ پر تھی کہ حفاظ کرام اس کثرت کے ساتھ جام شہادت نوش کر رہے ہیں کہیں قرآن کریم کی حفاظت کے بارے میں کوئی مشکل نہ پیدا ہو جائے اس تحفظ اور احتیاط کے ذہن سے حضرت عمرؓ کی تجویز بلکہ اصرار پر حضرت ابوبکرؓ نے

حضرت زید بن ثابتؓ سے قرآن کریم کا ایک نسخہ کتابی شکل میں لکھوا کر محفوظ کر لیا، جسے بعد میں حضرت عثمانؓ نے اپنے دورِ خلافت میں کچھ مزید تحفظات اور احتیاطات کے حوالہ سے دوبارہ لکھوا کر اس کے چند نسخے عالم اسلام کے مختلف حصوں میں بھجوا دیے، سوال یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے قرآن کریم کا یہ کتابی مصحف کس بنیاد پر مرتب کیا تھا اور ان کے پاس اس کا ذریعہ کیا تھا؟

قرآن کریم جمع کرنے کا معیار:

حضرت زید بن ثابتؓ خود قرآن کریم کے حافظ تھے لیکن وہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے یہ اصول قائم کر لیا تھا کہ ہر آیت پر جناب نبی اکرم ﷺ سے سننے والے کم از کم دو اور صحابی شہادت دیں گے تو وہ اسے تحریر میں لائیں گے، اس اصول پر انہوں نے سارا قرآن کریم تحریر کر لیا مگر سورہ یونس کی آخری دو آیات پر انہیں الجھن پیش آگئی کہ ان پر صرف ایک صحابی ان آیات کو جناب نبی اکرم ﷺ سے سننے کی گواہی دے رہے تھے، وہ حضرت خزیمہ بن ثابتؓ تھے ان کے ساتھ دوسرا گواہ نہیں مل رہا تھا لیکن چونکہ جناب نبی اکرم ﷺ نے ایک واقعہ میں حضرت خزیمہؓ کی شہادت کو دو گواہوں کی شہادت قرار دے رکھا تھا اس لئے ان آیات کو اسی بنیاد پر قرآن کریم میں تحریر کیا گیا۔ میرا عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے جن روایات کی بنیاد پر قرآن کریم کا یہ مصحف مرتب اور تحریر کیا وہ احادیث ہی ہیں اور انہی احادیث کے ذریعہ ہم نے یہ مصحف حاصل کیا ہے۔

1) قرآن کریم سے پہلے حدیث کو ماننا ضروری ہے:

اس لئے میری پہلی گزارش یہ ہے کہ حدیث نبوی ﷺ قرآن کریم تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے اور اس ذریعہ کو درمیان سے ہٹا دیں تو ہمارا قرآن کریم کی آیات، سورتوں اور

ترتیب تک رسائی حاصل کرناممکن ہی نہیں ہے،لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کے بعد حدیث پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، مگر میں یہ عرض کرتاہوں کہ قرآن کریم سے پہلے حدیث پر ایمان لانا ضروری ہے اس لئے کہ حدیث پر ایمان نہیں ہوگا تو قرآن کریم پر ایمان ہو ہی نہیں سکتا۔

2) قرآن کریم سے پہلے آپ ﷺ کو ماننا بھی ضروری ہے:

دوسری بات یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ قرآن کریم نے اپنے ساتھ جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کو بھی مطاع اور واجب الاتباع قرار دیا ہے اور نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کو قیامت تک مسلمانوں کے لئے اسوہ حسنہ کا درجہ دیا ہے جس کی قدم بہ قدم پیروی ضروری ہے۔

جناب نبی اکرم ﷺ کی اطاعت اور اسوۂ حسنہ کے طور پر آپ کی قدم بہ قدم پیروی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہمیں نبی اکرم ﷺ کے ارشادات واقوال، احوال وافعال اور واقعات کا علم بھی ہو اس کے بغیر ہم اس فریضہ کی انجام دہی میں سرخرو نہیں ہو سکتے ،اور یہ اقوال وافعال اور واقعات وکیفیات معلوم کرنے کا واحد ذریعہ حدیث نبوی ﷺ ہے اسی کے ذریعہ ہم کسی معاملہ میں جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کی منشا معلوم کر کے اس پر عمل کر سکتے ہیں۔

3) قرآن کریم سمجھنے میں اگر الجھن پیش آجائے تو حضور ﷺ کی طرف رجوع کرنا ہوگا:

تیسرے نمبر پر یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کی کسی آیت کریمہ کے سمجھنے میں الجھن پیش آئے تو اسے حل کرنے کے لئے سب سے پہلے جناب نبی اکرم ﷺ

سے رجوع کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ صاحب قرآن ہونے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے نمائندہ بھی ہیں اور وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، صحابہ کرامؓ کو بھی جب کسی آیت یا جملہ کا مفہوم سمجھنے میں الجھن ہوتی تھی تو وہ نبی اکرم ﷺ سے رجوع کرتے تھے اس سلسلہ میں بیسیوں واقعات حدیث وتفسیر کے ذخیرے میں موجود ہیں جن میں سے مثال کے طور پر ایک آدھ کا ذکر کر دیتا ہوں، قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے کہ ......

''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ''

''اے ایمان والو! تم پر لازم ہے کہ اپنا فکر کرو دوسرا کوئی اگر گمراہ ہوتا ہے تو وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں دے گا اگر تم خود ہدایت پر ہو''

اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ دوسروں کی گمراہی کے بارے میں کوئی فکر اور تردد کرنے کی ضرورت نہیں حالانکہ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ خود بھی جہنم کی آگ سے بچیں، اپنے گھر والوں کو بھی بچائیں اور معاشرے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ماحول قائم کریں۔

چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ نے جب مرتدین، منکرین ختم نبوت اور مانعین زکوٰۃ کے خلاف عملی جہاد کا اعلان کیا تو کسی نے یہ آیت کریمہ پڑھ دی، اس ماحول میں اس آیت کریمہ کا حوالہ دینے کا مطلب آپ سمجھتے ہیں کہ کیا ہو سکتا تھا، بخاری شریف کی روایت کے مطابق اس پر حضرت صدیق اکبرؓ نے باقاعدہ خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا کہ لوگو! اس آیت کریمہ سے دھوکے میں نہ پڑنا اس لیے کہ میں نے جناب نبی اکرم ﷺ سے خود سنا ہے، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو، یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جب خواہش پرستی اور بخل کے فتنوں کے باعث اپنا ایمان بچانا

مشکل ہو جائے تو پھر سب سے پہلے اپنے ایمان کی فکر کرو یعنی "علیکم انفسکم "کا حکم عام حالات میں نہیں ہے بلکہ فتنوں کے اس دور میں ہے جب فتنوں کی کثرت اور غلبہ کی وجہ سے خود اپنے ایمان کی خود حفاظت بھی مشکل ہو جائے جبکہ ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ اس آیت کریمہ کے حوالہ سے یہی اشکال ایک صاحب نے حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے فرمایا کہ تم نے باخبر آدمی سے سوال کیا ہے اس لئے کہ مجھے بھی اس آیت پر یہی اشکال ہوا تھا اور میں نے جناب نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا تو انہوں نے اس پر یہی فرمایا تھا کہ اس آیت کریمہ کا حکم فتنوں کے دور کے بارے میں ہے اور اس سے اس کا ظاہری مفہوم مراد نہیں ہے۔

اب دیکھیے کہ ایک آیت کریمہ کا مفہوم ومصداق سمجھنے میں صحابہ کرامؓ کو الجھن پیش آئی اور جناب نبی اکرم ﷺ نے اس کی وضاحت فرما دی، اس قسم کی الجھنیں بیسیوں آیات کریمہ کے بارے میں صحابہ کرامؓ کو پیش آئی ہیں جن کی وضاحت نبی اکرم ﷺ نے فرمائی ہے اور یہ احادیث نبویہ ہی ہیں جن کے ذریعہ ان وضاحتوں تک ہماری رسائی ہوتی ہے جو جناب نبی اکرم ﷺ نے قرآن کریم کی مختلف آیات کے بارے میں فرمائی ہے اور احادیث نبویہ ﷺ اور روایات کے بغیر ہمارے پاس ان کا علم حاصل کرنے کا اور کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے۔

4) غیر مسلموں کی طرف سے اگر کوئی اعتراض آئے تو بھی اس کا جواب حضور ﷺ سے لیا جائے گا، جو احادیث سے ملے:

چوتھی بات اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی مختلف آیات کریمہ کے بارے میں غیر مسلموں کی طرف سے اعتراضات کیے گئے جن کا جواب حاصل کرنے کے

لئے صحابہ کرامؓ نے نبی اکرم ﷺ سے رجوع کیا اور آنحضرت ﷺ نے ان کی وضاحت فرما دی، مثلاً قرآن کریم کی سورۃ توبہ آیت نمبر 31 میں ہے کہ......

”اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ“

عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ساتھ اپنے احبار اور رہبان یعنی علماء اور مشائخ کو بھی اللہ تعالیٰ کے بعد رب بنالیا تھا، اس پر حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے جو اسلام قبول کرنے سے پہلے مسیحی سردار تھے اشکال پیش کیا کہ ہمارے ہاں تو ایسا نہیں ہوتا تھا قرآن کریم نے ہمارے بارے میں یہ کیا کہہ دیا ہے؟ ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم تو اپنے مشائخ اور علماء کو رب کا درجہ نہیں دیا کرتے تھے جناب نبی اکرم ﷺ نے اس کے جواب میں ان سے پوچھا کہ کیا تمہارے علماء و مشائخ کو حلال و حرام کا اپنی طرف سے فیصلہ کرنے کی اتھارٹی حاصل تھی؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ اتھارٹی تو انہیں حاصل تھی اور میں عرض کرتا ہوں کہ یہ اتھارٹی آج بھی کیتھولک عیسائیوں میں پاپائے روم کو حاصل ہے کہ وہ جس چیز کو حلال کہہ دیں وہ حلال سمجھی جاتی ہے اور جس کو حرام کہہ دیں وہ حرام قرار پاتی ہے، جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ رب بنانے کا مطلب یہی ہے کہ حلال و حرام میں رد و بدل کا اختیار جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے عیسائیوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اس اختیار کا حامل قرار دے رکھا تھا۔ اس سلسلہ میں اسلام کا عقیدہ کیا ہے؟ ذرا غور کر لیجیے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی شخصیت کو حلال و حرام میں رد و بدل کا صوابدیدی اختیار دیتا تو اس کا حق سب سے زیادہ جناب نبی اکرم ﷺ کا ہو سکتا تھا لیکن جب نبی اکرم ﷺ نے اپنی ذات کے لئے شہد کو حرام قرار دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ ”يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ“ اے نبی! جو چیز ہم نے آپ کے لئے حلال کی ہے وہ آپ نے کیسے حرام قرار دے دی؟

چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے حکم خداوندی کے تحت قسم توڑی اس کا کفارہ دیا اور شہد استعمال کیا، اسی طرح کا ایک اعتراض حضرت مغیرہ بن شعبہؓ پر ہوا جب وہ نجران کے علاقے میں دعوت اسلام کے لئے گئے، ترمذی شریف کی روایت کے مطابق وہاں کے مسیحی علماء نے قرآن کریم سورۃ مریم کی آیت نمبر میں یا اُخت ھارون کہہ کر حضرت مریم علیہا السلام کو ہارون کا بھائی قرار دیا ہے جبکہ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے اور ان کے درمیان ہزاروں سال کا فاصلہ ہے، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا، اور مدینہ منورہ واپسی پر یہ سوال نبی اکرم ﷺ کے سامنے پیش کر دیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ حضرت مریم علیہا السلام کے بھائی کا نام بھی ہارون تھا اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام نہیں تھے بنی اسرائیل میں لوگ اپنے بچوں کے نام انبیاء کرام علیہم السلام کے نام پر رکھا کرتے تھے۔

تو میں نے آپ حضرات کے سامنے جو گزارشات پیش کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ جملوں، آیات اور سورتوں تک رسائی کی بات ہو اس کی ترتیب کا مسئلہ ہو، مصحف قرآنی کی اساس اور ماخذ کا معاملہ ہو، کسی آیت کا مفہوم سمجھنے میں الجھن درپیش ہو یا قرآن کریم کی کسی بات پر غیر مسلموں کے کسی اعتراض کا مسئلہ ہو ہر معاملہ میں ہم حدیث نبوی ﷺ کے محتاج ہیں اور ان میں سے کوئی مسئلہ بھی حدیث نبوی ﷺ کے ذریعہ کے بغیر حل نہیں ہو سکتا اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسی پس منظر میں فرمایا ہے کہ تمام علوم دینیہ کا سرچشمہ اور اساس حدیث نبوی ﷺ کا علم ہے، اسی سے ہمیں قرآن ملتا ہے، اسی سے سنت حاصل ہوتی ہے اور اسی کی بنیاد پر فقہ تشکیل پاتی ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو حدیث نبوی ﷺ کا صحیح یقین اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

قرآن مجید کے چند آداب

''9 اکتوبر 2011ء کو الشریعۃ اکادمی گوجرانوالہ میں ہفتہ وار درس قرآن کریم کی افتتاحی تقریب سے خطاب''

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

ہمارے اس سال کے تعلیمی پروگرام میں ہفتہ وار درس قرآن کریم کا اہتمام بھی شامل ہے جو ہر اتوار کو نماز مغرب کے فوراً بعد ہوا کرے گا، کوشش کروں گا کہ میں خود اس تسلسل کو جاری رکھوں البتہ کسی وقت میری غیر حاضری ہوئی تو اکیڈمی کے کوئی سینئر استاذ درس دیں گے اور درس قرآن کریم کے اس سلسلہ کی پابندی کی کوشش کی جائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ، آج تمہید اور آغاز کے طور پر چند گزارشات پیش کر رہا ہوں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کارِ خیر کو جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

قرآن کریم نے خود اپنے بارے میں بھی متعدد ہدایات اور احکامات بیان فرمائے ہیں جن میں سے دو تین کا تذکرہ کرنا چاہوں گا مثلاً ایک جگہ ارشاد ربانی ہے کہ ''لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ'' قرآن کریم کو پاک لوگ ہی ہاتھ لگاتے ہیں، اس سے فقہاء کرام نے یہ مسئلہ بیان فرمایا ہے کہ قرآن کریم کو طہارت کے بغیر ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے، طہارت کے دو درجے ہیں

ایک یہ کہ انسان پر غسل واجب ہو مرد ہو یا عورت اگر اس پر غسل واجب ہو گیا ہے تو قرآن کریم کو ہاتھ سے چھونا بھی اس کے لئے جائز نہیں ہے، اور فقہاء کرام نے اس حالت میں قرآن کریم کی تلاوت سے بھی منع کیا ہے، الا یہ کہ کوئی جملہ دعا کے طور پر پڑھ لیا جائے مگر تلاوت کی غرض سے قرآن کریم کی کوئی آیت زبانی پڑھنا اس کیفیت میں جائز نہیں ہے جب تک کہ غسل کر کے طہارت حاصل نہ کر لی جائے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ کسی شخص کا وضو نہ ہو، بے وضو شخص کے لئے قرآن کریم کی زبانی تلاوت تو جائز ہے وہ جتنی چاہے تلاوت کر سکتا ہے لیکن قرآن کریم کو ہاتھ لگانا اس کے لئے جائز نہیں ہے، قرآن کریم کو ہاتھ میں لینا ہو اور اسے پکڑ کر یا ہاتھ سے اس کے ورق الٹ کر تلاوت کرنی ہو تو اس کے لئے وضو ضروری ہے اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے بے وضو حالت میں قرآن کریم کو پکڑنا یا ہاتھ لگانا ضروری ہو جائے تو کسی پاک کپڑے کے ساتھ اسے پکڑے مگر ننگے ہاتھوں سے قرآن کریم کو نہ چھوئے۔

دوسرا مسئلہ قرآن کریم میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلاً" قرآن کریم کو ٹھہر ٹھہر کر آرام سے پڑھا جائے، اس کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت اتنی تیزی سے نہ کی جائے کہ اس کے حروف کٹ جائیں یا لفظوں کی ہیئت بدل جائے یا تلفظ خراب ہو مگر ہم عجمی لوگوں کے لئے جن کی زبان عربی نہیں ہے اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم کو صحیح تلفظ کے ساتھ اور صحیح لہجے میں پڑھا جائے، ظاہر بات ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت عربی زبان میں ہی ہوگی، دوسری زبانوں میں اس کی تعلیم تو ہو سکتی ہے اور اس کا ترجمہ اور اس کے احکام و مسائل کی تشریح ہو سکتی ہے لیکن تلاوت کسی اور زبان میں جائز نہیں ہے دنیا کے کسی بھی علاقے یا کسی بھی قوم کا کوئی بھی مسلمان جب قرآن کریم کی تلاوت کرے گا تو اسے عربی زبان میں ہی کرنا ہوگی، تلاوت کا ثواب اور اس کی برکات عربی زبان میں تلاوت کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں جبکہ عجمی لوگ جن کی زبان عربی نہیں ہے وہ عربی زبان کا تلفظ اور لہجہ سیکھے بغیر عربی میں صحیح طریقے سے

تلاوت نہیں کر سکتے، ہر زبان کے اپنے حروف ہوتے ہیں، ان حروف کے الگ الگ مخارج ہوتے ہیں، ہر زبان کا اپنا تلفظ اور لہجہ ہوتا ہے، حروف کی صحیح ادائیگی اور الفاظ کے صحیح تلفظ کے بغیر کسی بھی زبان کے کلام کو پڑھنا ممکن نہیں ہوتا اور اس کے بغیر پڑھنے سے بسا اوقات معنیٰ، مفہوم اور مقصد سب کچھ بگڑ کر رہ جاتا ہے۔

قرآن کریم کا معاملہ تو ان سب سے بالا تر ہے اس لئے کہ وہ اللہ رب العزت کا کلام ہے، بسا اوقات صرف تلفظ اور زیر زبر کے فرق سے معنیٰ کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے اور بے پرواہی کے ساتھ ایسا کرنے سے ثواب ملنے کی بجائے گناہ ذمہ لگ جاتا ہے مثلاً قرآن کریم کی ایک آیت کریمہ ہے ''اِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ'' اس آیت کریمہ میں اللہ کی ہا پر زبر ہے اور علماء کی ہمزہ پر ضمہ ہے جس سے معنیٰ یہ بنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے علم والے بندے ہی صحیح معنوں میں ڈرتے ہیں لیکن اگر اللہ کی ہا پر ضمہ پڑھ دیں اور علماء کی ہمزہ پر فتحہ پڑھا جائے تو معنیٰ بالکل الٹ ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ) اپنے علم والے بندوں سے ڈرتا ہے۔

اسی طرح ہم جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو السلام علیکم کہتے ہیں اور وعلیکم السلام کے ساتھ اس کا جواب دیتے ہیں اس کا صحیح تلفظ السلام علیکم ہے مگر ہمارے ہاں اکثر جلدی جلدی سے جب سلام کہا جاتا ہے تو درمیان میں لام کا حرف کٹ جاتا ہے اور جملہ یوں بن جاتا ہے ''سام علیکم'' سام کا معنیٰ عربی میں موت ہے اور اگر ہم السلام علیکم کہیں تو اس کا معنیٰ ہے تم پر سلامتی ہو اور جواب میں وعلیکم السلام کہا جائے تو اس کا مطلب ہے اور تم پر بھی سلامتی ہو گویا دو مسلمان جب ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو سلامتی کی دعا دیتے ہیں مگر تیزی کے ساتھ سلام کی بجائے سام بول دیں تو اس کا مطلب بنتا ہے کہ تم پر موت آئے جواب میں دوسرا شخص کہتا ہے کہ تم پر بھی موت آئے، مدینہ منورہ کے یہودی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جان بوجھ کر شرارت سے یہ لفظ اس طرح کہا کرتے تھے ''السام

علیکم ''بخاری شریف کی روایت ہے کہ جس دور میں پردے کا حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا جناب نبی اکرم ﷺ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص آیا اور کہا کہ ''السام علیکم'' جناب نبی اکرم ﷺ نے جواب دیا ''علیکم'' ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو سخت غصہ آیا اور اس شخص سے کہا ''علیك السام واللعنة'' تم پر موت آئے اور تم پر لعنت ہو وہ جب چلا گیا تو جناب نبی اکرم ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ تم اس قدر غصے میں کیوں آگئی تھیں؟ حضرت عائشہؓ نے کہا یا رسول اللہ! کیا آپ نے سنا نہیں کہ اس نے کیا لفظ کہا ہے؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم نے میرا جواب نہیں سنا؟ میں نے تو اسے جواب دے دیا تھا۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اگر جواب میں ''وعلیکم'' واؤ کے ساتھ کہا جائے تو معنیٰ بنے گا کہ ''اور تم پر بھی ہو'' لیکن اگر واؤ کے بغیر علیکم کہا جائے تو اس کا مطلب ہے کہ ''تم پر ہو'' (مجھ پر کیوں ہو؟) تو ان مثالوں سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ کسی حرف کے کٹ جانے سے یا اس کا تلفظ صحیح نہ کرنے سے یا زیر زبر کا فرق ہو جانے سے معنیٰ بالکل بدل جاتا ہے اور جملہ کا مفہوم الٹ ہو جاتا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کے لئے عربی حروف، الفاظ، تلفظ اور لہجے کو سیکھا جائے تا کہ ہم قرآن کریم کی تلاوت صحیح طور پر کر سکیں ورنہ معنیٰ کچھ کا کچھ ہو جائے گا جس سے نماز میں بھی فرق پڑتا ہے اور تلاوت بھی صحیح طریقہ سے نہیں ہوتی تو دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرآن کریم کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا ہر مسلمان مرد اور عورت کے لئے ضروری ہے اور اسے باقاعدہ طور پر سیکھنے کی ضرورت ہے۔

تیسرا مسئلہ قرآن کریم کے حوالہ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں جب ابھی شراب حرام نہیں ہوئی تھی اور اکثر لوگ شراب پیتے تھے، شراب زیادہ پینے سے نشہ ہو جاتا ہے، نشے کی حالت میں انسان کو اپنی گفتگو اور الفاظ پر کنٹرول نہیں رہتا اور اسے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ اور کیا کر رہا ہے؟ ہمارے ہاں ایک لطیفہ عام طور

پر مشہور ہے کہ ایک شرابی آدھی رات کو نشے کی حالت میں لڑکھڑاتا ہوا اپنے گھر کے دروازے تک پہنچا تو اس سے دروازے کا تالا نہیں کھل رہا تھا، اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ تالا کھولنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا، گلی سے گزرنے والے ایک شخص نے دیکھا تو اس کی مدد کرنے کے خیال سے کہا کہ چابی مجھے دو میں تالا کھول دیتا ہوں اس نے جواب میں کہا کہ تالا تو میں خود ہی کھول لوں گا تم ذرا اس دیوار کو پکڑ کر رکھو کیونکہ یہ ہل رہی ہے اور اس کی وجہ سے تالا نہیں کھل رہا۔ مطلب یہ ہے کہ نشے کی حالت میں آدمی کو اپنی گفتگو پر اور اپنی چال ڈھال پر کنٹرول نہیں رہتا۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک بزرگ صحابی (حضرت علیؓ) نشے کی حالت میں نماز پڑھا رہے تھے، سورۃ الکافرون کی تلاوت نماز میں کی تو لا أعبد کی بجائے أعبد پڑھ گئے جس سے آیت کریمہ کا مفہوم ہی الٹ ہو گیا اس پر قرآن کریم میں حکم اترا کہ اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو تم نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک اس ذہنی کیفیت میں واپس نہ آجاؤ کہ جو کچھ تم پڑھ رہے ہو اس کا تمہیں خود بھی علم ہو، یہاں قرآن کریم کا جملہ یوں ہے کہ ''حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ'' حتیٰ کہ تمہیں علم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اس حوالہ سے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نماز میں جو کچھ ہم پڑھتے ہیں اس کا ہمیں علم ہونا چاہیے کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں؟

نماز اللہ تعالیٰ کے ساتھ مناجات کا نام ہے جس کا طریق کار متعین ہے اور اس کے آداب و شرائط طے شدہ ہیں ہم وضو کر کے پاک جسم اور پاک کپڑوں کے ساتھ پاک جگہ قبلہ رخ ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں کھڑے ہوتے ہیں اور تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کہہ کر ساری دنیا کیساتھ تعلقات کو منقطع کر کے تھوڑی دیر کے لئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہو جاتے ہیں، کھڑے، بیٹھے، سجدے میں پڑے، ہاتھ باندھ کر ہاتھ چھوڑ کر اور مختلف کیفیات میں اپنے مالک اور رب سے باتیں کرتے چلے جاتے ہیں لیکن سوچنے کی بات ہے کہ کیا

ہمیں علم ہوتا ہے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں؟

عجیب سا معاملہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ہم سے باتیں کرتے ہیں اور ہم اپنی زبان سے ان باتوں کو دہراتے ہیں جبکہ نماز میں ہم خدا سے باتیں کرتے ہیں لیکن نہ اس کی باتیں سمجھتے ہیں اور نہ ہی اپنی باتیں ہماری سمجھ کے دائرے میں ہوتی ہیں، ہمیں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کیا فرما رہے ہیں اور نہ ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے کیا کہہ رہے ہیں؟

یہ کیفیت قرآن کریم کے اس ارشاد سے مطابقت نہیں رکھتی کہ ''حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ'' نماز اس حالت میں پڑھو کہ جو تم زبان سے کہہ رہے ہو اس کا تمہیں علم بھی ہو کیونکہ قول زبان سے لفظ ادا کرنے کو کہتے ہیں جبکہ علم کا تعلق مفہوم اور معنیٰ سے ہوتا ہے۔

یہ باتیں میں نے آج کی تمہیدی گفتگو میں اس لئے عرض کی ہیں کہ قرآن کریم کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اور کم از کم نماز میں کی جانے والی تلاوت اور پڑھے جانے والے دیگر جملوں، دعاؤں اور اذکار کا ہمیں علم ہونا چاہیے اور ان کا مفہوم ہمارے ذہن میں موجود ہونا چاہیے، یہ ہر مسلمان مرد اور عورت کے لئے ضروری ہے اور باقاعدہ سیکھنے کے بغیر یہ دونوں چیزیں حاصل نہیں ہو سکتیں۔ میں درس کے شرکاء کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ یہ چیزیں سیکھنے کے لئے خود بھی وقت نکالیں اور اپنے دیگر دوستوں کو بھی تیار کریں اور اس کے لئے روزانہ دس پندرہ منٹ کا وقت فارغ کریں۔

الشریعہ اکادمی کے اساتذہ اس خدمت کے لئے حاضر ہیں آپ رابطہ کر کے جو وقت آپ کے پاس آپ کی سہولت کے مطابق فارغ ہو سکتا ہو ہم اس وقت میں آپ کی یہ خدمت کرنے کے لئے تیار ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

رمضان المبارک اور قرآن مجید

''30 جولائی 2010ء کو ایشیا اسلامک سنٹر ہیوسٹن (امریکہ) میں خطاب''

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے، یہ قرآن کریم کا مہینہ ہے اسی مبارک مہینہ میں قرآن کریم کا نزول ہوا اور اسی میں زیادہ پڑھا اور سنا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ سال کے بعد اس ماہ میں قرآن کریم کے ساتھ ہمارے جوڑ کو تازہ کر دیتے ہیں کچھ بیٹریاں چارج ہو جاتی ہیں اور قرآن کریم کے ساتھ امت مسلمہ کے ربط میں تازگی آجاتی ہے اسی حوالہ سے ایک اہم پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

قرآن کریم ہم پڑھتے بھی ہیں سنتے بھی ہیں اور کچھ نہ کچھ یاد بھی کرتے ہیں سوال یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کو کس غرض اور مقصد کے لئے پڑھتے ہیں اور اسے اصل میں کس مقصد کے لئے پڑھنا چاہیے؟ اس کا اپنا مقصد اور ایجنڈا کیا ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ کے اس پاک کلام کو پڑھنے اور سننے کی ضرورت ہے۔

قرآن کریم پڑھنے کے چند مقاصد میں سے پہلا مقصد:

عام طور پر قرآن کریم کو چند مقاصد کے لئے پڑھتے ہیں جن کا تذکرہ اس وقت

مناسب سمجھتا ہوں، مثلاً قرآن کریم پڑھنے سے ہمارا ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ نماز ہم پر فرض ہے اور نماز میں قرآن کریم پڑھنا ضروری ہے اس لئے ہم تھوڑا بہت قرآن کریم یاد کرتے ہیں تا کہ نمازوں میں پڑھ سکیں اور ہماری نمازیں صحیح طور پر ادا ہو جائیں، ہر مسلمان چند سورتیں یاد کرنے کی ضرور کوشش کرتا ہے تا کہ وہ انہیں نمازوں میں پڑھ سکے۔

اس مسئلہ میں ایک پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ پانچ وقت کی نمازیں فرائض و واجبات مؤکدہ سنتیں جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت کے مطابق ادا ہو جائیں اس کے لئے کم ازکم کتنا قرآن کریم یاد کرنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے؟ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ چند سورتیں یاد کر لی جاتی ہیں اور انہی کو بار بار ہر نماز اور ہر رکعت میں دہرایا جاتا ہے اس سے نماز ہو تو جاتی ہے لیکن سنت کے مطابق نہیں ہوتی، جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ یہ ہے کہ مختلف نمازوں اور رکعتوں میں مختلف سورتیں پڑھی جائیں اور ایک ہی سورت کو بار بار نہ دہرایا جائے اس کو سامنے رکھتے ہوئے میرا اندازہ ہے کہ ہر مسلمان مرد اور عورت کو قرآن کریم کا کم ازکم نصف آخری پارہ ضرور یاد کرنا چاہیے اس کے بغیر پانچ نمازیں سنت نبوی کے مطابق ادا کرنا میرے خیال میں مشکل ہے، بہر حال ہمارا قرآن کریم پڑھنے سے ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ کچھ سورتیں یاد کر لیں تا کہ انہیں نمازوں میں پڑھ سکیں اور ہماری نمازیں صحیح طور پر ادا ہو جائیں۔

قرآن کریم پڑھنے کا دوسرا مقصد:

قرآن کریم پڑھنے اور سننے سے ہمارا دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ثواب حاصل کریں اور ہمیں زیادہ سے زیادہ اجر ملے، اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم پڑھنے اور سننے سے اجر ملتا ہے، ثواب حاصل ہوتا ہے اور ہمارے کھاتے میں نیکیاں لکھی جاتی ہیں پڑھنے پر بھی ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور سننے پر بھی ہر حرف پر دس نیکیاں حاصل ہوتی ہیں، دس کا یہ عدد متعین نہیں ہے بلکہ یہ کم ازکم کی حد ہے اس لئے کہ قرآن کریم کی سورۃ الانعام آیت

نمبر 160 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے کہ ......

"مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا"

جس نے نیکی کا کوئی کام کیا اس کے لئے دس گناہ اجر ہے اور جس نے گناہ کا ارتکاب کیا اسے اس کے برابر بدلہ ملے گا۔

نیکی کے ہر کام پر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اس کا اجر وثواب دس گنا سے شروع ہوتا ہے یہ کم از کم کی حد ہے، ثواب میں زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے، وہ کام کرنیوالے کے خلوص وتوجہ اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی پر موقوف ہے یہ سینکڑوں میں بھی ہوسکتا ہے، ہزاروں میں بھی ہوسکتا ہے اور لاکھوں کروڑوں اور اربوں میں بھی ہوسکتا ہے، کسی سطح پر بھی کوئی اشکال نہیں ہے، اس لئے کہ اشکال وہاں ہوتا ہے جہاں دینے والے کو کوئی بجٹ پرابلم ہو کہ اس مد میں اتنی رقم موجود ہے یا نہیں، اللہ تعالیٰ کی کوئی بجٹ پرابلم نہیں ہے اس لئے اس نے کسی نیکی میں زیادہ سے زیادہ اجر وثواب کی کوئی حد مقرر نہیں کی، میں عرض کیا کرتا ہوں کہ یہ آپ کے کنکشن کی پاور پر منحصر ہے کہ وہ کتنے وولٹیج کھینچ سکتا ہے ادھر سے کوئی کمی نہیں ہے، یہاں ایک بات اور بھی قابل توجہ ہے کہ نیکی اور ثواب کسے کہتے ہیں، اور یہ جو دس، بیس، سو، ہزار نیکیاں ملنے کی بات کی جاتی ہے ان میں عملاً ملتا کیا ہے۔

نیکیاں آخرت کی کرنسی:

ایک صاحب نے یہی سوال کیا تو میں نے عرض کیا کہ یہ آخرت کی کرنسی ہے، اس لئے کہ جس طرح دنیا میں ہمارے معاملات اور لین دین ڈالر، یورو، پونڈ، ریال، درہم اور روپے کے ذریعہ طے پاتے ہیں اور ہم ان کرنسیوں کے تبادلے سے اپنے معاملات نمٹاتے ہیں، اسی طرح آخرت میں ہمارے معاملات، نیکیوں اور گناہوں کے تبادلے سے طے پائیں گے، وہاں ڈالر، ریال اور روپیہ نہیں چلے گا اور کسی بھی شخص کے ساتھ لین دین

نمٹانے کے لئے یا نیکیاں دینا پڑیں گی اور یا اس کے گناہ اپنے سر لینے پڑیں گے اس لئے نیکی اور گناہ دونوں آخرت کی کرنسیاں ہیں ایک پازیٹو ہے اور دوسری نیگیٹو ہے اور انہی کے ذریعہ ہمارے آخرت کے معاملات نمٹائے جائیں گے۔ ہم دنیا کے کسی ملک میں جاتے ہیں تو جانے سے پہلے وہاں کی کرنسی کا انتظام کرتے ہیں تا کہ وہاں صحیح طور پر وقت گزار سکیں اسی طرح آخرت کے دور میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں وہاں کی زیادہ سے زیادہ کرنسی کا بندوبست کر لینا چاہیے تا کہ وہاں کی زندگی بہتر ہو سکے چنانچہ ہم قرآن کریم بھی اس نیت سے پڑھتے ہیں کہ ثواب حاصل ہوگا۔

قرآن کریم پڑھنے کا تیسرا مقصد:

تیسرے نمبر پر ہم قرآن کریم کی تلاوت برکت کے لئے کرتے ہیں نیا مکان بنائیں کاروبار شروع کریں یا دفتر کھولیں تو برکت کے لئے قرآن کریم کی تلاوت کا اہتمام کرتے ہیں، ویسے بھی باذوق حضرات اپنے گھروں دکانوں، دفاتر، کھیتوں اور کاروباری مراکز میں قرآن کریم کی تلاوت اور ذکر و اذکار کا معمول رکھتے ہیں اور قرآن کریم سے ہمیں یہ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے۔

یہ بات ہمارے ایمان کا حصہ ہے کہ جہاں قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے وہاں رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے گھروں میں برکت و رحمت کا ماحول نہیں رہا کیونکہ قرآن کریم کی تلاوت نہیں ہوتی، نماز کا ماحول نہیں ہے، ذکر و اذکار کا معمول نہیں ہے اور درود شریف پڑھنے کا ذوق نہیں ہے ہمیں اکثر شکایت رہتی ہے کہ گھروں میں برکت نہیں رہی، باہمی اعتماد کی فضا نہیں رہی، کاروبار میں رکاوٹ رہتی ہے، رشتوں میں جوڑ نہیں ہے اور بے سکونی کی فضا ہے، یہ ماحول جب بڑھتا ہے تو ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ کسی نے کچھ کر دیا ہے اور ہم علماء کرام کے پاس اور عاملوں کے پاس جاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ہمارے گھر میں کسی نے کچھ کر دیا ہے آپ بھی کچھ کریں، وہ غریب کچھ نہ

کچھ کرتے بھی ہیں، مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ کرنے والے کرتے ہیں، ان کے اثرات بھی ہوتے ہیں اور علاج کرنے والوں کا علاج بھی موثر ہوتا ہے لیکن کیا ہمارے گھروں میں سب کچھ یہی ہو رہا ہے؟ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے، ہماری گھروں میں برکت نہ رہنے اور نحوست و بے برکتی کے پھیلنے کا اصل سبب کچھ اور ہے جس پر ہمیں ضرور غور کرنا چاہیے اور میں پڑھے لکھے دوستوں کو اس پہلو پر غور کرنے کی دعوت دینا چاہتا ہوں۔

اس سلسلہ میں اس بات پر غور کر لیجئے ایک یہ کہ رحمتیں اور برکتیں لے کر فرشتے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے یہ کام عالم اسباب کے درجے میں انہی کے سپرد کر رکھا ہے مگر ہمارے گھروں کا ماحول فرشتوں کی آمد و رفت کے لئے سازگار نہیں ہے، فرشتے وہاں آتے ہیں جہاں قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے، جہاں نماز پڑھی جاتی ہے، ذکر و اذکار کا ماحول ہوتا ہے، درود شریف پڑھا جاتا ہے اور خیر کے اعمال ہوتے ہیں۔ جناب نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ......

"البیت الذی لیس فیہ القرآن کالبیت الخرب"

وہ گھر جس میں قرآن کریم کی تلاوت نہیں ہوتی وہ ویران گھر کی طرح ہے۔

دوسری حدیث میں جناب نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ......

"صَلُّوا فِیْ بُیُوْتِکُمْ وَلَا تَجْعَلُوْهَا قُبُوْراً"

گھروں میں بھی نماز پڑھا کرو اور انہیں قبرستان نہ بناؤ۔

گویا گھروں کی آبادی نماز اور تلاوت قرآن کریم سے ہے اور جن گھروں میں نماز اور تلاوت کا معمول نہیں ہے وہ آباد گھر نہیں ویران اور اجڑے ہوئے گھر ہیں اور قبرستان ہیں ،ظاہر ہے کہ ہمارے گھروں میں عام طور پر اس کا معمول نہیں رہا اس لئے فرشتوں کا آنا جانا بھی نہیں رہا اس کے برعکس ہمارے گھروں میں جو کچھ ہوتا ہے اس پر بھی ایک غیبی مخلوق

کی آمد و رفت رہتی ہے، جو فرشتے بہر حال نہیں ہیں، وہ مخلوق جن و شیاطین کی ہے، وہ آتے ہیں تو اپنے اثرات لے کر آتے ہیں اور اپنی نحوستیں چھوڑ کر جاتے ہیں، شیاطین کی نحوستیں کس قسم کی ہوتی ہیں اس پر جناب نبی اکرم ﷺ کا ایک ارشاد گرامی سن لیجئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شیاطین کا ایک پورا نظام ہے جو دنیا میں کام کر رہا ہے اور دنیا کے مختلف اطراف میں شیاطین کی ایک بڑی تعداد ہر وقت کام کرتی ہے اور اپنے بڑے شیطان کو اس کی رپورٹ بھی پیش کرتی ہے جو پانی پر تخت بچھائے ہوئے ہے اور اپنے شیطانی نیٹ ورک کے کام کی نگرانی کرتا رہتا ہے، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ شیطان اپنے جس کارندے کو سب سے بڑی شاباش دیتا ہے اور اس کی پیٹھ تھپتھپا کر اسے سینے سے لگاتا ہے اسے اس بات پر شاباش ملتی ہے کہ وہ کسی گھر میں جھگڑے کا ایسا ماحول پیدا کر دے کہ میاں بیوی میں طلاق ہو جائے، کسی گھر میں طلاق کا ہو جانا شیطان کے نزدیک اس کے کسی کارندے کا سب سے اچھا عمل ہوتا ہے جس پر وہ بہت خوش ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہمارے گھروں میں شیطانوں کی آمد و رفت ہوگی تو اسی طرح کی بے برکتی اور نحوست ہوگی اور اسی بے اتفاقی اور بے اعتمادی کا دور دورہ ہوگا۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ ہم اپنے گھروں میں شیاطین کی آمد و رفت کو روکیں اور فرشتوں کی آمد و رفت کا ماحول بنائیں جو قرآن کریم کی تلاوت اور نماز و ذکر کی کثرت سے بنے گا۔ ایک مثال سے بات سمجھ لیجئے کہ میرا گھر اگر صاف ستھرا ہے، غسل خانے اور نالیوں میں صفائی ہے، گھر کے صحن میں کیاری موجود ہے جس میں پھول کھلے ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ اس ماحول میں بلبل آئے گی، تتلیاں آئیں گی، جگنو آئیں گے لیکن اگر میرے گھر میں صفائی نہیں ہے، غسل خانہ اور نالیاں گندی ہیں اور کوڑا کرکٹ ہر طرف بکھرا ہوا ہے تو مکھیاں بھنبھنائیں گی، مینڈک ٹرٹرائیں گے، مچھروں اور کاکروچوں کا ہر طرف بسیرا ہوگا اس پر میں یہ کہنا شروع کر دوں کہ کسی نے کچھ کر دیا ہے اور سارے محلے کے کاکروچ اکٹھے کر کے میرے گھر میں بھیج دیے ہیں تو کس

قدر عجیب بات ہوگی۔

میرے گھر میں بلبل اور جگنو کا ماحول ہوگا تو وہ آئیں گے اور مچھروں اور مکھیوں والی فضا ہوگی تو وہ ڈیرہ ڈالیں گے اس کے لئے کسی کو ملامت کرنے کی بجائے مجھے اپنے گھر کے ماحول کی صفائی کرنا ہوگی اور اسے بہتر بنانا ہوگا، اسی طرح میرے گھر میں اگر فرشتوں کی آمد و رفت ہوگی تو وہ آئیں گے اور رحمت و برکت لائیں گے اور اگر ہر وقت شیاطین ڈیرہ ڈالے رہیں گے تو ان سے بے برکتی، نحوست اور نا اتفاقی ہی ملے گی اور وہی کچھ ہوگا جس کی ہمیں اپنے گھروں میں اس وقت شکایت رہتی ہے تو میں نے عرض کیا ہے کہ تیسرا مقصد جس کے لئے ہم قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں برکت کا حصول ہے اور وہ اس عمل پر بلاشبہ حاصل ہوتی ہے۔

قرآن کریم پڑھنے کا چوتھا مقصد:

چوتھا مقصد جس کے لئے ہم عام طور پر قرآن کریم پڑھتے ہیں شفا کا حصول ہے اور وہ بھی قرآن کریم کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، قرآن کریم ہماری جسمانی بیماریوں کی شفا بھی ہے اور روحانی و اخلاقی بیماریوں کا بھی علاج ہے، خود قرآن کریم نے اپنے آپ کو شفا کہا ہے اور فرمایا ہے کہ ......

''قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ''

''تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آئی ہے اور وہ سینوں کی بیماریوں کے لئے شفا ہے، یہ شفا اصلاً تو روحانی بیماریوں کی ہے لیکن اس کے ساتھ جسمانی بیماریوں کے لئے بھی شفاء ہے''

ابو سعید خدریؓ کا واقعہ:

بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت ابو سعید خدریؓ اپنا واقعہ بیان کرتے

ہیں کہ ایک مرتبہ وہ چند ساتھیوں کے ہمراہ سفر پر تھے کہ ایک بستی کے نزدیک رات کا وقت ہوگیا اور انہوں نے بستی والوں سے کہا کہ وہ مسافر ہیں انہیں کھانا کھلا دیا جائے، بستی والوں نے اس سے انکار کر دیا تو وہ بستی کے قریب ایک جگہ ڈیرہ لگا کر سو گئے، اتفاق کی بات ہے کہ بستی کے سردار کو کسی زہریلی چیز نے ڈس لیا، زہر کا اثر دماغ تک پہنچا تو وہ بے قابو ہونے لگا بستی والوں نے اپنے تئیں علاج وغیرہ کیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا، انہیں خیال آیا کہ جو لوگ بستی سے باہر ٹھہرے ہوئے ہیں ہوسکتا ہے کہ ان کے پاس اس کا کوئی علاج موجود ہو، وہ نصف شب کے وقت ان کے پاس آئے اور کہا ہمارے سردار کو کسی زہریلی چیز نے ڈس لیا ہے اور ہمارے پاس کوئی علاج نہیں ہے، تمہارے پاس کوئی علاج ہو تو ہمارے ساتھ آؤ اور ہم پر مہربانی کرو، ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ہمارے ذہن میں یہ بات تھی کہ انہوں نے ہمیں کھانا نہیں کھلایا اس لئے ہم نے کہا کہ علاج ہمارے پاس ہے مگر ہم معاوضہ کے بغیر علاج نہیں کریں گے اور معاوضہ تیس بکریاں ہوگا، وہ آمادہ ہو گئے، ہم نے جا کر اسے دم کیا اور وہ ٹھیک ہوگیا، ہم بکریاں لے کر واپس آئے تو خیال ہوا کہ یہ بکریاں جو ہم نے دم کے عوض لی ہیں شاید ہمارے لئے جائز نہ ہوں اس لئے جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کریں گے، اس کے بعد ان بکریوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے، چنانچہ جب نبی اکرم ﷺ کو سارا واقعہ سنایا گیا تو آپ نے دل لگی کے طور پر فرمایا کہ ان بکریوں میں میرا حصہ بھی نکالو یہ اشارہ تھا کہ بکریاں لے کر تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا، نبی اکرم ﷺ نے اس موقع پر پوچھا کہ دم کس نے کیا تھا اور کیا پڑھا تھا؟ ابوسعید خدریؓ نے کہا کہ میں نے دم کیا تھا اور سورۃ فاتحہ پڑھی تھی، ایک اور روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے پوچھا کہ تمہیں کس نے بتایا تھا کہ اس میں شفا ہے تو ابوسعید خدریؓ نے عرض کیا کہ ایک بار آپ کی زبان سے سنا تھا کہ اس سورۃ کا نام "الشفائ" بھی ہے اسی یقین پر میں نے دم کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے شفا دے دی۔

اسی طرح ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا معمول تھا کہ رات کو سونے سے پہلے آخری تین سورتیں جو معوذات کہلاتی ہیں یعنی ،قل ھو اللہ احد،قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس، پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونکتے تھے اور پھر ان ہاتھوں کو پورے جسم پر پھیرتے تھے، آخری ایام میں جب کمزوری بڑھ گئی تو میں یہ سورتیں پڑھ کر نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں پر پھونکتی تھی اوران کا ہاتھ پکڑ کر ان کے جسم پر پھیرتی تھی ،معوذات کا یہ پڑھنا برکت کے لئے تھا اور شفا کے لیۓ تھا اور قرآن کریم کی تلاوت سے یہ دونوں فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

قرآن کریم پڑھنے کا پانچواں مقصد:

قرآن کریم کی تلاوت سے ہمارے ذہنوں میں پانچواں مقصد عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ وفات پانے والے کسی بزرگ، دوست، ساتھی اور رشتہ دار کو ایصال ثواب کے لئے ہم قرآن کریم پڑھتے ہیں اور اس کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں ،قرآن کریم سے یہ مقصد اور فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے، ایصال ثواب بھی ہوتا ہے اور قرآن کریم کی برکت سے اللہ تعالیٰ مغفرت اور بخشش بھی فرماتے ہیں۔

قرآن کریم پڑھنے کا چھٹا مقصد:

جبکہ قرآن کریم کی تلاوت سے ہمارا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ ہمارے قراء کرام ،عام جلسوں میں اچھے سے اچھے لہجے میں قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں جس سے لوگوں کو قرآن کریم پڑھنے کی طرف رغبت ہوتی ہے، قرآن کریم کے اعجاز کا اظہار ہوتا ہے، اور غیر مسلموں کے سامنے قرآن کریم کی اچھے لہجے میں تلاوت ان کی قرآن کریم کی طرف کشش کا ذریعہ بنتی ہے۔

یہ چھ مقاصد جن کا میں نے ذکر کیا ہے دراصل وہ فوائد ہیں جو ہمیں قرآن کریم سے

حاصل ہوتے ہیں اور ہم قرآن کریم کی تلاوت یا سماع سے یہ فائدہ حاصل کرتے ہیں، کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم کی تلاوت سے یہ سارے فائدے ملتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو ان فوائد کا منبع بنایا ہے۔

کیا قرآن کریم پڑھنے کے یہی مقاصد ہیں؟

مگر سوال یہ ہے کہ جس کی طرف میں خود کو اور آپ سب حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کا اپنا ایجنڈا اور مقصد کیا ہے اور وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟

دنیا کی کوئی کتاب ہم پڑھتے ہیں تو اس کا موضوع اور مقصد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کس موضوع پر اور کس مقصد کے لئے لکھی گئی ہے لیکن قرآن کریم کو پڑھتے ہوئے ہمارا ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ اس کا اپنا موضوع اور مقصد کیا ہے اور یہ کس سبجیکٹ کی کتاب ہے؟ تاریخ کی ہے، سائنس کی ہے، سیاست کی ہے، قانون کی ہے، طب کی ہے، ادب کی ہے یا کون سے فن کی ہے، ہم اس کتاب اللہ کو اپنے اپنے ذوق کے موضوعات کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش تو کرتے رہتے ہیں کہ سائنس سے دل چسپی والا مفسر اس کی تفسیر میں پوری سائنس بیان کر دے گا، جغرافیہ کے ذوق کا عالم اس میں جغرافیے کو سمونے کی کوشش کرے گا، منطق وفلسفہ کا عالم اسے منطق وفلسفہ کا نمائندہ بنانے میں ساری قوت صرف کرے گا اور طب کی دنیا کا شاور اسے علاج ومعالج کی کتاب بنانے میں صلاحیتوں کو استعمال کرے گا مگر اللہ تعالیٰ کے اس آخری کلام کا اپنا موضوع کیا ہے اس کی طرف کم لوگوں کی توجہ ہوتی ہے۔

قرآن کریم نے اپنا موضوع صرف ایک لفظ میں بیان کیا ہے اور وہی اس کا اصل مقصد ہے جو تلاوت کا آغاز کرتے ہی سامنے آجاتا ہے، سورۃ البقرہ کا آغاز اسی سے ہوتا ہے کہ

"ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ"

یہ کتاب شک و شبہ سے بالا تر ہے اور متقین کے لئے "ہدایت" ہے، یعنی اس کا اصل موضوع ہدایت ہے، یہ نسل انسانی کی راہ نمائی کے لئے آئی ہے کہ اسے دنیا میں کس طرح رہنا ہے اور انسانوں کو اس دنیا میں کس طرح زندگی بسر کرنی ہے، قرآن کریم کا اصل موضوع "ھُدیً" ہے، یہ ھدی للناس بھی ہے اور ھُدًی للمتقین بھی ہے اپنے خطاب کے حوالہ سے یہ ھدی للناس ہے مگر نفع کے اعتبار سے ھُدًی للمتقین ہے اس کو اس مثال سے سمجھ لیا جائے کہ کسی گاؤں میں بجلی نہیں تھی، گاؤں والوں کی کوشش سے بجلی منظور ہو گئی اور گاؤں سے باہر اس مقصد کے لئے ٹرانسفارمر لگا دیا گیا، اب یہ ٹرانسفارمر سارے گاؤں کے لئے ہے لیکن بلب اس کا روشن ہو گا جس کا کنکشن ہو گا، دو میل دور اگر کسی گھر کا کنکشن ہے تو اس کی ٹیوب بھی چلے گی اور اے سی بھی چلے گا اور ساتھ والے مکان کا کنکشن نہیں ہے تو اس کا زیرو کا بلب بھی روشن نہیں ہو گا، اسی طرح قرآن کریم بھی اپنے خطاب کے حوالہ سے ھدی للناس ہے لیکن فائدہ اسی کو ہو گا جس کا ایمان کا کنکشن ہو گا، یہ "ہُدیٰ" کیا ہے؟ اس پر بھی غور کر لیجئے۔

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو زمین پر اتارا تھا تو دو باتیں اسی وقت فرما دی تھیں ایک یہ کہ ......

"وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ"

تمہیں زمین میں رہنے کو جگہ اور زندگی کے اسباب ملیں گے لیکن یہ ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ ایک مقررہ مدت کے لئے ہوں گے، یہ مقررہ مدت ایک فرد کے لئے چالیس پچاس ساٹھ سال کی وہ زندگی ہے جو وہ اس دنیا میں بسر کرتا ہے اور نسل انسانی کے لئے وہ چند ہزار سال کا وقت ہے جو اس کے لئے اس دنیا میں مقرر ہے۔ جبکہ دوسری بات اللہ رب العزت نے یہ واضح طور پر فرما دی تھی کہ ......

''اِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ''

جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایات آئیں گی تو جس نے میری ہدایات کے مطابق دنیا کی زندگی بسر کی وہ خوف وحزن سے نجات پائے گا یعنی جنت میں واپس آئے گا اور جس نے میری ہدایات کو جھٹلا دیا اسے دوزخ میں جانا ہوگا۔

گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دنیا کی محدود زندگی تم اپنی مرضی کے مطابق گزارنے میں آزاد نہیں ہو بلکہ میری ہدایات کے پابند ہو جو میری طرف سے تمہارے پاس آتی رہیں گی، قرآن کریم اپنا تعارف کراتے ہوئے کہتا ہے کہ میں وہ ''ھدًی'' ہوں جس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے تم سب پابند ہو یعنی قرآن کریم نسل انسانی کے تمام طبقات اور تمام افراد کو یہ بتانے آیا ہے کہ تم نے اس دنیا میں کیسے رہنا ہے اور کیا کرنا ہے۔

یہ سیاستدانوں کی بھی راہنمائی کرتا ہے، حکمرانوں کی بھی، سائنس دانوں کی بھی، ڈاکٹروں کی بھی، انجینئروں کی بھی، جغرافیہ دانوں کی بھی اور فلسفیوں کی بھی راہنمائی کرتا ہے۔

اس لئے قرآن کریم کا اصل موضوع اور مقصد یہ ہے کہ ہم اسے ہدایت اور راہنمائی کے لئے پڑھیں اور اس کی ہدایات کی روشنی میں اپنی زندگی کے معاملات طے کریں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے ہمارا معاملہ قرآن کریم کے ساتھ کچھ اس طرح کا ہے کہ جیسے کسی کے ہاں کوئی بہت ہی معزز مہمان آجائے وہ اسے پورا پروٹوکول دے، اس کی خدمت کرے اور اس کی آمد سے جتنے فوائد حاصل ہو سکتے ہوں وہ بھی حاصل کرے لیکن اس سے اس کی آمد کا مقصد نہ پوچھے کہ آپ کس مقصد کے لئے تشریف لائے ہیں یہ طرز عمل خود غرضی کہلاتا ہے اور ہمارا قرآن کریم کے ساتھ خدانخواستہ یہی خود غرضی والا معاملہ چل رہا ہے، ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں، اس سے محبت وعقیدت بھی ہمارے دلوں میں ہے، اس کا ادب واحترام بھی کرتے ہیں اور اس سے سارے فائدے بھی حاصل کرتے ہیں مگر اس

سے نہیں دریافت کرتے کہ اس کی آمد کا مقصد کیا ہے اور وہ ہم سے کیا چاہتا ہے۔

قرآن کریم کے ساتھ ہماری عقیدت اور اس کا ادب و احترام آج بھی ہمارا قیمتی اثاثہ ہے اور میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ہم آج کے مسلمانوں نے اپنا بہت کچھ گنوا دیا ہے مگر قرآن کریم اور جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کے ساتھ ہمارا تعلق اور محبت و عقیدت بحمد اللہ تعالیٰ آج بھی قائم ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں کوئی بھی مسلمان نہ قرآن کریم کی بے حرمتی برداشت کرتا ہے اور نہ ہی جناب نبی اکرم ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی اس کے لئے قابل برداشت ہوتی ہے، اسے غصہ آتا ہے اور وہ غیرت و جذبات کا بے ساختہ اظہار کرتا ہے جو آج کی دنیا کے لئے تعجب و حیرت کا باعث ہے اور کہا جاتا ہے کہ مسلمان بڑی جذباتی قوم ہے اور غصہ والی قوم ہے مگر قرآن کریم اور جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کے ساتھ یہ جذباتی محبت ہی ہمارا اصل اثاثہ ہے اور ہمارا سرمایہ حیات ہے، البتہ ہمیں صرف اس پر قناعت کرنے کی بجائے قرآن کریم اور سنت نبوی ﷺ کو اپنی زندگی کا راہ نما بنانا چاہیے کہ قران و سنت کا اصل مقصد یہی ہے اور اسی راستے پر چل کر ہم دنیا و آخرت میں نجات اور سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین ثم آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

قرآن کریم کی تلاوت، ہماری ضرورت

"22 اپریل 2011ء کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں حفظ قرآن کریم کی کلاس کے آغاز کی تقریب سے خطاب"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

بحمداللہ تعالیٰ آج ہم الشریعہ اکادمی میں حفظ قرآن کریم کی کلاس کا باقاعدہ آغاز کر رہے ہیں، ناظرہ اور قاعدہ کی کلاس تو اکادمی کے آغاز سے جاری ہے اور روزانہ صبح محلہ کے بچے یہاں آ کر قاعدہ اور ناظرہ قرآن کریم کے ساتھ ضروری دینی امور کی تعلیم حاصل کرتے ہیں مگر حفظ قرآن کریم کی باقاعدہ کلاس آج شروع ہو رہی ہے جس میں بچوں کو حفظ قرآن کریم اور ضروریات دین کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ ریاضی اور انگلش کی ضروری تعلیم بھی دی جائے گی، انشاء اللہ تعالیٰ، تاکہ وہ حفظ قرآن کریم کی تکمیل کے بعد حسب استعداد مڈل یا میٹرک کا امتحان دے سکیں۔

ابھی میری گفتگو کے بعد ہمارے فاضل دوست مولانا قاری سعید احمد صاحب جو ہمارے عزیز شاگرد ہیں اور جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے شعبہ تجوید کے صدر مدرس ہیں حفظ کی کلاس کو پہلا سبق پڑھا کر اس کار خیر کا آغاز کریں گے، میں اس موقع پر اس پیش

رفت پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے قرآن کریم کی تعلیم بالخصوص حفظ کی اہمیت وضرورت کے حوالہ سے کچھ ضروری گزارشات پیش کرنا چاہوں گا۔

قرآن کی تلاوت اور حفظ ہماری ضروریات میں سے ہے، جناب نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس گھر میں قرآن کریم کا کچھ حصہ بھی نہیں ہے وہ ویران اور اجڑا ہوا گھر ہے جبکہ ایک روایت کے مطابق ارشاد نبوی ﷺ یہ ہے کہ جس دل میں قرآن کریم کا کچھ حصہ بھی نہیں ہے وہ اجڑے ہوئے گھر کی طرح ہے۔

گھر میں قرآن کریم کا کچھ حصہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ گھر میں قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہو اور گھر کے افراد کا قرآن کریم کی تلاوت کا کچھ نہ کچھ معمول ہو جبکہ دل میں قرآن کریم کا کچھ حصہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان مرد یا عورت کو قرآن کریم کا کچھ نہ کچھ حصہ یاد ہو اور وہ وقتاً فوقتاً اس کی تلاوت کرتا رہے۔

گھر میں قرآن کریم کی تلاوت ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فرشتے نازل ہوں گے، سکون وطمانیت کا ماحول ہوگا اور روحانی آبادی میسر آئے گی، جس کا ہمارے گھروں میں فقدان ہوتا جا رہا ہے اور جس کے کم ہونے سے گھروں میں بے برکتی، جھگڑے اور تنازعات مسلسل بڑھ رہے ہیں، ہمیں عام طور پر یہ شکایت تو ہوتی ہے کہ گھروں میں نحوست بڑھ رہی ہے، بے برکتی میں اضافہ ہو رہا ہے اور بے اعتمادی اور بے سکونی جڑ پکڑتی جا رہی ہے لیکن ہم نے اس کے اسباب پر کبھی غور نہیں کیا جبکہ جناب نبی اکرم ﷺ نے اس کی نشاندہی فرمائی ہے۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس گھر میں قرآن کریم کی تلاوت نہیں ہوتی وہ آباد نہیں بلکہ اجڑا ہوا گھر ہے اور ایک حدیث نبوی ﷺ میں فرمایا کہ گھروں میں بھی نماز پڑھا کرو اور گھروں کو قبرستان نہ بناؤ گویا جس گھر میں نماز نہیں پڑھی جاتی وہ قبرستان ہے اور جس گھر میں

قرآن کریم کی تلاوت نہیں ہوتی وہ اجڑا ہوا گھر ہے، ہمیں اگر اپنے گھروں کو اجڑنے سے بچانا ہے اور قبرستان کی بجائے آبادی کا ماحول دینا ہے تو اس کے لئے قرآن کریم کی تلاوت، نماز کی ادائیگی، ذکر الٰہی کا اہتمام، درود شریف کا معمول اور خیر کے کاموں کا ماحول اپنے گھروں میں پیدا کرنا ہوگا، یہ ہماری گھریلو ضرورت ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے میں یہ دینی مدارس ہماری مدد کرتے ہیں جو ہمارے بچوں کو قرآن کریم پڑھاتے ہیں اور حفظ کراتے ہیں تاکہ ہمارے گھروں میں قرآن کریم کی تلاوت و قرأت کا ماحول قائم ہو سکے۔

قرآن کریم کے کچھ نہ کچھ حصے یاد ہونا بحیثیت مسلمان ہماری شخصی ضرورت بھی ہے کہ پانچ وقت کی نماز ہم پر فرض ہے جو ہم نے بہر حال ادا کرنی ہے، ان پانچ نمازوں کے فرائض اور مؤکدہ سنتوں کی رکعتیں شمار کر کے اندازہ کریں کہ ایک مسلمان مرد یا عورت کو پانچ نمازیں سنت کے مطابق ادا کرنے کے لئے کم از کم کتنا قرآن کریم یاد ہونا چاہیے۔

ہمارے ہاں عام طور پر یہ ہوتا کہ چھوٹی چھوٹی تین چار سورتیں یاد کر کے پوری نمازیں انہی کے ساتھ پڑھ لی جاتی ہیں اور زندگی بھر اسی کا معمول رہتا ہے، نماز ادا ہو جانے کی حد تک تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے نماز ہو جاتی ہے لیکن سنت کے مطابق نمازیں ادا نہیں ہوتیں، اس لئے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ یہ ہے کہ آپ نمازوں میں سورتیں بدل بدل کر پڑھتے تھے، فجر میں سورتیں اور ہوتی تھیں، ظہر میں سورتیں اور ہوتی تھیں، عصر میں اس سے مختلف ہوتی تھیں اور مغرب و عشاء میں ان سے الگ سورتیں پڑھا کرتے تھے، پھر فجر میں لمبی سورتیں پڑھتے تھے، ظہر، عصر اور عشاء میں درمیانی سورتوں کی قرأت کرتے تھے اور مغرب میں عام طور پر چھوٹی سورتیں پڑھتے تھے، اس ساری صورت حال کو سامنے رکھ کر حساب لگائیے کہ سنت کے مطابق نمازیں پڑھنے کے لئے ایک مسلمان

کو کم سے کم کتنا قرآن کریم زبانی یاد ہونا چاہیے، آپ خود حساب لگائیے اور کبھی تنہائی میں بیٹھ کر سارے مسئلہ کا جائزہ لے کر طے کریں کہ قرآن کریم کا کتنا حصہ اس حوالہ سے ہمیں بہر حال یاد ہونا چاہیے، میرا ایک بڑا محتاط سا اندازہ ہے کہ آخری نصف پارہ زبانی یاد کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت کے لئے بہر حال لازمی ہے اس سے کم میں کسی طرح گزارہ نہیں ہوگا اس لئے قرآن کریم کا کچھ نہ کچھ حصہ یاد ہونا ہم سب کی ضرورت ہے اور یہ سہولت ہمیں ان دینی مدارس و مکاتب سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

ہماری ضروریات کے بہت سے دائروں میں قرآن کریم کا پڑھنا اور یاد کرنا لازمی ہے جس میں سے صرف دو کا میں نے تذکرہ کیا ہے، یہ ہماری اس دنیا کی ضروریات ہیں اور ہماری شخصی اور خاندانی ضروریات ہیں جن سے ہم کسی طرح بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتے جبکہ ہماری اصل زندگی جو آخرت کی زندگی ہے وہاں کی تو ساری ضروریات اور تقاضے قرآن کریم اور جناب نبی اکرم ﷺ کی سیرت و سنت کے ساتھ وابستہ ہیں۔

مثلاً ایک حدیث نبوی ﷺ میں ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس حافظ نے قرآن کریم یاد کرنے کے بعد اسے یاد رکھا اور اس پر عمل کیا اسے قیامت کے دن کہا جائے گا کہ اپنے خاندان اور برادری کے ایسے دس افراد اپنے ساتھ جنت میں لے جاؤ جن کے لئے جہنم واجب ہو چکی ہے، یہ حافظ کا کوٹہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ اپنے خاندان کے جہنم کے حقدار دس افراد کو جنت میں لے جائے گا، اب ہمیں اپنے حالات کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم لوگ جس طرح کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ہمارا اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا جس طرح کا ہے اس کو سامنے رکھ کر ہم دیکھ لیں کہ قیامت کا دن تو ہوگا، اللہ تعالیٰ کی عدالت بھی ہوگی، حشر کا میدان بھی ہوگا اور عدالت میں پیشی بھی ہوگی، اگر ہماری پیشی پر اللہ تعالیٰ یہ فرما دیں کہ تمہارا

فیصلہ میرٹ پر ہوگا اور تمہاری فائل کے مطابق ہوگا تو ہمارا کیا حشر ہوگا؟ کیا ہم اپنے میرٹ اور اپنی فائل کا سامنا کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے؟ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم کے ساتھ ہماری حفاظت فرمائیں، ہم سب اپنی فائیل اور میرٹ کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ہم میں سے کسی میں یہ حوصلہ نہیں ہے کہ حشر کے میدان میں کسی جگہ بھی اپنے میرٹ اور فائل کا حوالہ دے سکے۔

دنیا میں کسی جگہ اگر میرٹ کام نہ دے اور کامیابی کے درجہ تک نہ پہنچ سکے تو ہم کوٹہ تلاش کیا کرتے ہیں اور سفارش ڈھونڈتے ہیں اس لئے میں عرض کرتا ہوں کہ قیامت کے دن حشر میں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیشی سے قبل یا تو ہمیں اپنا اپنا میرٹ درست کر لینا چاہیے یا پھر ایک دو کوٹے والے سفارشیوں کا بندوبست کر لینا چاہیے اور ہر خاندان کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ اس کے پاس ایک دو ایسے حافظ ضرور ہوں جو دس بیس افراد کے لئے سفارش اور نجات کا ذریعہ بن سکیں۔

قرآن کریم کی تلاوت کا کچھ نہ کچھ معمول رکھنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے اور اس کی جناب نبی اکرم ﷺ نے تلقین فرمائی ہے، خود نبی اکرم ﷺ کا یہ ذوق تھا اور حضرات صحابہ کرامؓ کا ذوق اور معمول بھی تھا، صحابہ کرامؓ میں سے دو بزرگوں نے جو بڑے قاریوں میں سے تھے اس سلسلہ میں اپنا اپنا ذوق بیان کیا ہے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے ایک بار حضرت معاذ بن جبلؓ نے سوال کیا کہ آپ قرآن کریم کس طرح پڑھتے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے ہر وقت قرآن کریم پڑھتا رہتا ہوں مگر جب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے سوال کیا تو انہوں نے اپنا ذوق اس سے مختلف بیان فرمایا، انہوں نے کہا کہ میں رات کو اچھی طرح نیند کر کے تازہ دم اور فریش

ہونے کے بعد پورے اہتمام کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہوں اور اس نیت کے ساتھ نیند کو بھی عبادت شمار کرتا ہوں کہ اٹھ کر تازہ دم ہو کر قرآن کریم کی تلاوت کروں گا۔

یہ چلتے پھرتے قرآن کریم کی تلاوت کرتے رہنے کا معمول میں نے ایک بزرگ میں دیکھا ہے، مولانا حافظ شفیق الرحمنؒ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے پرانے بزرگوں میں سے تھے اور مدرسہ کی کمیٹی کے صدر بھی رہے ہیں، بازار سید نگری میں کریانہ کی دکان کرتے تھے، ان سے دکان پر کافی طلبہ نے قرآن کریم حفظ کیا ہے جہاں ان کی مستقل کلاس ہوتی تھی، وہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے ہر حال میں قرآن کریم پڑھتے رہتے تھے، ہم جب بھی دیکھتے ان کے ہونٹ ہل رہے ہوتے اور وہ قرآن کریم کی تلاوت میں مصروف رہتے ،ایک دن میں نے پوچھ لیا کہ حضرت! آپ دکان بھی کرتے ہیں، باقی سارے کام بھی کرتے ہیں اور بچوں کو پڑھاتے بھی ہیں، اس سب کچھ کے ساتھ آپ روزانہ کتنی تلاوت کر لیتے ہیں، فرمانے لگے کہ کم وبیش اٹھارہ پارے یومیہ تو میرا معمول ہے اس سے زیادہ بھی کبھی پڑھ لیتا ہوں اور بائیس پاروں تک بھی ایک بار پڑھ لیا تھا۔

ایک اور سوال بھی میں نے ان سے کیا جسے دل لگی سمجھ لیجئے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہوتا کہ غسل خانے میں بھی قرآن کریم کی تلاوت کر رہے ہوں، ہنس کر کہا کہ ہاں کبھی بے خیالی میں ایسا ہو جاتا ہے مگر خیال آنے پر میں چونک کر منہ بند کر لیا کرتا ہوں۔

بہر حال قرآن کریم کی تلاوت کسی بھی طریقہ سے اور کسی بھی ذوق کے ساتھ کی جائے ،ہماری دینی ضرورت ہے اور ہمارے دلوں اور گھروں کی آبادی اور خیر و برکت کا ذریعہ بھی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

حدیث نبوی ﷺ

تمام علوم دینیہ کا سرچشمہ

"17 فروری 2010ء کو مسجد اقدس مسلم روڈ گوجرانوالہ میں نمازِ عشاء کے بعد درسِ حدیث"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

آج مجھے حدیث نبوی ﷺ کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کرنی ہیں، حدیث لغوی طور پر گفتگو اور بات چیت کو کہتے ہیں مگر شریعت میں اسے جناب نبی اکرم ﷺ کی گفتگو کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اور حدیث نبوی ﷺ میں جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات اور افعال و اعمال کے علاوہ صحابہ کرامؓ کے ایسے اقوال و اعمال کو بھی شمار کیا جاتا ہے جو نبی اکرم ﷺ کے علم و مشاہدہ میں آتے اور آپ ﷺ نے ان پر خاموشی اختیار کر کے ان کی تصویب و توثیق فرمادی۔

صحابہ کرامؓ نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ان احادیث کو یاد رکھا اور روایت کر کے امت کی اگلی نسل تک پہنچایا اور محدثینؒ نے بڑی محنت اور اہتمام کے ساتھ ان احادیث کو جمع و ترتیب اور چھان پھٹک کے ساتھ سینکڑوں کتابوں اور مجموعوں میں محفوظ کر دیا۔

حدیث نبوی ﷺ کی مختلف حیثیتیں ہیں اور اس بحرِ ذخار کے مختلف پہلوؤں سے مسلسل استفادہ کیا جا رہا ہے جن میں سے دو تین کا آج کی مختصر گفتگو میں ذکر کرنا چاہوں گا۔

حدیث نبوی ﷺ کی سب سے بڑی حیثیت یہ ہے کہ یہ تمام علوم دینیہ کا مآخذ اور سر چشمہ ہے اور دین کے حوالہ سے ہمیں جو چیز بھی حاصل کرنی ہے اس کا ذریعہ اور ماخذ حدیث نبوی ﷺ ہے، قرآن کریم بھی اسی کے ذریعہ ملا ہے، سنت کا تعین بھی اسی کی بنیاد پر ہوتا ہے، فقہ واحکام کی ترتیب میں بھی یہی اساس ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ کی سیرت و سوانح بھی اسی کے واسطے سے حاصل ہوتی ہے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی معرکۃ الاراء کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" کا آغاز اس جملہ سے کیا ہے کہ

"ان عمدۃ العلوم الیقینیۃ ورأسہا ومبنی الفنون الدینیۃ وأساسہا ھو علم الحدیث النبوی الشریف"

علوم یقینیہ (یعنی وحی سے متعلقہ علوم) کی بنیاد اور فنون دینیہ کی اساس علم حدیث نبوی ﷺ ہے، یوں سمجھ لیجئے کہ وحی اور دین سے متعلقہ تمام علوم وفنون کے لئے حدیث نبوی ﷺ راس المال کی حیثیت رکھتی ہے اور علم وفن کی ہر بات ہمیں اسی کے ذریعہ سے حاصل کرنی ہے۔

حدیث نبوی ﷺ قرآن کریم کا مآخذ بھی ہے کہ قرآن کریم کی کسی سورت اور آیت کے بارے میں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ قرآن کریم ہی کی سورت اور آیت ہے ہمارے پاس حدیث نبوی ﷺ کے سوا اور کوئی ذریعہ اور واسطہ موجود نہیں ہے، قرآن کریم کو صحابہ کرامؓ نے اسی طرح یاد کیا ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ آیت نازل ہوئی ہے، یہ فلاں سورۃ کا حصہ ہے اور اسے وہاں فلاں آیت کے ساتھ جوڑ دیا جائے، یہی قرآن کریم کے حفظ وترتیب کی سب سے پہلی بنیاد ہے اور اس میں ہمیں سب سے پہلے "جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے" پر پہلے ایمان لانا ہوگا اور اس کے بعد اسی آیت یا سورۃ پر ہم ایمان لاسکیں گے۔

اگر "جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے" پر ایمان نہیں ہے تو قرآن کریم کی کسی سورۃ اور کسی آیت پر ایمان ممکن ہی نہیں ہے اس لئے میں اکثر یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ دلائل کی ترتیب میں قرآن کریم مقدم ہے اور حدیث نبوی ﷺ کا نمبر دوسرا ہے لیکن ایمان کی ترتیب میں حدیث نبوی ﷺ مقدم ہے اور قرآن کریم پر ایمان حدیث نبوی ﷺ پر ایمان پر موقوف ہے۔

مثال کے طور پر یہ دیکھ لیجئے کہ سورۃ الکوثر قرآن کریم کی سورت ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے مگر اس کی ترتیب یہ ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ سورۃ جبرئیل لے کر آئے ہیں اور یہ قرآن کریم کی سورۃ ہے جس پر ہم ایمان لاتے ہیں، اب یہاں جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے پر ہم پہلے ایمان لائے ہیں اور سورۃ الکوثر قرآن کریم کی سورۃ ہے پر ہم بعد میں ایمان لائے ہیں، اس ترتیب کے بغیر قرآن کریم کے کسی لفظ اور جملے پر ایمان نہیں لایا جا سکتا، اس لئے حدیث نبوی ﷺ نہ صرف تمام علوم دینیہ کا ماخذ اور سرچشمہ ہے بلکہ قرآن کریم کا ماخذ بھی یہی ہے اور اس پر قرآن کریم کی طرح بلکہ اس سے بھی پہلے ایمان لانا ضروری ہے۔

حدیث نبوی ﷺ کی دوسری بڑی حیثیت یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کی تشریح ہے اور قرآن کریم کے کسی جملہ اور لفظ کا مفہوم طے کرنے کے لئے سب سے بڑی اتھارٹی ہے، قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور کسی بھی کلام میں اس کے کسی جملے اور محاورے یا ضرب المثل کا مفہوم و مصداق طے کرنے کا سب سے پہلا حق متکلم کا ہوتا ہے، اگر متکلم خود اپنے کسی جملے اور قول کا مفہوم و مصداق متعین کر دے تو پھر کسی اور کا یہ حق باقی نہیں رہ جاتا کہ وہ اس کا کوئی اور مفہوم اپنی طرف سے طے کرے، مثال کے طور پر میں آپ حضرات سے گفتگو کر رہا ہوں، میری کسی بات میں ابہام ہے یا کسی صاحب کو میری کوئی بات سمجھ نہیں آئی یا میری کسی بات کا کوئی صاحب غلط مطلب سمجھے ہیں تو مجھ سے پوچھا جائے گا کہ تمہاری اس بات کا مطلب

کیا ہے؟ اور اگر میں یہ کہہ دوں گا کہ میری اس بات کا یہ مطلب ہے اور اس سے میری مراد یہ ہے تو پھر اس کا وہی مطلب ہوگا اور کسی دوسرے شخص کا یہ حق باقی نہیں رہ جائے گا کہ وہ اس کا کوئی الگ مفہوم قرار دے۔

قرآن کریم میں متکلم اللہ تعالیٰ ہیں اور یہ ان کا کلام ہے اب ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی کسی آیت کا مفہوم طے کرنے یا کسی الجھن اور اشکال کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ براہ راست بات تو نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کسی کا اللہ تعالیٰ سے کوئی براہ راست رابطہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نمائندے کے ساتھ رابطہ نہ صرف ممکن ہے بلکہ موجود ہے، رسول اللہ کا مطلب یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نمائندے ہیں اور نمائندہ جب کوئی بات کرتا ہے تو وہ بات اس کی نہیں ہوتی بلکہ جس کا نمائندہ ہوتا ہے اس کی بات شمار کی جاتی ہے۔

مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ آپ اپنے کاروبار کے دفتر میں بیٹھے ہیں اور کسی فرم کا کوئی نمائندہ آپ کے پاس کاروباری معاملات طے کرنے کے لئے آیا ہے آپ کا یہ حق ہے کہ اس کے نمائندہ ہونے کے بارے میں تسلی کریں، اس سے انٹرویو کریں، کاغذات چیک کریں، فون کر کے معلومات حاصل کریں اور پورا اطمینان حاصل کریں کہ یہ صاحب اس کے نمائندہ ہیں یا نہیں، اس کے بعد آپ کا یہ بھی حق ہے کہ آپ ان کو نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔

لیکن جب آپ نے ان صاحب کو اس فرم کا نمائندہ تسلیم کر لیا اور اس حیثیت سے ان کے ساتھ گفتگو شروع کر دی تو پھر آپ کو ان سے کسی بات پر یہ پوچھنے کا حق نہیں ہے کہ یہ بات آپ اپنی طرف سے کر رہے ہیں یا فرم کی طرف سے کر رہے ہیں، یا کیا یہ بات آپ اپنی فرم سے پوچھ کر کر رہے ہیں؟ کیونکہ یہ دردسر آپ کا نہیں ہے کہ وہ کوئی بات فرم سے پوچھ کر کر رہے ہیں یا بغیر پوچھ کر کر رہے ہیں، وہ جو بات بھی کر رہے ہیں فرم کی نمائندہ کے طور پر کر رہے ہیں پوچھ کر کر رہے ہیں تو بھی وہ فرم کی بات ہے اور بغیر پوچھے کر رہے ہیں تو بھی

وہ فرم کی بات ہے۔

اس لئے قرآن کریم کی کسی بات پر کوئی اشکال ہو گا یا الجھن ہو گی تو متکلم کے نمائندے سے یعنی رسول اللہ ﷺ سے رجوع کیا جائے گا اور وہ جو تشریح وتعبیر فرما دیں گے وہ متکلم کی طرف سے سمجھی جائے گی اور اگر قرآن کریم کی کسی آیت یا جملہ کی تشریح میں جناب نبی اکرم ﷺ سے صحیح روایت کے ساتھ کوئی بات ثابت ہو جائے گی تو وہ حتمی تعبیر ہو گی اور اس کے بعد کسی صاحب کا یہ حق باقی نہیں رہ جائے گا کہ وہ یہ کہے کہ ٹھیک ہے اس آیت کا مطلب جناب نبی اکرم ﷺ یہ سمجھے ہوں گے لیکن میری سمجھ میں تو اس کا یہ مطلب آرہا ہے، اس لئے رسول اکرم ﷺ سے کسی تشریح کے ثابت ہو جانے کے بعد ''میں یہ سمجھا ہوں'' کا حق ختم ہو جاتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں بڑے بڑے حضرات کو ٹھوکر لگ جاتی ہے۔

صحابہ کرامؓ کا معمول یہی تھا کہ قرآن کریم کی کسی آیت کے سمجھنے میں دقت پیش آتی تھی تو جناب نبی اکرم ﷺ سے رجوع کرتے تھے اور نبی اکرم ﷺ اس کا جو مفہوم بیان کر دیتے وہی حتمی سمجھا جاتا تھا، اس پر احادیث نبویہ ﷺ کے ذخیرے سے بیسیوں شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں مثال کے طور پر ایک کا ذکر کروں گا۔ قرآن کریم کی آیت کریمہ ہے:

''یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ ''(المائدہ 105)

''اے ایمان والوں! تم پر لازم ہے کہ اپنی فکر کرو اگر کوئی اور شخص گمراہ ہوتا ہے تو تمہیں اس کا کوئی نقصان نہیں ہے اگر تم ہدایت پر ہو''

اس آیت کا ظاہری مفہوم یہ بنتا ہے کہ ہر مسلمان کو صرف اپنے ایمان کی فکر کرنی

چاہیئے اور کسی دوسرے شخص کے ہدایت پر آنے یا گمراہ ہونے کی فکر نہیں کرنی چاہیے، اگر اس آیت کریمہ کو اس ظاہری مفہوم پر ہی رکھا جائے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی وہ اہمیت باقی نہیں رہ جاتی جو اسے دین میں حاصل ہے بلکہ اس آیت کریمہ نے تو حضرت صدیق اکبرؓ کے اس جہاد کے بارے میں بھی اشکال کھڑا کر دیا تھا جو انہوں نے مرتدین کے خلاف اور منکرین زکوٰۃ اور منکرین ختم نبوت کے خلاف کیا تھا، حتیٰ کہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت صدیق اکبرؓ کو خطبہ میں اس کی باقاعدہ وضاحت کرنا پڑی تھی لیکن میں یہاں ترمذی شریف کی ایک روایت کا حوالہ دینا چاہوں گا کہ ایک صاحب نے حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ سے اس آیت کا مطلب پوچھا اور اس سلسلہ میں اپنے اشکال کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے اس آیت کریمہ کے بارے میں جناب نبی اکرم ﷺ سے پوچھ لیا تھا اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ

”بل ائتمروا بالمعروف وتناھوا عن المنکر حتی اذا رایت شحا مطاعا وھوی متبعا و دینا مؤثرۃ واعجاب کل ذی رأی برأیہ فعلیك بخاصۃ نفسك ودع العوام فان من ورائکم ایاما الصبر فیھن مثل القبض علی الجمر الخ“ (ترمذی)

بلکہ تم امر بالمعروف کرتے رہو اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے رہو حتیٰ کہ جب وہ دور آئے گا جب بخل انسانوں پر حکمرانی کرنے لگے گا، خواہشات کی پیروی عام ہو جائے گی، دین کو ثانوی درجہ دے دیا جائے گا اور ہر شخص اپنی ہی رائے پر خوش ہونے لگے گا تو پھر تم صرف اپنی فکر کرنا اور عام لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا اس لئے کہ اس کے بعد وہ زمانہ ہو گا جس میں دین پر صبر کرنا انگارے ہاتھ میں لینے کے مترادف ہو گا۔

گویا جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ آیت اپنے ظاہری مفہوم پر نہیں ہے بلکہ اس کا خاص مفہوم ہے اور خاص حالات میں ہی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس لئے حدیث نبوی ﷺ کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ یہ قرآن کریم کی شرح ہے اور قرآن کریم کی کسی آیت یا جملے کا مفہوم متعین کرنے میں فائنل اتھارٹی کا درجہ رکھتی ہے۔

حدیث نبوی ﷺ کی تیسری حیثیت یہ ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کی سیرت و اسوۃ اور حالات و واقعات کا ماخذ اور سرچشمہ ہے، جناب نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے امت کے لئے مطاع قرار دیا ہے اور قرآن کریم کے ساتھ سنت نبوی ﷺ کی پیروی کا بھی حکم دیا ہے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ مَن يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللهَ (النساء 80)

جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی، گویا اللہ تعالیٰ کی اطاعت موقوف ہے جناب نبی اکرم ﷺ کی اطاعت پر اور رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کے بغیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت ممکن ہی نہیں ہے۔

اس طرح جناب نبی اکرم ﷺ ہی کو اللہ تعالیٰ نے مطاع اور اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے اور یہاں یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم نازل فرما کر ہمارے لئے یہ راستہ کھلا نہیں چھوڑ دیا کہ ہم قرآن کریم کو پڑھیں اور جیسے ہماری سمجھ میں آئے اس کے مطابق عمل کریں، قرآن کریم پر عمل کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس کے لئے آئیڈیل اور معیار جناب نبی اکرم ﷺ کو بنایا گیا ہے کہ قرآن کریم کے کسی حکم پر عمل اگر جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت اور اسوہ کے مطابق ہوگا تو وہ قرآن کریم کی پیروی شمار ہوگا، ہمیں حکم یہ ہے کہ عمل قرآن کریم پر کرو لیکن اس کے لئے فالو جناب نبی اکرم ﷺ کو کرو۔

اس طرح قرآن کریم کے ساتھ ساتھ جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت کو بھی واجب الاتباع اور مطاع کا درجہ حاصل ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ کی سیرت و سنت کا اصل ماخذ بھی احادیث نبویہ ہی ہیں، نبی اکرم ﷺ کے ارشادات و اقوال، اعمال و احوال اور واقعات کی تفصیل میں احادیث کے ذخیرہ میں ہی ملتی ہے اور اس طرح سنت رسول ﷺ

کا ماخذ بھی حدیث نبوی ﷺ ہے۔

یہ جناب نبی اکرم ﷺ کا اعزاز و اعجاز ہے کہ آپ کی سیرت طیبہ، احوال و واقعات اور ارشادات و اقوال جس تفصیل کے ساتھ حدیث و تاریخ کے ریکارڈ میں موجود ہیں نسل انسانی کی کسی اور شخصیت کو یہ مقام حاصل نہیں ہوا۔

ہم جناب نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کے جس حصے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں کر سکتے ہیں اور زندگی کے جس مسئلہ کے بارے میں جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت و سیرت سے راہ نمائی حاصل کرنا چاہیں ہمیں مل جاتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا امت مسلمہ پر احسان ہے، جناب نبی اکرم ﷺ کا معجزہ اور قیامت تک اسلام کی صداقت اور تسلسل کا اظہار ہے۔

اس لئے حدیث نبوی ﷺ کو ہمارے دین میں بنیادی اور اساسی حیثیت حاصل ہے، جو نہ صرف قرآن وسنت کا ماخذ ہے بلکہ جناب نبی اکرم ﷺ کی سیرت و اسوہ کا بھی سرچشمہ ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حدیث نبوی ﷺ پر اپنے ایمان میں استقامت سے نوازیں اور قرآن وسنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

علم حدیث میں امام بخاریؒ، امام طحاویؒ اور شاہ ولی اللہؒ کا طرز استدلال

"21 اپریل 2010ء کو جامعہ اسلامیہ کلفٹن کراچی میں دورۂ حدیث کے طلبہ سے خطاب"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اما بعد!

ہم اس وقت سب حدیث نبوی ﷺ کے طلبہ بیٹھے ہیں اور حدیث نبوی ﷺ کے حوالہ سے گفتگو کر رہے ہیں، حدیث نبوی ﷺ اپنے عمومی مفہوم میں جناب نبی اکرم ﷺ کے اقوال و اعمال اور احوال و واقعات پر مشتمل ہے اور تمام علوم دینیہ کا سر چشمہ اور ماخذ ہے، ہمیں قرآن کریم حدیث نبوی ﷺ کی وساطت سے ملا ہے، سنت نبوی ﷺ کے حصول کا ذریعہ بھی یہی ہے اور فقہ کا استنباط بھی اسی سے ہوتا ہے، اسی لئے حدیث نبوی ﷺ کو ہمارے نصاب میں سب سے زیادہ مقدار میں اور تفصیل کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔

ہمارا آخری تعلیمی سال حدیث نبوی ﷺ کی تدریس و تعلیم میں گزرتا ہے اور ہم دورۂ حدیث کے عنوان سے حدیث نبوی ﷺ کی اہم کتابوں کا سماع کرتے ہیں اور ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں اس وقت حدیث نبوی ﷺ کی تعلیم کے حوالہ سے صرف ایک پہلو پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں حدیث نبوی ﷺ کی یہ بڑی بڑی کتابیں کس طرح پڑھنی چاہییں اور ان سے کس طرح استفادہ کرنا چاہیے؟

جہاں تک مسائل کا تعلق ہے انہیں ہم اس سے قبل فقہ کی بہت سی کتابوں میں پڑھ چکے ہیں اور مسائل کی تفصیلات انہیں میں ملتی ہیں اس لئے میں یہ گزارش کروں گا کہ دورۂ حدیث کے دوران ہمیں حدیث نبوی ﷺ کی یہ کتابیں مسائل معلوم کرنے کے لئے پڑھنے کی بجائے محدثین کے الگ الگ ذوق، اسلوب اور طرز استدلال سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے پڑھنی چاہیئیں۔

محدثین کا الگ الگ ذوق ہے، الگ الگ دائرہ کار ہے اور الگ الگ طرز استدلال ہے اور میری طالب علمانہ رائے میں حدیث نبوی ﷺ کی کتابوں کو پڑھتے اور پڑھاتے ہوئے اس تنوع اور توسع سے مستفید ہونے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

مثال کے طور پر تین بزرگوں کا ذکر کروں گا امام بخاریؒ سب سے بڑے محدث سمجھے جاتے ہیں اور ان کی ''الجامع الصحیح'' کو حدیث کی سب کتابوں پر فوقیت حاصل ہے اس کی ایک وجہ ان کے ہاں سند و روایت کا کڑا معیار اور اس کی پابندی ہے جس کی وجہ سے اسے ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ'' کا درجہ دیا جاتا ہے لیکن اسؒ کا ایک اہم امتیاز امام بخاریؒ کا طرز استدلال اور اسلوب استنباط بھی ہے جسے ہمارے ہاں ترجمۃ الباب اس کے تحت درج روایت کے ساتھ تعلق اور ان میں مناسبت تلاش کرنے کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ترجمۃ الباب کا حدیث و روایت کے ساتھ کیا تعلق ہے اور امام بخاریؒ نے اس سے کس طرح استدلال کیا ہے؟ یہ معلوم کرنا اور بیان کرنا تدریس بخاریؒ کی مہمات میں شمار ہوتا

ہے میں اسی کو طرز استدلال اور اسلوب استنباط سے تعبیر کر رہا ہوں کہ ہمیں امام بخاریؒ سے استدلال اور استنباط کا فن سیکھنا چاہیے، بخاری شریف کے تراجم ابواب امام بخاریؒ کے استدلال و استنباط کے فن کے شاہکار ہیں، بسا اوقات وہ بہت دور کی کوڑی لاتے ہیں اور حدیث اور ترجمۃ الباب میں مناسبت تلاش کرنے میں خاصی مغز کھپائی کی ضرورت ہوتی ہے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ فرمایا کرتے تھے کہ امام بخاریؒ کا استدلال بسا اوقات اس طرز کا ہوتا ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے کہ

مگس کو باغ میں جانے نہ دیجیو
کہ ناحق خون پروانے کا ہو گا

یعنی شہد کی مکھی کو باغ میں نہ جانے دینا اس لئے کہ وہ باغ میں جائے گی تو پھلوں اور پھولوں کا رس چوسے گی، پھر شہد بنائے گی، چھتہ بنائے گی، اس میں شہد نکالے گی، شہد کو حاصل کرنے کے لئے لوگ چھتے کو نچوڑیں گے، نچوڑنے کے بعد چھتے کے باقی ماندہ حصے سے موم حاصل ہو گی، اس سے موم بتی بنے گی اور موم بتی جب جلے گی تو پروانہ آ کر جل جائے گا۔

اسی لئے دورۂ حدیث کے طلبہ کو میں یہ مشورہ دوں گا کہ بخاری شریف پڑھتے ہوئے اس طرف بطور خاص توجہ دیں اور امام بخاریؒ کے استدلال کے اسلوب اور استنباط کی ندرت سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ امام طحاویؒ کی ''شرح معانی الآثار'' کا کچھ حصہ ہم دورۂ حدیث میں پڑھتے ہیں۔ میرے خیال میں اسے طلبہ کو دورۂ حدیث سے پہلے پڑھانا چاہیے اور مکمل پڑھانا چاہیے۔ امام طحاویؒ کے خوبصورت فقہی مجادلہ سے گزر کر جب طلبہ دورۂ حدیث میں آئیں گے تو حدیث نبوی ﷺ پڑھنے کا لطف ہی اور ہو گا۔ امام طحاویؒ کا بنیادی ذوق فقہی مجادلہ اور مکالمہ ہے اور حنفیت کے دفاع میں امام طحاویؒ کے فقہی مکالمہ کی طرز کو میں اس باب میں آئیڈیل سمجھتا ہوں، یہی فقہی مجادلہ کا اصل اور

معیاری اسلوب ہے مثلاً وہ

☆ کسی بھی فقہی مسئلہ میں تمام اقوال کا دیانت داری کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور ان کے پورے دلائل تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

☆ پہلے دوسرے فریق کے اقوال کا ذکر کرتے ہیں، ان کے دلائل کا ذکر کر کے ان کا تجزیہ کرتے ہیں، ان کی کمزوری واضح کرتے ہیں، پھر اپنے موقف اور دلائل بیان کرتے ہیں، ان کا تقابل کر کے وجوہ ترجیح کا ذکر کرتے ہیں اور اپنا موقف خالصتاً علمی بنیاد پر ثابت کرتے ہیں۔

☆ وہ کسی جگہ بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، اور امام محمد کا یہ قول ہے اور فلاں فلاں حدیث ان کی تائید کرتی ہے بلکہ اس کی بجائے وہ یہ فرماتے ہیں کہ فلاں فلاں حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے اور امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء بھی یہی کہتے ہیں۔

☆ ہر مسئلہ کی نوعیت اور اس کا دائرہ بیان کرتے ہیں کہ خطاء وصواب کا معاملہ ہے یا اولیٰ غیر اولیٰ کا مسئلہ ہے، ہمارے ہاں فقہی اختلافات میں ایک بہت غلط رویہ ہمارے ہاں پیدا ہو گیا ہے کہ ہم فقہی مسائل میں درجہ بندی کا عام طور پر لحاظ نہیں رکھتے، مثلاً حق و باطل کا دائرہ الگ ہے، خطا وصواب کا دائرہ اس سے مختلف ہے اور اولیٰ غیر اولیٰ کا دائرہ ان دونوں سے جدا ہے مگر ہم اولیٰ غیر اولیٰ کے مسائل میں بھی بسا اوقات اس قدر شدت اختیار کر لیتے ہیں کہ وہ حق و باطل کا معرکہ دکھائی دینے لگتا ہے اور اسلام و کفر کی جنگ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ہمیں طحاوی شریف پڑھتے ہوئے امام طحاویؒ سے یہ بھی سیکھنا چاہیے کہ جس مسئلہ میں ہم بحث کر رہے ہیں اس کی سطح اور دائرہ کیا ہے اور امام طحاویؒ اس کا بطور خاص اہتمام کرتے ہیں۔

☆امام طحاویؒ کے طرز استدلال میں ایک اور بات بھی آپ کو نظر آئے گی جو ہر سنجیدہ صاحب علم کی خصوصیت ہوتی ہے کہ مباحثہ و مکالمہ میں جہاں اپنے موقف یا استدلال میں کمزوری محسوس کرتے ہیں اس کے اظہار میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے یہ علمی دیانت کی بات ہے اور امانت کا تقاضہ ہے جس سے کسی صاحب علم کو پہلوتہی نہیں کرنی چاہیے، اس کی صرف ایک مثال کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ منی پاک ہے یا ناپاک اس پر احناف اور شوافع میں اختلاف ہے، احناف اسے بول و براز کی طرح ناپاک سمجھتے ہیں اور شوافع کے نزدیک یہ ناک کی رطوبت کی طرح پاک ہے۔

امام طحاویؒ نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے، دونوں طرف سے احادیث و آثار بیان کئے ہیں اور بحث و تمحیص کے بعد وہ نتیجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ دونوں طرف روایات و آثار موجود ہیں اور ہم ان روایات کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے اس لئے ہم قیاس و نظر کی بنیاد پر اپنے موقف کو ثابت کرتے ہیں۔

اس لئے میں دورہ حدیث کے طلبہ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ وہ طحاوی شریف پڑھتے ہوئے امام طحاویؒ سے فقہی مجادلہ کا اسلوب سیکھیں اور فقہی مکالمہ کی اخلاقیات کا درس لیں۔

تیسرے بزرگ جن کا میں اس حوالہ سے ذکر کرنا چاہتا ہوں، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' ہے جسے حضرت شاہ صاحب نے بنیادی طور پر علم حدیث کی کتاب کے طور پر ہی پیش کیا ہے اور ہمارے ہاں جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں اس کے بعض ابواب دورہ حدیث کے نصاب میں شامل ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اہمیت بیان کی ہے، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و اعمال کی حکمتوں پر بحث کی ہے، اسلامی شریعت کی حکمتوں اور فوائد کو واضح کیا ہے، محدثین اور فقہاء کے اسلوب میں فرق کی نشاندہی کی ہے اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

سے مسائل واحکام کے استنباط واستدلال کے حوالہ سے صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ کے اسالیب سے متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ مختلف فقہوں کے وجود میں آنے کا پس منظر اور تاریخ بیان کی ہے، اسلامی احکام اور مسائل شریعت کی حکمتوں اور اسرار و رموز سے واقفیت اور اس اسلوب سے استفادہ کے لئے "حجۃ اللہ البالغۃ" سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے اس لئے میری رائے میں حدیث نبوی ﷺ کے اس پہلو سے بھی ہمارے طلبہ اور اساتذہ کا واقف ہونا ضروری ہے بلکہ آج کے دور میں اس کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

میں نے حدیث نبوی ﷺ کی تعلیم وتدریس کے حوالہ سے صرف ایک پہلو پر کچھ معروضات پیش کی ہیں، دعا کریں کہ اللہ رب العزت ہمیں حدیث نبوی ﷺ کے ذخیرے سے زیادہ سے زیادہ استفادے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

امام بخاریؒ اور علم حدیث

"جامعہ محمودیہ سلہٹ، مدینۃ العلم دارالسلام سلہٹ اور دارالرشاد میرپور ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں
بخاری شریف کی افتتاحی مجالس سے خطاب"

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

سب سے پہلے میں بخاری شریف کی تعلیم کا آغاز کرنے والے طلبہ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس مقام تک پہنچایا کہ آج وہ حدیث نبوی ﷺ کی سب سے مستند کتاب کی تعلیم کا آغاز کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اس کی تکمیل کی توفیق دیں اور علم حدیث کی برکات سے مالا مال فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

بخاری شریف علم حدیث کی سب سے مستند کتاب ہے جسے "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" کہا جاتا ہے، حدیث نبوی ﷺ کا علم بہت مہتم بالشان علم ہے جسے حضرت امام ولی اللہ دھلویؒ نے تمام علوم دینیہ کی اصل اور اساس کہا ہے اس لیے کہ تمام علوم دینیہ کے چشمے اسی سے پھوٹتے ہیں حتیٰ کہ قرآن کریم بھی ہمیں حدیث نبوی ﷺ کے ذریعے ملا ہے، قرآن کریم کا معنیٰ و مفہوم تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں مگر ہمیں تو قرآن کریم کے الفاظ بھی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے ذریعہ حاصل ہوئے

ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات وفرمودات پر ایمان لائے بغیر ہمارا قرآن کریم کے الفاظ تک پہنچنا بھی ممکن نہیں ہے، اس لیے حدیث نبوی ﷺ تمام علوم دینیہ کی اساس اور سرچشمہ ہے اور اسے پورے اہتمام توجہ اور دل جمعی کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔

اس کے بعد بخاری شریف کے بارے میں چند باتوں کو سمجھنا ضروری ہے، ایک یہ کہ بخاری شریف کی وہ خصوصیات اور امتیازات کیا ہیں جنہوں نے اسے حدیث کی تمام کتابوں سے ممتاز کر دیا ہے اور اسے علمی حلقوں میں اس قدر قبولیت حاصل ہوئی ہے، اس کے بارے میں اساتذہ اور طلبہ سے میری گزارش ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بخاری شریف کے تراجم ابواب پر مستقل رسالہ لکھا ہے جو ہمارے ہاں بخاری شریف کے متداول نسخوں میں موجود ہے، اس کی ابتداء میں حضرت شاہ صاحبؒ کا ایک صفحہ کا مقدمہ ہے جس کے بارے میں ان کا ارشاد ہے کہ بخاری شریف کو جو لوگ سمجھ کر پڑھنا چاہتے ہیں انہیں یہ مقدمہ حفظ کر لینا چاہیے، اس سلسلہ میں اساتذہ سے میری گزارش ہے کہ اگر حفظ نہ بھی ہو سکے تو کم از کم یہ مقدمہ بخاری شریف کے طلبہ کو سبقاً سبقاً ضرور پڑھا دینا چاہیے، اس میں حضرت شاہ صاحبؒ نے بخاری شریف کے بہت سے امتیازات کا ذکر کیا ہے جن میں سے تین چار کا تذکرہ کرنا میں اس وقت مناسب سمجھتا ہوں۔

ایک یہ کہ بخاری شریف سے قبل محدثین کا طریق کار عام طور پر یہ تھا کہ وہ کسی ایک شعبہ کے بارے میں احادیث کو جمع کرتے تھے مثلاً امام مالکؒ نے احکام کے حوالہ سے احادیث جمع کی ہیں، محمد بن اسحاقؒ نے سیرت ومغازی کی روایات کو مرتب کیا ہے، حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ نے زہد ورقائق کے بارے میں روایات منضبط فرمائی ہیں اور ابن جریجؒ نے تفسیری روایات اکٹھی کی ہیں مگر امام بخاریؒ نے تمام فنون کی روایات کو یکجا کر دیا ہے اور اسی وجہ سے اسے ''الجامع'' کہا جاتا ہے کہ اس میں تفسیر، سیرت، عقائد، مغازی، احکام، تاریخ، اخلاق، معاملات اور دیگر تمام شعبوں کے بارے میں روایات انہوں نے

مرتب کر دی ہیں جس سے زندگی کے کم و بیش ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والی روایات بخاری شریف میں مل جاتی ہیں۔

بخاری شریف کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ اس سے قبل بیشتر محدثین روایات جمع کرنے میں صحت کی ذمہ داری قبول نہیں کرتے تھے اور سند کے بیان کے ساتھ ہر طرح کی روایات بیان کر دیتے تھے جس سے روایت کی جانچ پڑتال کی ذمہ داری قاری پر آجاتی تھی کہ وہ سند کو دیکھ کر روایات کا درجہ خود طے کر لے، یہ بات اہل علم کے حلقہ میں تو ٹھیک ہے مگر عوام کیلئے ٹھیک نہیں ہے، اس لیے امام بخاریؒ نے روایت کی صحت کا کڑا معیار اور اس کیلئے مضبوط اصول طے کر کے اس بات کی ذمہ داری قبول کی ہے کہ وہ جو روایت اس کتاب میں نقل کریں گے وہ ان کے بیان کردہ اصول کے مطابق بالکل صحیح ہو گی اور اسے بلا تامل قبول کیا جا سکتا ہے۔

تیسرا امتیاز اس کتاب کا یہ ہے کہ اس سے قبل عام محدثین کا اسلوب یہ رہا ہے کہ وہ اپنی کتابوں میں مرفوع، موقوف، مسند، منقطع ہر قسم کی روایات اور ان کے ساتھ آثار صحابہؓ و تابعینؒ کو یکجا بیان کر دیتے تھے مگر امام بخاریؒ نے ان میں سے مسند اور مرفوع روایات کو چھانٹ کر الگ پیش کر دیا ہے اور ان کے ساتھ اگر کسی جگہ موقوف روایات یا آثار کا ذکر کیا ہے تو شاھد اور تابع کے طور پر اسے نقل کیا ہے، اصل روایات مسند اور مرفوع ہی پیش کی ہیں اور اسی مناسبت سے اس کا نام ''الجامع المسند الصحیح'' رکھا گیا ہے۔

بخاری شریف کا چوتھا اور سب سے اہم امتیاز حضرت امام بخاریؒ کا اجتہاد و استنباط ہے جو ان کے تراجم ابواب کی صورت میں ہے اور ان سے امام بخاریؒ کی اجتہادی شان جھلکتی ہے۔ امام بخاریؒ کے فقہی مذہب کے بارے میں زیادہ قرین قیاس قول یہ ہے کہ وہ خود مجتہد مطلق تھے، اگرچہ دیگر بہت سے مجتہدین مطلق کی طرح ان کی فقہ کی ترویج نہیں ہوئی مگر ان کا اجتہادی مرتبہ و مقام یہی ہے اور انہوں نے ایک ایک حدیث سے کئی کئی

مسائل مستنبط کر کے ان پر جو عنوانات قائم کیے ہیں ان سے ان کے اجتہادی مقام کی بلندی معلوم ہوتی ہے، بخاری شریف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں پڑھنے اور سمجھنے کی اصل بات حدیث سے ترجمۃ الباب کی مناسبت ہے کیونکہ یہ مناسبت بعض اوقات اتنی دور کی ہوتی ہے کہ اس کیلئے اچھی خاصی ذہنی ورزش کرنا پڑ جاتی ہے، ہمارے استاذ محترم نے جو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد ہیں ایک بار حضرت مدنیؒ کے حوالہ سے ذکر فرمایا کہ بعض اوقات امام بخاریؒ کے بیان کردہ ترجمۃ الباب اور اس کے تحت لائی گئی حدیث میں مناسبت اس طرز کی ہوتی ہے جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے کہ ؎

مگس کو باغ میں جانے نہ دیجیو
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

شاعر کا مطلب یہ ہے کہ شہد کی مکھی باغ میں جائے گی، پھولوں کا رس چوسے گی، اس سے شہد بنائے گی، پھر چھتہ بنا کر شہد اس میں نکالے گی، چھتے سے موم نکلے گی، اس سے موم بتی بنے گی، یہ موم بتی جلے گی تو پروانے آئیں گے اور اس کی آگ میں جل جائیں گے اس لیے پروانے کو جلنے سے بچانے کیلئے بہتر ہے کہ مکھی کو باغ میں جانے ہی نہ دو تاکہ نہ وہ پھولوں کا رس چوسے، نہ شہد بنائے، نہ چھتہ بنے، نہ موم نکلے، نہ موم بتی بنے، نہ جلے اور نہ پروانے کی موت ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ دھلویؒ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ بسا اوقات امتحان اور آزمائش کیلئے بھی دور دراز کی مناسبت والا عنوان کسی روایت پر قائم فرما دیتے ہیں تاکہ پڑھنے والوں کی ذہانت اور قابلیت کا اندازہ ہو جائے، اس کے ساتھ ہی چونکہ امام بخاریؒ کا ذوق ہے کہ وہ ایک ایک حدیث سے کئی کئی مسائل مستنبط کرتے ہیں اور پھر مختلف ابواب

میں اس کی مناسبت والے جملے نقل کرتے ہیں اس لیے بسا اوقات بخاری شریف کی بعض روایات کو یک جا تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور ایک روایت کو جمع کرنے کیلئے کئی ابواب کی ورق گردانی کرنا پڑتی ہے بہر حال یہی بخاری شریف کا کمال اور اس کا حسن ہے اور اس عظیم کتاب کے پڑھنے پڑھانے والوں کو اس کے امتیازات اور خصوصایت کو ہر وقت ذہن میں رکھنا چاہیے۔

اس کے بعد اب آتے ہیں بخاری شریف کے سبق کے آغاز کی طرف جس کا عام طور پر طریقہ یہ ہے کہ اس کی ابتدائی حدیث پڑھی جاتی ہے اور اس کے بارے میں دو چار ضروری باتوں کے بعد دعا ہوتی ہے میں اس کے مطابق آپ طلبہ میں سے کسی سے یہ روایت سنوں گا لیکن اس سے قبل یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حدیث کی روایت کے دو طریقے محدثین کے ہاں مروج چلے آرہے ہیں، ایک یہ ہے کہ شاگرد حدیث پڑھتا ہے اور استاذ سنتا ہے، ہمارے ہاں عام طور پر یہی طریقہ رائج ہے لیکن دوسرا طریقہ یہ ہے کہ استاذ حدیث پڑھتا ہے اور شاگرد سنتے ہیں، یہ طریقہ بھی محدثین میں رائج رہا ہے، اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام مالکؒ کا طریقہ یہ تھا کہ ان کے سامنے سینکڑوں تلامذہ کی مجلس میں ایک شاگرد روایت پڑھتا تھا اور امام صاحبؒ کے ساتھ دیگر تلامذہ بھی سنتے تھے مگر قاضی عیاضؒ نے ''ترتیب المدارک'' میں لکھا ہے کہ امام مالکؒ کے ایک شاگرد ہشام بن عمارؒ کو ایک دن شوق ہوا کہ حضرت استاذ سے روایات سنیں اور انہوں نے استاد محترم سے فرمائش کر دی، امام صاحبؒ نے سختی سے انکار کیا تو اس نے پھر فرمائش کی جس پر امام مالکؒ نے ہشام بن عمارؒ کو اپنے اور شاگرد سے سزا کے طور پر پندرہ چھڑیاں لگوا دیں، بعد میں امام صاحبؒ کو خیال آیا کہ چھڑیوں کی یہ سزا انہیں دینی چاہیے تھی تو ہشام بن عمارؒ سے معذرت خواہی کی مگر ہشامؒ نے معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیا، امام مالکؒ نے دوبارہ بات کی تو ہشام بن عمارؒ نے شرط لگا دی کہ اگر آپ

پندرہ چھڑیوں کے عوض مجھے پندرہ احادیث سنا دیں تو میں آپ کو پندرہ چھڑیوں کی یہ سزا معاف کر دوں گا، چنانچہ امام مالکؒ نے ہشام بن عمارؒ کو پندرہ حدیثیں سنائیں، اس پر ہشام بن عمارؒ نے گزارش کی کہ میں نے یہ طریق کار آپ سے حدیثیں سننے کیلئے اختیار کیا ہے اس لیے میں اس بات کیلئے تیار ہوں کہ آپ مجھے چھڑیاں مارتے جائیں اور ہر چھڑی کے عوض ایک حدیث سناتے جائیں۔

قاضی عیاضؒ نے ایک اور دلچسپ واقعہ بھی لکھا ہے کہ امام مالکؒ جب اپنی مجلس میں تشریف فرما ہوتے تھے تو آپ کے پہلو میں پردے کے پیچھے ایک خاتون محدثہ بیٹھتی تھی جس کا کام یہ ہوتا تھا کہ اگر سبق کے دوران حدیث پڑھنے والے نے کوئی غلطی کر دی ہے اور امام مالکؒ کی اس طرف توجہ نہیں ہوئی تو وہ خاتون محدثہ تپائی پر ہاتھ مار کر خبردار کرتی تھی کہ غلطی ہوگئی ہے، اس پر امام مالکؒ شاگرد سے وہ حدیث دوبارہ پڑھواتے اور غلطی چیک ہو جاتی، یہ خاتون محدثہ جو استاذ اور شاگرد دونوں کو چیکنگ کیلئے پردے کے پیچھے بیٹھا کرتی تھی خود امام مالکؒ کی اپنی بیٹی تھیں جو اس درجہ کی محدثہ تھیں کہ استاذ اور شاگرد دونوں کو چیک کیا کرتی تھیں، قاضی عیاضؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ کا بیٹا پڑھ نہیں سکا تھا اس لیے جب کبھی ان کا بیٹا مجلس کے سامنے سے گزرتا تو امام مالکؒ اس کی طرف اشارہ کر کے حسرت سے کہا کرتے تھے کہ دیکھو وہ میرا بیٹا ہے اور یہ میری بیٹی ہے۔

علم حدیث میں عورتوں نے بھی بڑا کمال حاصل کیا ہے اور بے شمار خواتین نے علم حدیث کی خدمت کی ہے، آکسفورڈ میں ہمارے ایک فاضل دوست مولانا محمد اکرم ندوی امت کی محدثات کے حالات جمع کرنے میں مصروف ہیں، گزشتہ سال انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اب تک چھ ہزار کے لگ بھگ محدثات کے حالات جمع کر چکے ہیں جو دس ضخیم جلدوں کی صورت میں شائع ہوں گے، عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حدیث کی روایت کے دونوں طریقے ہیں اور میں آج دونوں طریقوں پر عمل کرنا چاہتا ہوں، ایک روایت آپ کو

سناؤں گا اور ایک روایت آپ سے سنوں گا تاکہ دونوں طریقوں پر ہمارا عمل ہو جائے، سنانے کیلئے میں نے جس حدیث کا انتخاب کیا ہے وہ ''مسلسل بالأولیۃ'' کے عنوان سے معروف ہے مگر اس سے قبل اپنی حدیث کی سند کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں، بحمد اللہ تعالیٰ مجھے مختلف شیوخ سے روایت حدیث کی اجازت حاصل ہے۔

میرے حدیث کے بڑے استاذ میرے والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ ہیں جن سے میں نے بخاری شریف پڑھی ہے، وہ شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے شاگرد ہیں۔

دوسرے بڑے استاذ عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ ہیں جن سے میں نے مسلم شریف پڑھی ہے، وہ حضرت مدنیؒ اور حضرت مولانا ابراہیم بلیاویؒ کے شاگرد ہیں۔

تیسرے استاذ حضرت مولانا عبدالقیوم ہزارویؒ ہیں جن سے میں نے ابوداؤد شریف پڑھی ہے۔ چوتھے استاذ حضرت مولانا جمال احمد بنوی دامت برکاتہم ہیں جو شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ کے شاگرد ہیں، صحاح ستہ کی ساری کتابیں میں نے انہی اساتذہ سے پڑھی ہیں اور ان کی وساطت سے مجھے ہندوستان کے تین بڑے مراکز علماء فرنگی محل، دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور سے بالواسطہ تلمذ کا شرف حاصل ہے جبکہ انکے علاوہ میرے حدیث کے شیوخ میں درج ذیل اکابر بھی شامل ہیں۔ مکہ مکرمہ میں انڈونیشیا سے تعلق رکھنے والے شافعی المذہب محدث گزرے ہیں جو اپنے دور کے مسند العصر تھے الشیخ المحدث محمد یاسین الفادانی رحمہ اللہ تعالیٰ ان کی خدمت میں مولانا منظور احمد چنیوٹی اور مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے استاذ مولانا سیف الرحمن مکی کے ہمراہ مجھے حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، حضرت شیخؒ نے ہمیں متعدد سلسلات سنائیں جن میں وہ ''مسلسل بالأولیۃ'' بھی ہے جو ابھی میں آپ کے سامنے پڑھوں گا، حضرت شیخؒ نے ہمیں زبانی اور تحریری طور پر اپنی اسناد کے ساتھ روایت حدیث کی اجازت دی۔

شام کے معروف محقق اور حنفی محدث الشیخ المحدث عبدالفتاح ابو غدۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں مجھے لندن میں مولانا عیسیٰ منصوری اور مولانا محمد اکرم ندوی کے ہمراہ حاضری کا شرف حاصل ہوا، انہوں نے امام بخاریؒ کی ''الأدب المفرد'' کی ابتدائی چند روایات مجھ سے سنیں اور اپنی تمام اسناد کے ساتھ روایت حدیث کی اجازت مرحمت فرمائی جبکہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے مجھے تحریری طور پر اپنی اسناد کے ساتھ روایت حدیث کی اجازت مرحمت فرمائی ہے، اس کے بعد میں آپ کے سامنے ''مسلسل بالأولیۃ'' روایت پڑھتا ہوں جس میں مجھ سے لیکر حضرت سفیان بن عیینہؒ تک یہ تسلسل موجود ہے کہ ہر شاگرد نے اپنے استاذ سے پہلی روایت یہی سنی ہے، یہ روایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْكُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ'' رحم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ تبارک وتعالیٰ رحم فرماتے ہیں، تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

اس کے بعد مولانا زاہد الراشدی نے یہ روایت سند کے ساتھ طلبہ کو پڑھ کر سنائی اور ایک طالب علم نے بخاری شریف کی پہلی روایت پڑھی جس پر انہوں نے کہا کہ آپ نے بخاری شریف کی پہلی روایت پڑھی ہے اس پر بہت سی باتیں تو آپ کے استاذ محترم آپ کو بتائیں گے اور یہ انہی کا حق ہے البتہ دو باتیں بطور اشارہ میں بھی آپ سے عرض کر دیتا ہوں۔

ایک یہ کہ امام بخاریؒ نے ''بدء الوحی'' سے کتاب کا آغاز کیا ہے، یہ بتانے کیلئے کہ ہمارے تمام معاملات کی بنیاد وحی الٰہی ہے، اس کے بعد کتاب الایمان ہوگی، پھر کتاب العلم ہوگی، پھر عبادات، معاملات، اخلاق اور دیگر امور کے ابواب ہوں گے، امام بخاریؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایمان عقیدہ سے لیکر اخلاق وعادات تک ہمارے سارے معاملات

وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی روشنی میں طے ہوتے ہیں، آج کے عالمی ماحول میں یہ بات بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اس لیے کہ آج کی دنیا میں سب سے بڑا جھگڑا ہی یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی اپنے فیصلے خود کرنے میں آزاد ہے یا اس کیلئے آسمانی تعلیمات کی پابندی ضروری ہے اس تنازعہ میں دنیا کی اکثر قومیں ایک طرف ہیں جنہوں نے آسمانی تعلیمات کو اپنی عملی اور اجتماعی زندگی سے بے دخل کر دیا ہے جبکہ ہم مسلمان دوسری طرف ہیں جن کا موقف یہ ہے کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں میں آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کے پابند ہیں، اس پس منظر میں امام بخاریؒ کا یہ اشارہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ انہوں نے ایمان، علم اور عبادت کے ابواب سے پہلے بدء الوحی کا باب قائم کر کے بتا دیا ہے کہ ہم مسلمان عقیدہ وعلم سمیت ہر معاملہ میں وحی الٰہی سے ہی راہنمائی حاصل کرتے ہیں اور اسی کو پوری نسل انسانی کیلئے راہ نجات سمجھتے ہیں۔

دوسرا اشارہ امام بخاریؒ نے ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَات'' کو پہلی روایت کے طور پر بیان کر کے کیا ہے کہ ایمان وعمل کے ہر معاملہ میں اصل دارومدار نیت پر ہے اور ہر عمل کا نتیجہ انسان کی نیت کے مطابق مرتب ہوگا، نیت کی مثال یوں سمجھ لیجئے جیسے بیج ہوتا ہے، جس چیز کا بیج آپ زمین میں ڈالیں گے پھل بھی اسی کا حاصل کریں گے اور جیسا بیج ہوگا پھل بھی ویسا ہی ہوگا اس طرح امام بخاریؒ ہمیں یہ بات سمجھا رہے ہیں کہ بخاری شریف کے سبق کے آغاز سے قبل اپنی نیتوں کو ٹٹول لو اور ان کی اصلاح کرلو کیونکہ نیت صحیح ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب ہوگی تو ثمرہ اس کے مطابق حاصل ہوگا اور اگر خدانخواستہ نیت میں کوئی خرابی ہے تو اچھے سے اچھا عمل بھی بے کار ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں خلوص نیت، توجہ اور دلجمعی کے ساتھ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم حاصل کرنے اور اس کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائیں آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

قادیانیوں سے متعلق علماء اسلام کا موقف

"15-16 اکتوبر 2009ء کو چناب نگر میں دو روزہ سالانہ ختم نبوت کانفرنس سے خطاب"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْن

اما بعد!

تمہیدی کلمات:

میرے لئے یہ سعادت کی بات ہے کہ تحفظ عقیدۂ ختم نبوت کے مقدس مقصد کے لئے منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں شریک ہوں اور اس سے زیادہ خوشی کی بات ہے کہ تحریک ختم نبوت کے قافلہ کے سالار حضرت مولانا خواجہ خان محمد دامت برکاتہم کو کئی برسوں کے بعد اس سٹیج پر دیکھ رہا ہوں اور ان کی زیارت کر رہا ہوں وہ ہمارے بزرگ ہیں، مخدوم ہیں اور اس محاذ پر ہمارے قائد ہیں، ایک عرصہ سے صاحب فراش ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ وعاجلہ سے نوازیں اور صحت وعافیت کے ساتھ ان کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر سلامت رکھیں، آمین یارب العالمین۔

میں آج آپ حضرات کی وساطت سے جناب الطاف حسین (قائد ایم کیو ایم) اور جناب سلمان تاثیر (گورنر پنجاب) سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے گزشتہ دنوں تحفظ ناموس رسالت ﷺ کے قانون، قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے اور اسلام کے نام پر اپنے

مذہب کی تبلیغ سے روکنے کے قوانین پر اعتراض کیا ہے اور ان قوانین کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

میری معلومات کے مطابق تحفظ ناموس رسالت ﷺ اور امتناع قادیانیت کے قوانین کے بارے میں اس وقت اعلیٰ سطح پر لابنگ ہو رہی ہے اور بین الاقوامی لابیاں حدود آرڈیننس کی طرح ان دو قوانین کو ختم کرانے کے لئے بھی پوری طرح متحرک ہیں، پارلیمنٹ کی قائم کردہ خصوصی کمیٹی اس وقت ملک کے دستور کا عمومی جائزہ لے رہی ہے، اس پر شق وار غور کیا جا رہا ہے، اور ترامیم تجویز کی جا رہی ہیں گویا پورے دستور کی ''اوور ہالنگ'' ہونے جا رہی ہے اور مختلف حلقوں کی طرف سے دستور میں متعدد ترامیم تجویز کی گئی ہیں جن میں تحفظ ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالت ﷺ کے قوانین کے ساتھ ساتھ قرارداد مقاصد کو دستور کا حصہ بنانے والی دفعہ اور دیگر اسلامی دفعات بھی شامل ہیں اور سیکولر حلقوں کی مسلسل کوشش ہے کہ دستور کی اسلامی دفعات کو دستور سے نکال دیا جائے یا کم از کم غیر مؤثر بنا دیا جائے۔

میں ان میں سے دو مسئلوں یعنی تحفظ ناموس رسالت ﷺ اور تحفظ عقیدۂ ختم نبوت کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا، ان قوانین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ انسانی حقوق کے منافی ہیں، امتیازی قوانین ہیں، ان کا استعمال غلط ہو رہا ہے اور ان قوانین کو باہمی دشمنیوں اور انتقامی کارروائیوں کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے اس لئے ان قوانین کو ختم کیا جانا چاہیے اور ہمارے دو اہم سیاسی راہنماؤں جناب الطاف حسین اور جناب سلمان تاثیر نے بھی اسی قسم کی باتیں کہی ہیں۔

جہاں تک انسانی حقوق کا تعلق ہے میں آج تک نہیں سمجھ پایا کہ جناب نبی اکرم ﷺ یا دیگر انبیاء کرام علیہم السلام یا قرآن کریم یا مذہبی شعائر کی توہین کو جرم قرار دینے اور اس پر سزا مقرر کرنے کا انسانی حقوق کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کے

رسول ﷺ، قرآن کریم یا مذہب کی توہین اب حقوق میں شامل ہوگئی ہے؟ کل تک تو یہ جرائم میں شمار ہوتی تھی، اب بھی ایک عام شخص کی توہین کو جرم سمجھا جاتا ہے، ملک کے کسی بھی شہری کی توہین قانوناً جرم ہے اور ہر شخص کو اپنی توہین پر عدالت سے رجوع کا حق حاصل ہے اور قانون اسے تحفظ فراہم کرتا ہے، میرا سوال یہ ہے کہ ایک عام شہری کی توہین تو قانوناً جرم ہے، کیا نعوذ باللہ جناب نبی اکرم ﷺ کی توہین جرم نہیں ہے؟ اور اگر ایک عام شہری کی بلاوجہ توہین پر سزا دی جا سکتی ہے تو جناب نبی اکرم ﷺ کی توہین پر سزا کیوں نہیں دی جا سکتی؟ دنیا کے ہر ملک کی طرح ہمارے ملک میں ایک قانون موجود ہے جسے ''ازالہ حیثیت عرفی'' کا قانون کہتے ہیں میں اس معاشرے میں رہتا ہوں میں ایک عرفی حیثیت اور اس سوسائٹی میں میرا ایک سٹیٹس ہے جس کے تحفظ کا مجھے قانوناً حق حاصل ہے، کوئی شخص اگر میری اس عرفی حیثیت اور سٹیٹس کو مجروح کرتا ہے تو مجھے حق ہے کہ میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں اور قانون اس بات کے لئے مجھے تحفظ فراہم کرتا ہے، میں تحفظ ناموس رسالت ﷺ کے قانون کو انسانی حقوق کے منافی قرار دینے والوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ میرے بھائی! آپ کی حیثیت عرفی تو ہے، میری بھی ایک حیثیت عرفی ہے جسے مجروح کرنے کا کسی کو کوئی حق حاصل نہیں ہے تو کیا نعوذ باللہ جناب نبی اکرم ﷺ کی کوئی حیثیت عرفی نہیں ہے جسے مجروح کرنا جرم ہو اور اس پر سزا دی جا سکے؟

آج کوئی شخص کسی پولیس مین کی وردی کی توہین کرے، اس کے کندھے پر لگے ہوئے سٹار کی توہین کرے تو یہ جرم ہے کسی فوجی کی وردی کی توہین جرم ہے اور اس کے سٹار کی توہین جرم ہے، قومی پرچم کی توہین جرم ہے، قائداعظم کی توہین جرم ہے، قومی علامتوں کی توہین جرم ہے اور ان پر باقاعدہ سزائیں مقرر ہیں تو کیا قرآن کریم، جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی اور اسلام کے مذہبی شعائر کی توہین نعوذ باللہ جرم نہیں ہے؟ اور ان پر کسی کو سزا دینا امتیازی قانون اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کیسے قرار پاتا ہے؟ میں اہل دانش

کو سنجیدگی کے ساتھ اس بات پر غور کی دعوت دیتا ہوں۔

کسی قانون کا غلط استعمال اس کو ختم کرنے کی دلیل ہے؟

ان قوانین کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان کا عام طور پر غلط استعمال ہوتا ہے اور ان قوانین کے ذریعے مختلف گروہ اور طبقات ایک دوسرے کو ذلیل کرنے اور انتقام لینے کے لئے استعمال کرتے ہیں جبکہ توہین رسالت ﷺ کی سزا موت ہے اور یہ سخت ترین سزا ہے اس لئے اسے ختم ہونا چاہیے میں ان دوستوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا کسی قانون کا غلط استعمال اس کو ختم کرنے کی دلیل بن جاتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پاکستان میں کوئی قانون باقی نہیں رہنا چاہیے اس لئے کہ ہمارے ہاں ہر قانون کا غلط استعمال ہوتا ہے، یہ ہمارا غلط معاشرتی رویہ ہے جس کی اصلاح کے لئے معاشرتی اصلاح کی تحریک کی ضرورت ہے۔

ہمارے ہاں قتل کے جرم کی سزا بھی موت ہے اور اس کے لئے دفعہ 302 کا قانون نافذ ہے میرا سوال یہ ہے کہ کیا ملک بھر میں موت کی سنگین سزا والے اس قانون کا غلط استعمال نہیں ہوتا؟ اس دفعہ کے تحت ملک بھر کے قانون میں درج مقدمات کا جائزہ لیا جائے تو اس کی صورت حال بھی یہ ہے کہ لوگ اسے انتقامی کاروائیوں کے لئے استعمال کرتے ہیں، اس میں غلط نام لکھوائے جاتے ہیں، مخالفین کو خواہ مخواہ امیں پھنسا دیا جاتا ہے اور میرے اندازے کے مطابق اس دفعہ کا پچاس فی صد بھی صحیح استعمال نہیں ہو رہا تو موت کی سنگین سزا اور قانون کے غلط استعمال کا بہانہ بنا کر اس قانون کو ختم کر دیا جائے گا۔

میرا ان دوستوں سے سوال یہ ہے کہ پاکستان کے کون سے قانون کا غلط استعمال نہیں ہو رہا؟ اور قانون تو قانون ہے کیا دستور کا غلط استعمال نہیں ہو رہا؟ غریب دستور کا حال تو یہ ہے کہ جس ڈکٹیٹر کا جی چاہتا ہے اس کی ٹانگ اور کان مروڑ دیتا ہے تو کیا پاکستان سے دستور اور تمام قوانین کی چھٹی کرا دی جائیگی؟

قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے اور اسلام کے نام پر جھوٹے مذہب کی اشاعت سے روکنے کے قوانین کے بارے میں عام طور پر دو مغالطے پائے جاتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ الطاف حسین صاحب بھی انہی دو مغالطوں کا شکار ہیں ایک یہ کہ قادیانی مسئلہ بھی مسلمانوں کے باہمی اختلافات کی طرح کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ ہے اور دوسرا یہ کہ چلو وہ کافر ہی سہی مگر ان کے شہری حقوق تو ہیں اور مذہبی حقوق تو ہیں انہیں ان حقوق سے کیوں محروم رکھا جا رہا ہے؟

قادیانیوں کے ساتھ اختلاف فرقہ وارانہ نہیں الگ مذہب کا ہے:

میں ان دونوں مغالطوں کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں، پہلی بات یہ کہ قادیانیوں کا مسئلہ مسلمانوں کے باہمی فرقوں کے اختلافات کی طرح کا نہیں ہے مسلمانوں کے باہمی اختلافات بہت ہیں، مگر ان میں سے کوئی فرقہ کسی نئی وحی کی بات نہیں کرتا اور کسی نئے نبی کی بات نہیں کرتا اور کسی بھی مسئلہ میں اپنی آخری دلیل قرآن کریم سے اور جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات سے پیش کرتا ہے جبکہ قادیانی گروہ نئی وحی کا قائل ہے اور نئے نبی کی بات کرتا ہے ان کے نزدیک کسی بھی مسئلہ میں آخری دلیل اور اتھارٹی مرزا غلام احمد قادیانی ہے اور یہ مذاہب کا طے شدہ اصول ہے کہ وحی بدل جائے، نبی بدل جائے اور دلیل کی آخری اتھارٹی بدل جائے تو مذہب تبدیل ہو جاتا ہے، نئی وحی نئے اور نئی اتھارٹی کے ساتھ نیا مذہب وجود میں آتا ہے اس لئے قادیانیوں کا مسئلہ فرقہ وارانہ نہیں ہے الگ مذہب کا ہے اور قادیانی گروہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ نہیں ہے ایک الگ مذہب رکھتا ہے اور اسکے ساتھ ایک الگ مذہب کے طور پر ہی معاملات طے کئے جائیں گے۔

قادیانیوں کا مسئلہ حقوق کے ٹائیٹل کا ہے:

دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ چلو قادیانی کافر ہی سہی مگر انکے مذہبی اور شہری حقوق سے کیوں انکار کیا جا رہا ہے؟ اور انہیں ان کے جائز حقوق کیوں نہیں دیے جا رہے،؟ الطاف حسین نے

اسی حوالہ سے قادیانیوں کو مظلوم قرار دیا ہے اور ان کی حمایت کا اعلان کیا ہے۔

میری گزارش یہ ہے کہ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے اور بہت بڑا دھوکہ ہے جس کا جال پوری دنیا میں قادیانیوں نے پھیلا رکھا ہے اور وہ عالمی سطح پر بھی دنیا کو یہی فریب دے رہے ہیں جبکہ اصل مسئلہ حقوق کا نہیں بلکہ حقوق کے ٹائیٹل کا ہے، ہمیں اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ایک غیر مسلم اقلیت کے طور پر قادیانیوں کے شہری اور مذہبی حقوق سے کوئی انکار نہیں ہے جب ہم ہندوؤں کے مذہبی حقوق سے انکار نہیں کرتے، عیسائیوں کے مذہبی حقوق پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے اور سکھوں کی مذہبی سرگرمیوں پر ہم معترض نہیں ہوتے تو قادیانیوں کے جائز مذہبی حقوق سے ہم کیوں انکار کریں گے؟

قادیانی کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں تم کافر ہو:

ہمارے معاشرے میں عیسائی، ہندو، سکھ اور دوسرے مذاہب کے لوگ اپنی مذہبی سرگرمیاں دن رات جاری رکھے ہوئے ہیں اور بسا اوقات یہ اپنی حدود سے تجاوز بھی کر جاتے ہیں مگر ہم نے کبھی مزاحمت نہیں کی قادیانی بھی ان مذاہب کی طرح اپنی مذہبی سرگرمیاں جائز حدود میں کرنا چاہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن قادیانی اس معروضی حقیقت کو تسلیم نہیں کر رہے کہ وہ مسلمانوں سے الگ ایک نئے مذہب کے پیروکار ہیں، وہ نہ دستور اور پارلیمنٹ کا فیصلہ مان رہے ہیں، نہ عدالت عظمیٰ کے فیصلے کو تسلیم کر رہے ہیں اور نہ ہی پوری دنیا کی امت مسلمہ کے اجماعی فیصلوں کو قبول کر رہے ہیں اور وہ ایک غیر مسلم اقلیت کے طور پر حقوق طلب کرنے کی بجائے مسلم اکثریت والے حقوق کا تقاضہ کر رہے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور پاکستان کی باقی ساری آبادی کافر ہے اس لئے مسلمانوں والے حقوق انہیں الاٹ کر دیے جائیں، وہ مسلم اکثریت کے حقوق کے طلبگار ہیں جو کسی صورت میں ممکن نہیں ہے، آخر میں اپنے نام پر کسی اور کو کاروبار کا حق کیسے دے سکتا ہوں؟ کوئی شخص میرے نام پر کمپنی بنائے، دوکان کھولے یا کوئی ادارہ قائم کرے تو

میں کبھی اسے برداشت نہیں کروں گا جب میں اپنے نام پر کسی اور کو کاروبار کرنے کا حق نہیں دیتا تو اپنے نام پر کسی کو نیا مذہب بنانے کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں، یہ کل بھی ممکن نہیں تھا، آج بھی ممکن نہیں ہے اور قیامت تک ممکن نہیں ہوگا۔ الطاف حسین بھی نوٹ کر لیں سلمان تاثیر بھی اس حقیقت کو سمجھ لیں اور قادیانی حضرات بھی اس معروضی حقیقت کا اچھی طرح ادراک کر لیں کہ اصل مسئلہ ان کے حقوق کا نہیں بلکہ حقوق کے ٹائیٹل کا ہے ایک غیر مسلم اقلیت کے طور پر ان کے سارے جائز حقوق تسلیم ہیں اور ان کا مکمل احترام کیا جائے گا لیکن مسلمانوں کے نام پر اور اسلام کے ٹائیٹل کے ساتھ ہم انکے کسی حق کو تسلیم نہیں کرتے اور ان کا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا کہ وہ مسلمان کہلا کر اس ملک میں حقوق حاصل کر سکیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

منصب رسالت کا سب سے نمایاں پہلو

اتھارٹی

"18 مارچ 2012ء کو پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ علوم اسلامی میں سیرت کانفرنس سے خطاب"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اما بعد!

آج کی اس کانفرنس کا موضوع سیرت النبی ﷺ ہے اور جناب رسالت مآب ﷺ کے منصب رسالت کو گفتگو کے لئے منتخب کیا گیا ہے، سیرت نبوی ﷺ کے ہزاروں پہلو ہیں جو گفتگو کے لئے توجہ کو کھینچتے ہیں اور منصب کے بھی بیسیوں پہلو ایسے ہیں جن پر گفتگو کی جا سکتی ہے اور جن پر گفتگو کی ضرورت محسوس ہوتی ہے لیکن میں منصب کو "اتھارٹی" کے مفہوم پر فوکس کرتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جناب نبی اکرم ﷺ دین کے تمام شعبوں میں اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسے چند مثالوں کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو جناب نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوا اور قیامت تک نسل انسانی کی راہ نمائی اس سے وابستہ ہے مگر قرآن کریم تک ہماری رسائی کا ذریعہ جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے اور

آنحضرت ﷺ کی وساطت کے بغیر نہ ہم قرآن کریم کے الفاظ تک پہنچ سکتے ہیں، نہ اس کی ترتیب وجمع تک ہماری رسائی ممکن ہے اور نہ ہی اس کے مفہوم اور اس کے الفاظ اور جملوں سے اللہ تعالیٰ کی منشا و مراد کو معلوم کر لینا رسول اللہ ﷺ سے راہ نمائی حاصل کیے بغیر ہمارے بس میں ہے۔

مثلاً ہم یہ بات مانتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن کریم کی سب سے پہلی آیات جو نازل ہوئیں وہ سورہ اقرأ کی پہلی پانچ آیات ہیں اور جناب نبی اکرم ﷺ پر اترنے والی سب سے پہلی وحی یہی پانچ آیات ہیں لیکن یہ بات معلوم ہونے کا واحد ذریعہ نبی اکرم ﷺ ہیں کہ انہوں نے ہمیں غار حراء کا واقعہ بتایا اور اپنے غار حراء میں عبادت کے لئے جانے کی تفصیلات بتاتے ہوئے فرمایا کہ غار میں فرشتہ آیا تھا اور اس نے مجھے یہ پانچ آیات سنائیں اور پڑھنے کے لئے کہا۔

اگر غار حراء کے واقعہ کو نہ مانا جائے اور اس پر یقین نہ ہو تو ان پہلی پانچ آیات تک ہماری رسائی ممکن نہیں ہے اور نہ ہی غار حراء کے واقعہ اور جناب نبی اکرم ﷺ کی بیان کردہ تفصیلات کو تسلیم کیے بغیر ہم ان آیات پر ایمان لا سکتے ہیں۔

اسی طرح ہمارا ایمان ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے جو قرآن کریم مصحف کی صورت میں موجود ہے اور جسے دنیا بھر کے مسلمان پڑھتے ہیں، وہی اصلی قرآن کریم ہے اور اسی پر جناب نبی اکرم اپنی امت کو چھوڑ کر گئے ہیں، یہ قرآن کریم اس طرح کتابی شکل میں جناب نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ میں موجود نہیں تھا بلکہ رسول اکرم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے دور خلافت میں حضرت عمرؓ کی تجویز وتحریک پر حضرت زید بن ثابتؓ نے قرآن کریم کو موجودہ کتابی صورت میں تحریر کیا، جناب نبی اکرم ﷺ کے دور میں قرآن کریم کو یاد کرنے کا ذوق زیادہ تھا اور سینکڑوں حفاظ کرام صحابہؓ موجود تھے، اس لئے لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، ویسے بھی نبی اکرم ﷺ نے وصال تک وحی جاری تھی اور قرآن

کریم کی مکمل صورت نے حضور علیہ السلام کے وصال کے بعد ہی سامنے آنا تھا۔

یہاں حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلویؒ کے بیان کردہ ایک نکتہ کا ذکر کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے قرآن کریم کی سورۃ کی آیت کریمہ ''بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ'' کے ضمن میں لکھا ہے کہ قرآن کریم کی اصل جگہ سینہ ہے اور کتابت امر زائد ہے، اس کا مفہوم میں اپنے انداز میں یوں بیان کیا کرتا ہوں کہ کتابت قرآن کریم کی ضروریات میں سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ہماری کمزوریوں سے ہے کہ جو یاد نہ کرسکتا ہو وہ لکھا ہوا دیکھ کر پڑھ لے۔

بہرحال اس ضرورت کو سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے محسوس کیا اور خاص طور پر انہیں اس صورت حال نے اس بات کا احساس دلایا کہ حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں ہونے والی جنگوں میں حافظ قرآن کریم صحابہ کرامؓ کی کثرت سے شہادتوں کی خبریں آرہی تھیں حتیٰ کہ صرف مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں ستر صحابہ کرام شہید ہو گئے، اس پر حضرت عمرؓ نے خدشہ محسوس کیا اور حضرت صدیق اکبرؓ سے عرض کیا کہ قرآن کریم کا ایک نسخہ لکھوا کر محفوظ کرلیا جائے، حضرت ابوبکرؓ کو پہلے اس کام میں تردد تھا مگر بعد میں انہوں نے اس تجویز کو قبول کرلیا اور جناب نبی اکرم ﷺ کے سب سے بڑے کاتبِ وحی حضرت زید بن ثابتؓ کو بلا کر انہیں حکم دیا کہ وہ قرآن کریم کو مکمل کتابی شکل میں تحریر کردیں، چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ نے قرآن کریم لکھنا شروع کردیا، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اصول طے کیا کہ وہ آیت کریمہ قرآن پاک میں درج کروں گا جس پر کم از کم دو صحابی رضی اللہ عنہ شہادت دیں گے کہ انہوں نے بھی یہ آیت جناب نبی اکرم ﷺ سے اسی طرح سنی ہے، حضرت زید بن ثابتؓ خود قرآن کریم کے حافظ تھے بلکہ نبی اکرم ﷺ کے دورِ مبارک میں قرآن کریم کا بیشتر حصہ ان کے قلم سے لکھا گیا تھا لیکن انہوں نے طے کیا کہ وہ اپنے علاوہ کم از کم دو اور گواہ صحابہ کرامؓ میں سے ہر آیت اور سورۃ پر تلاش کریں گے تاکہ غلطی کا کوئی امکان نہ رہے۔

چنانچہ صحابہ کرامؓ سے وسیع پیمانے پر رابطے اور رجوع کر کے انہوں نے اس فارمولے پر قرآن کریم لکھنا شروع کیا اور جب پورے قرآن کریم کی کتابت مکمل کر لی تو معلوم ہوا کہ دو آیات ایسی ہیں جن پر صرف ایک گواہ مل رہا ہے اور دوسرا گواہ دستیاب نہیں ہے، ایک سورۃ توبہ کی آخر سے پہلی آیت ''لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ'' والی ہے اور دوسری سورۃ احزاب کی آیت نمبر 23 ''رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا اللهَ عَلَيْهِ'' والی ہے ان آیات پر صرف ایک گواہ مل رہا ہے اور وہ حضرت خزیمہ بن ثابت انصاریؓ ہیں جبکہ دوسرا گواہ دستیاب نہیں ہو رہا البتہ حضرت خزیمہ بن ثابتؓ وہ بزرگ ہیں جن کی گواہی کو ایک مقدمہ میں جناب نبی اکرم ﷺ نے دو گواہوں کے برابر قرار دیا تھا اس لئے حضرت ابوبکرؓ کے مشورہ اور ہدایت کے مطابق ان کی گواہی کو ڈبل گواہی قرار دے کر قرآن کریم کی کتابت مکمل کر لی گئی اور قرآن کریم کے اس مکتوب مصحف کو مسجد نبوی میں ایک ستون کے ساتھ عام مسلمانوں کی راہ نمائی اور استفادہ کے لئے رکھوا دیا گیا جو آج بھی ''استوانہ مصحف'' کے نام سے معروف ہے۔

میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ قرآن کریم جو مصحف کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے اور دنیا بھر میں یہی پڑھا جا رہا ہے حضرت زید بن ثابتؓ کا تحریر کردہ ہے مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ قرآن کریم کو مرتب صورت میں لکھنے کے لئے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا سورس اور ماخذ کیا تھا؟ انہوں نے قرآن کریم کی جو آیات اور سورتیں جناب نبی اکرم ﷺ سے خود سنی تھیں اور جن کے بارے میں دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بتایا کہ انہوں نے یہ آیات اور سورتیں جناب نبی اکرم ﷺ سے سنی ہیں وہی آیات اور سورتیں اس مرتب کتاب کی شکل اختیار کر گئیں اور قرآن کریم کی کسی بھی سورۃ آیت یا جملے تک رسائی کا ہمارے لئے واحد ذریعہ جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی قرار پائی، اس لئے میں ایک بات عام طور پر عرض کیا کرتا ہوں کہ بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ قران کریم کے بعد کیا حدیث

نبوی ﷺ پر ایمان رکھنا بھی ضروری ہے؟ میری گزارش یہ ہوتی ہے کہ قرآن کریم کے بعد نہیں بلکہ قرآن کریم سے پہلے حدیث نبوی ﷺ پر ایمان لانا ضروری ہے اس لئے کہ حدیث نبوی ﷺ پر ایمان نہ ہو تو قران کریم پر ایمان ممکن ہی نہیں ہے، اسی طرح یہ بھی دیکھ لیں کہ ہم سب یہ مانتے ہیں کہ قرآن کریم کی سب سے پہلے پانچ آیتیں نازل ہوئیں جو سورۃ اقرأ کا حصہ ہیں لیکن جب ہم قرآن کریم کھول کر اس کی تلاوت شروع کرتے ہیں تو سورۃ اقرأ کی ابتدائی پانچ آیات کی بجائے سورۃ الفاتحہ کی سات آیات سے تلاوت کا آغاز کرتے ہیں جبکہ سورۃ اقرأ موجودہ مصحف میں 96 نمبر پر پڑھی جاتی ہے، سوال یہ ہے کہ یہ ترتیب کیسے تبدیل ہوگئی؟ اور وہ کون سی اتھارٹی ہے جس نے سورۃ الفاتحہ کو پہلے نمبر پر اور سورۃ العلق کو 96 نمبر پر رکھ دیا؟ ظاہر بات ہے کہ یہ تبدیلی بھی جناب نبی اکرم ﷺ کے حکم سے عمل میں آئی ہے اور مصحف کی موجودہ ترتیب جناب نبی اکرم ﷺ کی قائم کردہ ہے اور اگر خدانخواستہ اس حوالہ سے جناب نبی اکرم ﷺ کی اتھارٹی اور آپ ﷺ کی حدیث کو نہ مانا جائے تو قرآن کریم کی موجودہ ترتیب کے ساتھ تلاوت کا کوئی جواز نہیں بنتا۔

حضرات محترم!

میں نے اس وقت تک یہ عرض کیا ہے کہ قرآن کریم پر ہمارا ایمان ہے لیکن اس کے الفاظ، جملوں، آیات، سورتوں اور ترتیب تک پہنچنے کے لئے ہمارے پاس واحد سورس اور مآخذ جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے اور قرآن کریم کی کسی بھی بات تک رسائی کے لئے نبی اکرم ﷺ ہی اتھارٹی بلکہ واحد اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بالکل اسی طرح قرآن کریم کی آیات اور جملوں کے مفہوم و معنیٰ اور ان میں اللہ تعالیٰ کی منشا و مراد کو معلوم کرنے کے لئے بھی ہمارے پاس واحد ذریعہ جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے، اس وجہ سے بھی کہ وہ ”رسول اللہ“ کے طور پر اللہ تعالیٰ کے نمائندہ ہیں اور نمائندہ جو بات بھی کہے وہ اس کی اپنی نہیں ہوتی بلکہ اس کی بات شمار کی جاتی ہے جس کا وہ

نمائندہ ہوتا ہے، کسی ادارے کا کوئی نمائندہ آپ کے پاس گفتگو کے لئے آئے تو آپ کو یہ حق تو حاصل ہے کہ اس کے نمائندہ ہونے کی تسلی کریں اور یہ بھی حق ہے کہ اسے نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیں لیکن اگر آپ اس کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے گفتگو شروع کر دیں تو پھر آپ کو اس کی کسی بات پر یہ پوچھنے کا حق نہیں رہتا کہ وہ یہ بات کس کی طرف سے کر رہا ہے؟ اس لئے کہ وہ نمائندہ ہونے کی حیثیت سے جو بات کر رہا ہے وہ اس کی نہیں بلکہ اس کے ادارے کی بات ہوگی، وہ اپنے ادارے سے پوچھ کر کر رہا ہے تب بھی وہ ادارے کی بات ہے اور اگر پوچھے بغیر کر رہا ہے تب بھی وہ بات ادارے ہی کی بات تصور کی جاتی ہے، اس لئے جس طرح قرآن کریم کی آیات، سورتوں اور ترتیب میں جناب نبی اکرم ﷺ اتھارٹی ہیں اسی طرح اس کے مفہوم اور اللہ تعالیٰ کی منشا کی وضاحت میں بھی نبی اکرم ﷺ کو واحد اتھارٹی کا درجہ حاصل ہے اور اگر قرآن کریم کی کسی سورت یا آیت کا کوئی مفہوم جناب نبی اکرم ﷺ نے اپنے قول یا عمل کی صورت میں طے کر دیا ہے تو وہی اس کا حتمی مفہوم ہے، اس بات کی تو بحث ہو سکتی ہے کہ روایت کا درجہ کیا ہے؟ سند کی حیثیت کیا ہے؟ اور اگر دو مختلف مفہوم مروی ہیں تو ترجیح کس کو ہے؟ مگر جناب نبی اکرم ﷺ کی طرف سے کسی آیت قرآنی کا مفہوم متعین صورت میں صحیح سند کے ساتھ سامنے آجائے تو پھر کسی بھی شخص کے لئے اس بات کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا کہ وہ اس آیت کا اپنی طرف سے کوئی مفہوم طے کرنے کی کوشش کرے اور فہم قرآن کے لئے کوئی اور معیار قائم کرنے کی کوشش کرے۔

اس اصولی بات کے بعد اس سلسلہ میں کچھ واقعاتی شہادتوں کی طرف توجہ دلانا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، احادیث کے ذخیرے میں بیسیوں ایسی شہادتیں موجود ہیں جن کے مطابق قرآن کریم کی آیت یا جملے کا مفہوم سمجھنے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دقت پیش آئی تو انہوں نے اس کی وضاحت کے لئے جناب نبی اکرم ﷺ سے رجوع کیا اور جب نبی

اکرم ﷺ نے ایک مفہوم بیان کر دیا تو اس کے بعد اس کی کسی مزید وضاحت کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی گئی، ان بیسیوں شہادتوں میں سے دو تین کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جن سے اس بات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

حضرت عدی بن حاتمؓ عیسائیت سے مسلمان ہوئے تھے، انہوں نے جب قرآن کریم پڑھا تو سورۃ توبہ کی اس آیت کریمہ نمبر 31 پر ذہن اٹک گیا کہ ''اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ '' عیسائیوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ تعالیٰ کے نیچے اپنا رب بنا لیا تھا اور مسیح بن مریم علیہ السلام کو بھی رب مانتے تھے، حضرت عدیؓ نے جناب نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم نے تو اپنے احبار و رہبان کو رب کا درجہ نہیں دیا تھا، قرآن کریم نے ہمارے بارے میں یہ کیا فرما دیا ہے؟ جناب نبی اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا تمہارے ہاں علماء و مشائخ کو یہ اتھارٹی حاصل تھی کہ وہ جس چیز کو چاہیں حلال قرار دے دیں اور جسے چاہیں حرام کر دیں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں یہ تو تھا اس پر جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ رب بنانے کا یہی مطلب ہے ویسے میں عرض کروں گا کہ آج بھی یہی صورت حال ہے کہ کیتھولک مسیحیوں کے ہاں اب بھی حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنے کی فائنل اتھارٹی پاپائے روم ہی ہیں جبکہ ہمارے ہاں اس کی صورت یہ ہے کہ اگر کسی شخصیت کو حلال و حرام میں اس قسم کا کوئی اختیار حاصل ہوتا تو اس کے لئے جناب نبی اکرم ﷺ سے زیادہ حق دار اور کوئی شخصیت نہیں ہو سکتی تھی لیکن جناب نبی اکرم ﷺ نے اپنی ذات کے لئے شہد کو حرام قرار دیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی ایک مستقل سورۃ التحریم کے ذریعہ ٹوک دیا ''لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ'' جو چیز اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے حلال کی ہے وہ آپ نے کیسے حرام کر دی ہے؟

یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم کی ایک آیت کے مفہوم و مصداق کے بارے میں صحابی رسول حضرت عدی بن حاتمؓ کو الجھن ہوئی تو اس کی وضاحت کے

لئے جناب نبی اکرم ﷺ سے انہوں نے رجوع کیا اور نبی اکرم ﷺ نے جو وضاحت فرما دی اس نے اس الجھن کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا، بسا اوقات قرآن کریم کی دو آیات بظاہر متضاد معلوم ہوتی ہیں اور دونوں کا ظاہری مفہوم ایک دوسرے کے خلاف دکھائی دیتا ہے، اس کی وضاحت کے لئے بھی نبی اکرم ﷺ ہی اتھارٹی ہیں۔

ترمذی شریف کی روایت کے مطابق ایک شخص نے حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ سے دریافت کیا کہ قرآن کریم میں جا بجا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تذکرہ موجود ہے اور اسے مسلمانوں کی دینی ذمہ داریوں میں شامل کیا گیا ہے لیکن سورۃ مائدہ کی آیت کریمہ نمبر 105 میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اے ایمان والو ''عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ الآية'' تم پر لازم ہے کہ اپنا فکر کرو اگر کوئی گمراہ ہوتا ہے تو اس کا تمہیں کوئی ضرر نہیں ہے، اگر تم ہدایت پر ہو تو۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ ایک طرف کہا جا رہا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو اور اس عمل کو ترک کرنے پر وعید سنائی جا رہی ہے اور دوسری طرف یہ کہا گیا ہے کہ تم پر صرف اپنا فکر کرنا ضروری ہے، حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ نے اس پر پہلی بات تو یہ فرمائی کہ ''علی الخبیر سقطت'' خبردار پر گرے ہو یعنی تم نے بات اس شخص سے پوچھی ہے جس کو یہ معلوم ہے اس لئے کہ جو اشکال تمہارے ذہن میں آیا ہے میرے ذہن میں بھی آیا تھا اور میں نے جناب نبی اکرم ﷺ سے پوچھ لیا تھا، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر حال میں کرتے رہو البتہ جب ایسا زمانہ آجائے کہ فتنوں کی کثرت کے باعث اپنا ایمان بچانا مشکل ہو جائے تو پھر پہلے اپنی فکر کرو، گویا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم عمومی ہے اور صرف اپنا فکر کرنے کا حکم مخصوص حالات میں ہے، اس طرح قرآن کریم کے دو حکموں میں بظاہر دکھائی دینے والے تعارض کی بات جناب نبی اکرم ﷺ کی وضاحت کے بعد ختم ہو گئی۔

بسا اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کریم کچھ اور کہہ رہا ہے اور جناب نبی

اکرم ﷺ کسی حدیث میں کچھ اور فرما رہے ہیں ایسی صورت میں بھی وضاحت کی اتھارٹی جناب نبی اکرم ﷺ ہی ہیں، بخاری شریف میں روایت ہے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک موقع پر جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''من حوسب عذب'' جس کا حساب کتاب ہوا اسے ضرور عذاب ہوگا، اس پر میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! قرآن کریم تو یہ کہتا ہے کہ جس کو نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں ملے گا ''فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا'' (سورۃ الانشقاق آیت نمبر 8) اس کا حساب آسان ہوگا اور وہ خوش خوش اپنے گھر والوں کے پاس واپس پلٹے گا بلکہ ایک جگہ قرآن کریم میں یہ ہے کہ ''فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتَابِيَهْ'' (سورۃ الحاقۃ آیت نمبر 19) وہ اپنے امتحان کا نتیجہ لوگوں کو پڑھاتا پھرے گا کہ میں کامیاب ہو گیا ہوں جبکہ آپ فرما رہے ہیں کہ جس کا حساب ہوا وہ عذاب سے نہیں بچے گا، بظاہر یہ قرآن کریم اور حدیث کا تعارض ہے کہ قرآن کریم کچھ اور کہہ رہا ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ اس سے مختلف بات فرما رہے ہیں، اس کی وضاحت بھی جناب نبی اکرم ﷺ سے مانگی گئی اور آپ ﷺ کی وضاحت کے بعد بات ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی، نبی اکرم ﷺ نے ایک جملے میں بات صاف کر دی کہ ''ذَاكِ الْعِرْضُ يَا عَائِشَةُ'' جس حساب کی تم بات کر رہی ہو وہ باقاعدہ حساب نہیں بلکہ صرف عدالت میں پیشی ہے ''اَمَّا مَنْ نُوْقِشَ فَقَدْ عُذِّبَ'' البتہ جس کا مناقشہ ہوا اور ریکارڈ کھول لیا گیا وہ عذاب سے نہیں بچے گا۔

حضرات محترم!

جناب نبی اکرم ﷺ کے منصب رسالت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ دین کے ہر معاملہ میں فائنل اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسے تسلیم کیے بغیر دین کا ڈھانچہ ہی سرے سے مکمل نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو نبی اکرم ﷺ کی اطاعت واتباع نصیب فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ

''25 جون 2003ء کو ''سیرت سٹڈی سنٹر'' سیالکوٹ چھاؤنی میں سیرت کانفرنس سے خطاب''

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اما بعد!

سیرت سٹڈی سنٹر کے ڈائریکٹر پروفیسر عبد الجبار شیخ صاحب اور ان کے رفقاء کا شکر گزار ہوں کہ آج کی اس محفل میں حاضری اور آپ دوستوں کے ساتھ ملاقات وگفتگو کا موقع فراہم کیا، اللہ تعالیٰ جزائے خیر سے نوازیں اور کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

سیرت سٹڈی سنٹر کے بارے میں کافی عرصہ سے سن رکھا تھا اور دیکھنے کا اشتیاق بھی تھا مگر ہر کام کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وقت مقرر ہے، آج اس کا موقع ملا ہے اور سنٹر کی عمارت اور سرگرمیاں دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ ایک اچھی لائبریری موجود ہے، طالبات کی ایم اے اسلامیات کی کلاس جاری ہے، طالبات ہی کیلئے عربی زبان، ترجمہ قرآن کریم اور سنت وسیرت کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر ٹریننگ کا تین سالہ کورس آخری سال میں ہے جس میں سو کے لگ بھگ طالبات شریک ہیں اور آج ہی آپ حضرات کے سامنے دو بچوں نے حفظ قرآن کریم کا پہلا سبق مجھ سے پڑھا ہے جس کے ساتھ سنٹر میں حفظ قرآن کریم کی کلاس کا بھی آغاز ہوگیا ہے، اس کے علاوہ پروفیسر عبد الجبار شیخ صاحب نے ابھی اعلان کیا ہے کہ سنٹر کی طرف

سے عام لوگوں تک سیرت نبوی ﷺ کا پیغام پہنچانے کیلئے عمومی مہم شروع کرنے کا پروگرام ہے اور اس کے آغاز کے طور پر اس سیرت کانفرنس کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مجھے یہ معلوم کرکے بہت زیادہ خوشی ہوئی ہے کہ یہ "سیرت سٹڈی سنٹر" سیالکوٹ کے ایوان صنعت وتجارت کی طرف سے قائم کیا گیا ہے اور اس کے انتظامات واخراجات کا اہتمام سیالکوٹ کی تاجر اور صنعتکار برادری چیمبر کے ذریعہ کر رہی ہے، سچی بات ہے کہ مجھے اس پر اس قدر خوشی ہوئی ہے کہ میں الفاظ میں اس کا اظہار کرنے سے قاصر ہوں اور سیالکوٹ کے تاجر اور صنعتکار حضرات کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے اس کار خیر کے ذریعہ اپنے ذخیرہ آخرت میں ہی اضافہ نہیں بلکہ ملک کے دوسرے شہروں کے تاجروں اور صنعتکاروں کیلئے بھی ایک لائق تقلید نمونہ پیش کیا ہے، خدا کرے کہ دوسرے شہروں کے ایوان ہائے صنعت وتجارت بھی اس طرح کے کار خیر کر کے آپ کے نقش قدم پر چلیں۔

مجھے گفتگو کیلئے جو عنوان دیا گیا ہے وہ ہے "تزکیہ وتربیت اور اسوہ رسول ﷺ" یعنی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرہ کی اصلاح اور انسانوں کی تربیت وتزکیہ کیلئے کیا طریق کار اختیار کیا اور نسل انسانی کو وہ کون سا پیغام دیا جس کے نتیجے میں صرف تیئیس سال کے عرصہ میں عربوں کا بگڑا ہوا معاشرہ پوری نسل انسانی کیلئے ایک مثالی اور آئیڈیل سوسائٹی کی حیثیت اختیار کر گیا۔

اس سلسلہ میں بہت کچھ عرض کیا جا سکتا ہے لیکن وقت کے اختصار کے باعث جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ وسیرت اور پیغام ومشن کے حوالہ سے صرف ایک پہلو پر مختصر گزارشات پیش کروں گا، وہ یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دنیا کے سامنے اپنا پیغام پیش کیا دنیا دو انتہاؤں کا شکار تھی، ایک طرف اس دنیا کو ہی سب کچھ سمجھ کر آخرت اور موت کے بعد کی زندگی سے بے پروا ہو کر انسانی سوسائٹی کا ایک بڑا حصہ اپنے مالک اور خالق کے حقوق سے بے گانہ ہو چکا تھا اور من مانی زندگی بسر کر رہا تھا اور دوسری طرف دنیا

کی ہر چیز سے کنارہ کش ہو کر رہبانیت کی زندگی گزاری جا رہی تھی، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں انتہاؤں کی نفی کی اور کہا کہ انسان کی اصل زندگی توازن میں ہے اور اسے اپنے مالک اور اس کے بندوں کے ساتھ تعلقات اور حقوق میں بیلنس قائم رکھنا چاہیے، خدا کی عبادت میں مگن ہو کر بندوں کے حقوق سے غافل ہو جانا بھی درست نہیں ہے اور بندوں کے حقوق اور معاملات میں الجھ کر خدا کی بندگی سے غافل ہو جانا بھی غلط بات ہے، یہ دونوں انتہا پسندانہ اور یکطرفہ سوچیں ہیں اور ''ون وے ٹریک'' ہیں جو فطرت کے خلاف ہے، انسانی زندگی کے تقاضوں کے خلاف ہے اس لیے انسان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور انسانی معاشرہ میں باہمی حقوق کی ادائیگی دونوں کی طرف توجہ دینی چاہیے اور دونوں کے حقوق پورے کرنے چاہییں۔ اس سلسلہ میں بخاری شریف کی ایک روایت کا حوالہ دینا چاہوں گا جس میں اس توازن اور بیلنس کو بہت بہتر انداز میں واضح کیا گیا ہے۔

امام بخاریؒ اپنی سند کے ساتھ یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت سلمان فارسیؓ جب مدینہ منورہ میں یہودیوں کی غلامی سے نجات حاصل کر کے مسلمان برادری میں شامل ہوئے تو ان کی حیثیت مہاجر کی تھی، اس لیے مواخاۃ کے طریقہ کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک انصاری صحابیؓ حضرت ابو الدرداءؓ کا بھائی بنا دیا، حضرت سلمان فارسیؓ عمر رسیدہ بزرگ تھے چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کا ارشاد ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ کی عمر کے بارے میں سب سے محتاط روایت یہ ہے کہ انہوں نے اڑھائی سو برس کی عمر پائی، اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جب اسلام قبول کیا تو وہ دو سو سال سے تجاوز کر چکے تھے، وہ پہلے مجوسی تھے، پھر عیسائی ہوئے، ایک لمبا عرصہ باخدا مسیحی پادریوں کے ساتھ گزارا، ایک خدا ترس عیسائی عالم ہی کی ترغیب پر نبی آخر الزمان کی تلاش میں نکلے اور خوش قسمتی سے ایک یہودی خاندان کے ہتھے چڑھ کر مدینہ منورہ جا پہنچے، تجربہ کار بزرگ تھے، جہاں دیدہ تھے، اس لیے جب حضرت ابو الدرداءؓ کے بھائی بن کر ان کے گھر پہنچے تو پہلی نظر

میں ہی گھر کا ماحول دیکھ کر انہوں نے محسوس کر لیا کہ میاں بیوی میں میاں بیوی والا کوئی معاملہ نہیں ہے، گھر میں عورت موجود ہو اور گھر سے اس کی دلچسپی ہو تو اس کا وجود گھر میں نظر آتا ہے اور آنے جانے والوں کو پتہ چلتا ہے کہ اس گھر میں کوئی عورت رہتی ہے، گھر کی صفائی، پردے، زیب و زینت اور خود بن سنور کر رہنا خاوند والی عورت کی فطرت ہے مگر حضرت سلمان فارسیؓ نے گھر میں یہ ماحول نہ دیکھا تو محسوس کر لیا کہ کوئی گڑبڑ ہے، بڑے تھے اور بزرگ تھے اس لیے بھاوج سے پوچھ ہی لیا کہ اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ حضرت ام الدرداءؓ نے جواب دیا کہ میں زیب و زینت کس کیلئے کروں؟ اور اچھے کپڑے کس کیلئے پہنوں؟ آپ کے بھائی کو تو ان معاملات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے، حضرت سلمان فارسیؓ سمجھ گئے کہ میاں بیوی میں ''انڈرسٹینڈنگ'' نہیں ہے، تھوڑی دیر گزری، دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو حضرت ابوالدرداءؓ نے دستر خوان بچھایا اور کھانا رکھ کر حضرت سلمان فارسیؓ سے کہا کہ کھانا تناول فرمائیے، انہوں نے کہا کہ آپ بھی آئیں تو جواب دیا کہ میں روزے سے ہوں، حضرت سلمان فارسیؓ نے اصرار کیا کہ آپ کھانے میں شریک ہوں گے تو میں کھاؤں گا ورنہ میں بھی نہیں کھاتا، حضرت ابوالدرداءؓ کو اپنے بھائی اور مہمان کی خاطر روزہ توڑنا پڑا، نفلی روزہ تھا جو مہمان کی خاطر توڑا جا سکتا ہے، دونوں بزرگوں نے کھانا کھایا، شام کا وقت ہوا تو رات کا کھانا کھایا اور عشاء کے بعد حضرت ابوالدرداءؓ نے حضرت سلمان فارسیؓ کیلئے بستر بچھایا اور آرام کرنے کیلئے کہا، انہوں نے پوچھا کہ آپ کا پروگرام کیا ہے؟ جواب دیا کہ میں رات بھر عبادت کیا کرتا ہوں، سلمان فارسیؓ نے کہا کہ بستر لائیے اور آپ بھی آرام کیجئے، انہوں نے بتایا کہ میرا معمول رات کو عبادت کا ہے تو حضرت سلمان فارسیؓ نے اصرار کر کے ان کا بستر لگوایا اور کہا کہ تھوڑی دیر آرام کریں، دونوں بزرگ لیٹ گئے، تھوڑی دیر گزری تو حضرت ابوالدرداءؓ اٹھے تاکہ عبادت میں مشغول ہوں تو حضرت سلمان فارسیؓ نے پھر آواز دی کہ ابھی وقت نہیں ہوا، اس لیے ابھی آرام کریں، حضرت ابوالدرداءؓ

پھر لیٹ گئے، جب آدھی رات کا وقت گزر گیا اور سحری کا وقت ہوا تو حضرت سلمان فارسیؓ اٹھے، حضرت ابو الدرداءؓ کو اٹھایا اور کہا کہ ابھی عبادت کا وقت ہے، اٹھیں اور عبادت کریں، دونوں بزرگوں نے تہجد کی نماز پڑھی اور پھر حضرت سلمان فارسیؓ نے بڑے پیار سے اپنے بھائی کو یہ کہہ کر سمجھایا کہ ''اِنَّ لِرَبِّكَ عَلَيْكَ حَقّاً. وَلِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقّاً. وَلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقّاً وَلِعَيْنَيْكَ عَلَيْكَ حَقّاً. وَلِزُوْرِكَ عَلَيْكَ حَقّاً فَاَعْطِ كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهٗ''۔ تیرے رب کا تجھ پر حق ہے، تیری بیوی کا تجھ پر حق ہے، تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے، تیری آنکھوں کا تجھ پر حق ہے، تیرے مہمان کا تجھ پر حق ہے اور دین اس کا نام ہے کہ ہر حق دار کو اس کا حق ادا کر۔ یہ کہہ کر کہا کہ اب ہم چلتے ہیں تاکہ فجر کی نماز مسجد نبوی میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادا کریں، دونوں حضرات گئے، نماز فجر ادا کی اور حضرت ابو الدرداءؓ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ساری داستان بیان کر دی کہ کس طرح بھائی نے کل روزہ تڑوا دیا، رات کو عبادت نہیں کرنے دی اور صبح یہ نصیحت کی ہے، امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سارا قصہ سن کر صرف ایک مختصر جملہ ارشاد فرمایا کہ ''صدق سلمان'' سلمانؓ نے سچ کہا ہے گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسیؓ کی پوری کاروائی کی تصدیق فرما دی اور یہ بتایا کہ دین کا جو مفہوم حضرت سلمان فارسیؓ نے بیان کیا ہے وہی صحیح ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنے رب کی عبادت سے بھی غافل نہ ہو اور بندوں کے حقوق سے بھی بے پرواہ نہ ہو، دونوں کے حقوق اپنے اپنے وقت پر ادا کرنا دین کا تقاضا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وسنت ہے۔

ہمارے ایک بزرگ گزرے ہیں، شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ انکے بارے میں سنا ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں ریلوے سٹیشن پر کہیں جانے کیلئے گاڑی پر سوار ہو جاؤں، ایک پاؤں گاڑی میں ہو اور دوسرا باہر ہو، گاڑی روانگی کیلئے وسل دے دے اور اس وقت مجھ سے کوئی پوچھے کہ احمد علیؒ! دین کا خلاصہ ایک جملے میں بیان کر دو تو

میں بیان کر دوں گا اور کہوں گا کہ سارے دین کا خلاصہ یہ ہے کہ ”اپنے رب کو عبادت سے، رسول ﷺ کو اطاعت سے اور مخلوقِ خدا کو خدمت سے راضی کرو“ بس اسی کا نام دین ہے یہی انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کا نچوڑ ہے اور یہی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وسنت کا خلاصہ ہے۔

حضرات محترم!

آج پھر دنیا ”ون وے ٹریک“ پر چڑھ گئی ہے، آخرت کو بھلا دیا گیا ہے، اس دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے، سوسائٹی حرف آخر بن گئی اور اللہ تعالیٰ کی بندگی، حقوق اور احکام انسانی زندگی سے نکلتے جا رہے ہیں اس لیے آج جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وسنت کا سب سے بڑا پیغام یہی ہے کہ لوگو! آپس کے حقوق کی طرف ضرور توجہ دو اور انہیں بھی ادا کرو لیکن اس سے پہلے پیدا کرنے والے کے حقوق ہیں ان کا بھی خیال کرو اور یکطرفہ زندگی چھوڑ کر توازن کی طرف آؤ، بیلنس پیدا کرو اور خدا اور بندوں دونوں کے ساتھ اپنا معاملہ درست کرو، خدا کرے کہ ہم سیرت نبوی ﷺ کے اس پیغام کو سمجھ سکیں اور انسانی سوسائٹی کو اس روح پرور پیغام سے روشناس کرانے کیلئے کوئی کردار ادا کر سکیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

امام ابوحنیفہؒ کا سیاسی ذوق

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

سب سے پہلے تو میں ''اتحادِ اہل سنت'' مولانا محمد الیاس گھمن، مولانا منیر احمد صاحب اور دیگر حضرات کا شکر گزار ہوں کہ آپ حضرات نے اس اجتماعی ملاقات میں حاضری کا موقع بخشا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہماری حاضری قبول فرمائیں، کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق عطا فرمائیں، اور پھر دین حق کی جو بات علم اور سمجھ میں آئے، اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی توفیق سے بھی نوازیں۔

امام ابوحنیفہؒ سے نسبت:

آج ہم عالم اِسلام کی ایک عظیم شخصیت حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی نسبت سے جمع ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ نسبت ہمارے لیے اصل سرمایہ ہے۔ اپنے بڑوں، بزرگوں اور اکابر کے ساتھ درجہ بدرجہ ہماری نسبتیں ہی ہمارا اثاثہ ہیں۔ میں اس بات کو بجلی کے کنکشن سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ ایک کنکشن قائم ہو تو کچھ نہ کچھ ملتا ہی رہتا ہے۔ لوڈ شیڈنگ ہو تب بھی کام چلتا رہتا ہے۔ لیکن اگر کنکشن کٹ جائے تو کچھ بھی ملنے کی امید نہیں رہتی۔ تو یہ دراصل ہمارے دین کے مراکز کے ساتھ اور دین کی بڑی شخصیات کے ساتھ کنکشنز ہیں جو ہمیں اپنے نظریہ و مقصد سے جوڑے ہوئے ہیں۔ پھر حضرت امام ابوحنیفہؒ

کی نسبت تو اتنی بڑی نسبت ہے کہ اس پر جس قدر فخر کیا جائے کم ہے۔ حضرت امام صاحبؒ کی حیات پر، آپؒ کی جدو جہد پر اور آپؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر آپ حضرات نے اِس نشست میں متعدد علمائے کرام کے ارشادات سنے ہیں اور میری گفتگو کے بعد مزید علماء کے ارشادات سنیں گے۔

مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ امام صاحبؒ کی زندگی کے سیاسی پہلوؤں پر بات کروں۔ یہ ایک مستقل اور لمبی گفتگو کا موضوع ہے۔ لیکن میں اِس وقت صرف دو باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرے نزدیک حضرت امام ابوحنیفہؒ کی جدو جہد کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے علمی دنیا کو، افتاء کی دنیا کو، استنباط کی دنیا کو اور فتویٰ و رائے کی دنیا کو مشاورت اور اجتماعیت کا رنگ دیا۔ استنباط اور اجتہاد امام صاحبؒ سے پہلے بھی ہوتے رہے ہیں اور بعد میں بھی۔ اور یہ اپنے دائرے میں قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ لیکن جس شخصیت نے اجتہاد و استنباط کو اجتماعیت کی حیثیت دی اور امت مسلمہ کی اجتماعی رہنمائی کا راستہ دنیا کے سامنے پیش کیا، وہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی شخصیت ہے۔

اجتماعی و شورائی فقہ:

حضرت امام ابوحنیفہؒ کی فقہ کو میں شخصی فقہ نہیں کہتا۔ آپ حضرات میری اس بات سے اتفاق یا اختلاف کا حق رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ جب میں خود اختلاف کا حق رکھتا ہوں تو اختلاف کا حق دیتا بھی ہوں۔ باقی مذاہب کی فقہ شخصی ہیں اور ان کے شخصی فقہ ہونے پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ کی فقہ اجتماعی اور شورائی فقہ ہے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں اور تلامذہ کے ساتھ بیٹھ کر بحث و مباحثہ کیا۔ امام صاحبؒ نے استنباط،

اختلاف، استدلال اور اجتماعی مشاورت کا طریقہ اختیار کیا۔ فقہ حنفی و غیر حنفی کی جو روایات ہمارے سامنے ہیں، جن کی بنیاد پر ہم فتویٰ دیتے ہیں، وہ ایک اجتماعی مشاورتی عمل کا نتیجہ ہیں۔ یہ فقہ حنفی کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔ قانون سازی، استنباط، احکام کی تعبیر و تشریح اور احکام کا عقد، امام صاحبؒ نے اس میں اجتماعیت کی بنیاد ڈالی۔ فقہ اور اجتہاد میں بھی حضرت امام ابوحنیفہؒ نے اجتماعیت اور شورائیت کو فروغ دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ امام صاحبؒ کے اس ذوق کی پیروی ہی آج کی ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے کہ ہمارے علمی فیصلوں میں مشاورت، اجتماعیت، استدلال اور مباحثے کا پہلو اجاگر ہو۔ امام صاحبؒ نے اُس وقت کے مسائل سامنے رکھ کر جس طرح استنباط و استدلال کیا اور امت کے سامنے ایک اجتماعی فقہ پیش کی، آج بھی ضرورت ہے کہ ہم اُن اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے باہمی مشاورت کا اہتمام کریں اور علمی دنیا میں اجتماعیت کا ذوق بیدار کریں۔

امام صاحبؒ کا سیاسی ذوق:

امام صاحبؒ کے بارے میں سیاست کے حوالے سے بہت سی باتیں عام طور پر کی جاتی ہیں۔ اِس وقت لمبی گفتگو کا موقع نہیں ہے۔ میں آپ حضرات کو امام صاحبؒ کے سیاسی ذوق سے متعارف کرانے کے لیے اُن کی تین گرفتاریوں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ اِس سے زیادہ کا وقت شاید اِس نشست میں ہمارے پاس نہیں ہے۔

امام صاحبؒ کی زندگی میں تین گرفتاریوں کے مراحل پیش آئے ہیں۔ یہ تھوڑے تھوڑے عرصے کی تھیں لیکن بہرحال امام صاحبؒ اس سے گزرے ہیں۔ میں اِس وقت پس منظر اور تفصیلات میں جائے بغیر امام صاحبؒ کے ذوق کی ایک جھلک آپ کے سامنے پیش کرنا چاہوں گا۔ یہ واقعہ کوفہ کے گورنر خالد کے بارے میں ہے جو بنو اُمیہ کے دور کا ایک گورنر تھا۔ یہ ابن قدامہ میں بھی ہے اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

حکمرانوں کے خلافِ شرع کاموں کی نشاندہی:

ایک دفعہ امام صاحبؒ جمعے کے لیے تشریف لائے۔ خالد صاحب نے مجمع کے بجائے ممبر پر بیٹھ کر سرکاری دستاویزات کا مطالعہ شروع کر دیا۔ بیٹھے جمعہ کے لئے ممبر پر ہیں اور پڑھ رہے ہیں سرکاری دستاویزات۔ اور اتنی دیر تک پڑھتے رہے کہ عصر کا وقت داخل ہونے لگا، اور وہ بھی امام صاحبؒ والا مثل ثانی عصر کا وقت۔ راوی کہتا ہے کہ ایک صاحب کنکریاں ہاتھ میں لیے بڑی تیزی سے آگے بڑھے اور گورنر صاحب کی طرف رخ کر کے پھینکتے جا رہے ہیں اور کہتے جا رہے ہیں کہ خدا کے بندے ایک نماز کا وقت نکل رہا ہے اور دوسری نماز کا وقت داخل ہو رہا ہے، یہ تم کیا کر رہے ہو۔ یہ شور سن کر خالد صاحب نے نماز تو پڑھا دی لیکن ساتھ ہی پولیس کو اشارہ کیا کہ اس آدمی کو پکڑ لو۔ تو یہ آدمی امام صاحب تھے اور یہ ان کی پہلی گرفتاری تھی۔ امام صاحب کو گورنر کے سامنے پیش کیا گیا۔ گورنر نے پوچھا کہ بھئی میرے خطبے میں یہ سرِعام حرکت تم نے کیوں کی۔ امام صاحب نے اس پر قرآن مجید کی آیت پڑھی:

''فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا''

''پھر ان کی جگہ ایسے ناخلف آئے جنہوں نے نماز ضائع کی اور خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے، پھر عن قریب گمراہی کی سزا پائیں گے۔''

امام صاحبؒ نے گورنر سے فرمایا کہ نماز کا وقت پر پڑھنا تمہاری سرکاری کاروائی سے مقدم ہے اور تم اِس اضاعوا الصلوۃ کے زمرے میں جا رہے تھے، جبکہ میں نے تمہیں اس زمرے میں جانے سے روکا ہے اور تمہیں توجہ دلائی ہے کہ وقت پر نماز پڑھ لو۔ گورنر نے پوچھا، کیا اس کے سوا تمہارا اور کوئی مقصد نہیں تھا؟ امام صاحبؒ نے جواب دیا، خدا کی قسم

میرا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔ گورنر نے کہا ٹھیک ہے جاؤ۔

چنانچہ امام صاحبؒ کا ذوق یہ تھا کہ حکمران یا بڑے لوگ اگر دین کے کسی حکم کی خلاف ورزی کی طرف بڑھ رہے ہوں تو ان کے اس کام کی نشاندہی کرنا، ان پر صدائے احتجاج بلند کرنا، انہیں آگے بڑھنے سے روکنا اور صحیح راستے کی طرف ان کی توجہ دلانی۔ چنانچہ یہ بھی حنفیت کا ایک پہلو ہے۔

امت کو مشکل مراحل سے نکالنا:

ایک اور واقعہ ذکر کرتا ہوں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خارجیوں نے مختلف شہروں پر قبضے شروع کر رکھے تھے۔ خارجیوں کا اس زمانے میں جو تعارف تھا وہ قراء کا تھا، اور وہ قاری کہلاتے تھے۔ اس لیے بصرے پر خارجیوں کے قبضے کو قاریوں کا قبضہ کہا جاتا تھا کہ بصرہ پر قاریوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ یہ لوگ بہت زیادہ قرآن پڑھتے تھے اور نفل بھی بہت پڑھتے تھے۔ انہوں نے جب بصرہ پر قبضہ کیا اور حکومت چھینی تو روایات میں آتا ہے کہ چھ ہزار کے قریب افراد کو انہوں نے شہید کیا۔ بعض روایات کے مطابق ان میں صحابہ بھی شامل تھے، تابعین تو بہر حال تھے ہی۔ بصرہ کے بعد کوفہ پر قبضہ ہوا۔

ضحاک ایک بڑا خارجی کمانڈر تھا۔ اس زمانے میں کوفے کے گورنر تھے عبد اللہ ابن عمر ابن عبد العزیزؒ۔ اُن سے ضحاک کی کمانڈ میں خارجیوں نے جنگ لڑی اور شکست دے کر کوفہ پر قبضہ کر لیا۔ قبضہ کرنے کے بعد ضحاک کوفہ کی جامع مسجد میں آکر بیٹھ گیا اور ہزاروں خارجی اس کے ارد گرد تلواریں لے کر کھڑے ہو گئے۔ خارجیوں کے نزدیک کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر ہوتا تھا۔ ضحاک نے اعلان کروایا کہ کوفہ کی ساری آبادی مرتد ہو گئی ہے، اس لیے سب باری باری میرے سامنے آکر توبہ کریں، اور جو توبہ کرے گا اسے معافی مل جائے گی، اور جو نہیں کرے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ ضحاک کے کارندوں نے اسے امام

ابوحنیفہؒ کے متعلق بتایا کہ یہ یہاں کا بڑا شیخ ہے، یہ اگر مان گیا تو کوفہ کے باقی لوگ بھی مان جائیں گے، لیکن اگر یہ اڑ گیا تو باقیوں کے ماننے کی توقع بہت کم ہے۔

چنانچہ امام صاحبؒ کو گرفتار کر کے کوفہ کی جامع مسجد میں ضحاک کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ ضحاک نے امام صاحبؒ سے کہا ”تب من الکفر شیخ“ کفر سے توبہ کرو۔ امام صاحبؒ نے جواب دیا ”انا تائب عن کل کفر“ میری ہر کفر سے توبہ۔ ضحاک اس معاملے میں موٹے دماغ کا آدمی تھا، اس نے کہا ٹھیک ہے جاؤ۔ امام صاحبؒ دروازے تک پہنچے تو کسی نے ضحاک کو بتایا کہ امام صاحبؒ تو دراصل تمہارے کفر سے توبہ کر کے گئے ہیں۔ ضحاک نے امام صاحب کو بلا کر پھر سامنے کھڑا کر دیا اور وضاحت طلب کی کہ شیخ تم نے کس کفر سے توبہ کی ہے۔ ضحاک نے مزید کہا کہ شیخ ہمارے خیال میں تم نے ہمیں کافر کہہ کر ہمارے کفر سے توبہ کی ہے۔ امام صاحبؒ نے پوچھا، یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں نے تمہارے کفر سے توبہ کی ہے، ایسا سمجھنا تمہارا گمان ہے یا یقین؟ ضحاک نے کہا کہ یہ میرا گمان ہے کہ تم نے ہمارے کفر سے توبہ کی ہے۔ امام صاحبؒ نے قرآن مجید کی آیت کا ایک جملہ پڑھا ”ان بعض الظن اثم“ اور پھر ضحاک سے کہا کہ قرآن مجید کے مطابق تم خود کافر ہو گئے ہو، اس لیے پہلے تم توبہ کرو۔ ضحاک نے بوکھلا کر کہا، اوہو، غلطی ہو گئی۔ ٹھیک ہے میں توبہ کرتا ہوں۔ پھر کہا میں نے توبہ کر لی، اب تم بھی توبہ کرو۔ امام صاحب نے پھر کہا ”انا تائب علی الکل کفر“ میری ہر کفر سے توبہ۔ ضحاک نے کہا جاؤ بابا جاؤ۔

امام صاحب گھر آ گئے۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بڑے مزے سے یہ روایت بیان کی ہے۔ امام صاحب گھر پہنچے تو علماء کا ایک وفد پیچھے پیچھے پہنچا کہ بابا جی آپ تو اپنی ذہانت اور حوصلے سے اپنی جان چھڑوا آئے ہو لیکن ہمارا کیا بنے گا اور پھر کوفہ کی آبادی کیا کرے گی۔ چنانچہ امام صاحبؒ اس دفعہ خود ضحاک کے پاس گئے اور وہاں جا کر کھڑے ہو گئے۔ ضحاک نے پوچھا، بابا اب کس لیے آئے ہو؟ امام صاحب نے کہا، ایک بات سمجھنے

کے لیے آیا ہوں۔ اس نے پوچھا، کیا؟ فرمایا، آپ نے کہا ہے کہ کوفہ کی آبادی ایک ایک کر کے میرے سامنے آ کر توبہ کرے اور جو توبہ نہیں کرے گا وہ قتل کر دیا جائے گا۔ تو میرا سوال یہ ہے کہ وہ توبہ کس چیز سے کریں۔ ضحاک نے کہا کہ وہ ارتداد سے توبہ کریں کیونکہ وہ مرتد ہو گئے ہیں۔ امام صاحب نے کہا، اچھا۔ مرتد تو اسے کہتے ہیں جو اپنا دین تبدیل کر لے۔ کوفہ کے لوگ اپنے باپ دادا کے دین پر ہیں یا انہوں نے کوئی دوسرا دین اختیار کر لیا ہے۔ یہ لوگ تو اسی دین پر ہیں جس پر پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے تو اپنا دین تبدیل نہیں کیا تو پھر وہ مرتد کیسے ہو گئے؟ ضحاک چونک پڑا اور کہا کہ اعدیہ بات دہراؤ، تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس پر امام صاحب نے اپنی بات دہرائی اور ضحاک سے کہا کہ تم کوفہ کی آبادی کو مرتد قرار دے کر ان سے توبہ کا مطالبہ کر رہے ہو۔ مرتد تو اسے کہتے ہیں جو اپنا دین تبدیل کر کے کوئی دوسرا دین اختیار کرے جبکہ یہ کوفہ کے لوگ تو جس دین پر پیدا ہوئے تھے اسی دین پر چلے آ رہے ہیں، انہوں نے تو اپنا دین تبدیل نہیں کیا تو پھر یہ لوگ کیسے مرتد ہو گئے؟ اس پر ضحاک نے کہا، ہاں یہ تو ہم سے غلطی ہو گئی۔ اس نے اپنے لشکر سے کہا کہ اپنی تلواریں نیچی کر لو۔ چنانچہ امام صاحبؒ ضحاک سے اس کی غلطی کا اعتراف کروا کر گھر واپس آئے اور بغیر کسی جنگ و جدل کے، اپنے علم، حوصلہ و ذہانت سے معاملہ حل کیا۔ جسے محاورے کی زبان میں کہتے ہیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

اہل کوفہ ابوحنیفہؒ کے موالی:

ابو معاذ بلخیؒ کا قول ہے کہ "اهل کوفة کل موالی ابی حنفی، کان سبب عتقه" کوفہ کی ساری آبادی ابوحنیفہ کی موالی ہے کہ وہ اِن کی آزادی کا سبب ہیں۔

امام صاحبؒ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا معیار بھی ہمیں دکھایا اور یہ بھی بتایا کہ امت مشکل میں پھنس جائے تو دانشوروں کا کیا کام ہوتا ہے۔ یعنی امام صاحب نے ہمیں یہ سبق دیا کہ قوم مشکل میں پھنس جائے اور کسی آزمائش میں مبتلا ہو جائے تو دانشوروں کا کام یہ

ہوتا ہے کہ حکمت عملی اور تدبر سے قوم کو اس مصیبت سے نکالیں۔ ورنہ بصرہ کا منظر کوفہ والوں کے سامنے تھا لیکن کوفہ والے امام صاحبؒ کے حوصلے، تدبر اور حکمت عملی کے ساتھ اِس صورت حال سے نکلے۔

امام صاحبؒ کا سیاسی رول:

امام صاحب کو بنو امیہ، بنو عباس، خوارج اور محمد بن ابراہیم کی اصلاحی تحریک، ان سب ادوار کا سامنا کرنا پڑا۔ امام صاحبؒ کسی تحریک میں براہ راست شریک نہیں ہوئے لیکن انہوں نے ہر اصلاح کی تحریک کی سپورٹ کی، امام زیدؒ کو بھی سپورٹ کیا اور محمد بن ابراہیم نفس زکیہ کو بھی سپورٹ کیا اور ابراہیم کو بھی، لیکن خود شریک نہیں ہوئے جس کی اپنی مصلحتیں تھیں۔ امام صاحبؒ کی زندگی میں ایک ایسا موقع بھی آیا کہ بنو عباس کے ایک بڑے کمانڈر کو نفس زکیہ کے خلاف فوج کشی کا حکم ہوا۔ امام صاحبؒ نے اسے بلا کر کہا کہ نہیں بھئی ایسا نہ کرنا۔ جس پر اس نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا لیکن ابراہیم کے خلاف فوج کشی نہیں کی۔ یہ میں امام صاحب کا سیاسی رول بتا رہا ہوں۔ امام صاحب نے پس پشت اصلاح کی ہر تحریک کی مالی، سیاسی و اخلاقی سپورٹ کی۔

نظامِ ظلم کا حصہ بننے سے انکار:

یہ بات آپ کے علم میں ہوگی کہ امام صاحبؒ کی آخری عمر کہاں گزری۔ یہ بنو عباس کا دور آگیا تھا۔ امام صاحبؒ کو قاضی القضٰی کا عہدہ پیش کر کے اپنے سسٹم میں حصہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اصل بات یہ نہیں تھی کہ قضاء کے عہدے پر ایک عادل آدمی بیٹھے، بلکہ حاکم کا اصل منشاء یہ تھا کہ ایک صاحب علم آدمی جس کی بات دنیا مانتی ہے، میرے سسٹم کا حصہ بن جائے اور میری قوت میں اضافہ کرے۔ چنانچہ امام صاحب نے انکار کر دیا تھا۔ اس پر بڑا مکالمہ بھی ہوا، دونوں طرف سے قسمیں بھی اٹھائی گئیں۔ پھر امام

صاحبؒ کے انکار پر انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ بعض روایات ہیں کہ امام صاحبؒ کو کوڑے بھی مارے گئے۔ امام صاحبؒ نے جیل قبول کر لی لیکن ظلم کے نظام کا حصہ نہیں بنے۔

یہ میں نے آپ حضرات کے سامنے امام صاحبؒ کی زندگی کی دو تین جھلکیاں پیش کی ہیں۔ اس لیے امام صاحب ہمارے لیے سیاسی دنیا میں ایک اسوہ ہیں۔ اللہ کرے کہ ہم بھی ان میں سے کسی بات کی پیروی کر سکیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

فقہ حنفی

تدوین کا مرحلہ اور مقبولیت کا تسلسل

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْن

امابعد!

مخدوم ومحترم حضرت مولانا علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب، حضرات علماء کرام، مشائخ عظام، محترم بزرگو، دوستو، بزرگو، بھائیو اور ساتھیو!

میں مولانا محمد الیاس گھمن اور اتحادِ اہل سنت کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے امام اعظم ابو حنیفہؒ کی یاد میں اور ان کی خدمات پر خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے اس محفل کا انعقاد کیا۔ اور ہمارے مخدوم ومحترم حضرت خواجہ خان محمد صاحب نوّر اللہ مرقدہ کی نسبت سے اور اُن کی یاد کے حوالے سے اس اجتماع میں مجھے حاضر ہونے کا، بہت سی باتیں سننے کا اور کچھ باتیں کہنے کا موقع فراہم کیا۔ اللہ تعالیٰ منتظمین کی اس خدمت کو قبول اور بارآور فرمائیں۔ اللہ رب العزت اِس کارِ خیر میں تسلسل نصیب فرمائیں۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ عالم اسلام کی ایک عظیم علمی شخصیت تو تھے ہی، لیکن امام صاحبؒ کی شخصیت کے اور بھی بیسیوں پہلو ہیں۔ لیکن میں اپنے ذوق کی مناسبت سے ایک آدھ پہلو پر کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔ دعا فرمائیں کہ اللہ رب العزت کچھ مقصد کی باتیں

کہنے اور سننے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور پھر دین حق کی جو بات علم میں آئے، سمجھ میں آئے، اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی توفیق سے بھی نوازے۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی زندگی بیسیوں پہلو ہیں جن پر گفتگو ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے۔ آج کی اور وقت کی ضرورت ہے کہ علمی و عوامی سوسائٹی کو امام صاحبؒ کی شخصیت سے متعارف کروایا جائے۔ ان کی تعلیمات، ان کی خدمات، ان کی جدوجہد اور ان کے ذوق سے آج کی دنیا کو روشناس کرایا جائے۔ تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میری یہ رائے ہے کہ آج کے دور میں بھی دنیائے اسلام کی علمی، سیاسی اور عملی دنیا میں کوئی شخصیت اگر صحیح راہنما اور آئیڈیل ہو سکتی ہے تو وہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی شخصیت ہے۔ لیکن میں تفصیلات میں جائے بغیر آپ کی خدمت میں دو سوالات پیش کروں گا اور پھر ان سوالات کے دائرے میں گفتگو کرنا چاہوں گا۔

امام ابوحنیفہؒ کا قاضی القضاۃ کا منصب قبول نہ کرنا:

تاریخ کا ایک سوال ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے قاضی القضاۃ کا منصب قبول نہیں کیا تھا لیکن اپنی جان قربان کر دی تھی۔ یعنی آپؒ نے چیف جسٹس کا منصب قبول نہیں کیا تھا لیکن جیل قبول کر لی تھی، اور پھر جیل کے اندر آپ کو زہر پلایا گیا جس کے نتیجے میں آپ کی موت واقع ہوئی۔ میں تفصیلات میں نہیں جاتا لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تو یہ منصب قبول نہیں کیا لیکن بعد میں ان کی مسند پر بیٹھنے والے، اور ان کے جانشین حضرت امام ابو یوسفؒ نے یہ منصب قبول کر لیا تھا اور قاضی القضاۃ بن گئے تھے۔ تو ایسا کیوں ہوا؟ یہ تاریخ کا ایک سوال ہے۔

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ جس وقت امام ابوحنیفہؒ نے علمی دنیا میں قدم رکھا تو اس وقت کا ماحول کیا تھا۔ امام صاحبؒ کی پیدائش 80ھ کی

ہے۔جب حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ امیر المومنین بنے تو اس وقت حضرت امام صاحب 19 یا 20 سال کے تھے اور علمی دنیا میں قدم رکھ چکے تھے۔حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ کو عمر ثانی کہا جاتا ہے۔اور وہ واقعتاً عمر ثانی تھے۔ان کی خلافت کو خلافت راشدہ کا اجتماع کہا جاتا ہے۔حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ نے دو اڑھائی سالہ دورِ حکومت میں کیا اصلاحات کیں اور کس طرح حکومتی نظام اور بیت المال سے بااثر لوگوں کی اجارہ داری ختم کی۔حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ نے اپنے خاندان کے ہاتھوں زہر پیا اور شہید ہوئے۔پھر ان کے منصب پر جو صاحب بیٹھے، ولید بن عبد الملک، انہوں نے جو پہلا آرڈر جاری کیا وہ یہ تھا کہ ہم سے پہلے یہ بزرگ دو اڑھائی سال کے لیے بیٹھے تھے، یہ مجنون قسم کے اور جذباتی آدمی تھے۔ یہ پتہ نہیں کیا کچھ اقدامات کرتے رہے ہیں۔میں ان کے سارے اقدامات کو منسوخ کرتا ہوں اور اپنے عُمال سے کہتا ہوں کہ دو تین سال پہلے کی جو کیفیت تھی، اس پر واپس چلے جائیں۔ یہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے جانشین کا پہلا سرکاری آرڈر تھا کہ پچھلے دو تین سالوں میں جو ہوا وہ سب بھول جاؤ۔ چنانچہ ساری بیوروکریسی اور سارا حکومتی نظم پچھلی پوزیشن پر واپس چلا گیا۔خیر اس کی تفصیلات کا یہ وقت نہیں ہے۔

تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرا یہ تجزیہ ہے کہ امام صاحبؒ نے جب یہ منظر دیکھا کہ جس نہج پر اسلامی حکومت کا نظام آگے بڑھ رہا ہے، تو اس صورت حال میں دو بنیادی کام ضروری ہیں۔

(1) اسلامی قانون سازی

(2) حکومتی مناصب کے لیے افراد سازی

چنانچہ امام صاحبؒ نے اپنے آپ کو اِن دو کاموں کے لیے وقف کر دیا۔اور پھر یہ دو کام کیے تاکہ آئندہ اسلامی ریاست وحکومت کی بنیاد بن سکیں۔

1) اسلامی قانون سازی:

امام صاحبؒ نے یہ بھانپ لیا کہ ان کاموں کے لیے حکومت سے لاتعلق رہنا ضروری ہے کہ سرکاری سطح پر تو وہی کچھ ہونا تھا جو سرکار کے لیے قابل قبول ہونا تھا۔ اس لیے امام صاحبؒ نے شریعت کو باقاعدہ منظم قانون اور ایک مربوط دستور کی شکل دینے کے لیے ایک پرائیویٹ اور نجی ادارہ قائم کیا۔ امام صاحبؒ نے ایک مجلس بنائی تاکہ اسلامی قانون دفعہ وار، قانونی نظم اور قانونی ترتیب کے ساتھ سامنے آئے اور اس طرح اسلامی قانون کو ایک علمی حصار ملے۔ یعنی اہل علم کے اعتماد کے ساتھ ایک مربوط قانون موجود ہو اور آنے والے دور میں کسی کو یہ موقع نہ ملے کہ اسلامی قانون کے نام پر جو چاہے مرضی کرے۔ امام ابو حنیفہؒ نے جو مجلس قائم کی، اس میں اجتماعی مشاورت کا اہتمام کیا، اہل علم کو مشاورت میں شریک کیا، مباحثے کی دعوت دی، اور سالہا سال کی محنت سے اسلامی قانون کی 80 ہزار سے زیادہ دفعات مرتب کیں۔ اور یہ قانون اس طریقے سے دفعہ وار مرتب کیا کہ فلاں معاملہ ہوگا تو اس کا حل یہ ہوگا، اور فلاں مسئلہ درپیش ہوگا تو اس کا سد باب فلاں طریقے سے کیا جائے گا۔

امام صاحبؒ کے اس کام سے پہلے قانون سازی کو فقہ فرضی کہا جاتا تھا۔ اس پہلے یہ ہوتا تھا کہ کوئی واقعہ پیش آتا تب غور کیا جاتا کہ اسلامی شریعت میں اس کا کیا حل ہے۔ بلکہ یوں بھی کہا جاتا تھا کہ کوئی واقعہ اگر پیش نہیں آیا تو اس کے بارے میں کیوں مغز کھپائی کرتے ہو۔ لیکن امام صاحب نے جو فقہ پیش کی وہ اس بنیاد پر تھی کہ آنے والے واقعات کے پیش نظر دفعہ وار قانون مرتب کیا جائے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے، وہ بھی ہوسکتا ہے، فلاں صورت حال بھی پیش آسکتی ہے، اور فلاں معاملہ بھی درپیش ہوسکتا ہے، تو ان سب کے متعلق پہلے سے غور وفکر کر کے ایک قانون مرتب کیا جائے۔ ہماری پرانی اصطلاح میں اسے فقہ فرضی کہتے ہیں۔ جبکہ آج کے دور کی جدید اصطلاح میں اسے قانون سازی کہتے ہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ نے قانون سازی کا ذوق پیدا کیا اور قانون سازی کے لیے افراد

جمع کیے۔ان کی مجلس کے بڑے ارکان چالیس کے قریب بتائے جاتے ہیں۔جن میں نحو کے ماہرین بھی تھے،صرف کے ماہرین بھی تھے،فقہ کے ماہرین بھی تھے،معاملات کے ماہرین بھی تھے،تجارت کے ماہرین بھی تھے،الغرض زندگی کے مختلف شعبوں کے ماہرین اور اہل علم حضرات کو جمع کیا اور سالہا سال ایک اجتماعی فقہ مرتب کرنے کے لیے صرف کیے۔میں ایک بات عرض کیا کرتا ہوں جس سے آپ کو اختلاف کا حق ہے کہ فقہ حنفی شخصی فقہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک اجتماعی فقہ ہے۔فقہ حنفی ایک فرد کی فقہ نہیں ہے بلکہ مشاورت کی فقہ ہے۔دنیائے اسلام میں قانون سازی کا پہلا مربوط کام امام ابوحنیفہؒ اور ان کی جماعت نے کیا۔آج کی سیاسی دنیا میں ایک بڑا سوال ہے کہ اسلامی ریاست میں قانون سازی ممکن ہے یا نہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ بھئی قانون سازی تو سب سے پہلے ہم نے کی ہے اور مجلس قائم کر کے کی ہے اور پھر 80 ہزار سے زیادہ دفعات پر مشتمل ایک قانون بنایا ہے۔

فقہ حنفی کی مقبولیت وعروج کی وجہ:

قانون سازی کا یہ کام تو امام ابوحنیفہؒ اور ان کی جماعت نے کیا۔اور اسلامی تاریخ کا سب سے پہلا دستور کس نے لکھا ہے۔یہ ہارون الرشید کی درخواست پر امام ابو یوسفؒ نے لکھا جو کہ امام ابوحنیفہؒ کے جانشین تھے۔ہارون الرشید نے پوچھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیسے نظام چلانا چاہیے۔اس زمانے میں زیادہ مسئلہ مالیات کا ہوا کرتا تھا۔چنانچہ حضرت امام ابو یوسفؒ نے ہارون الرشید کی درخواست پر ''کتاب الخراج'' لکھی۔اور کتاب الخراج ایک دستور کے طور پر ہارون الرشید کے دور میں نافذ ہوئی۔پھر اس کے بعد یہ فقہ حنفی عباسی دور میں،عثمانی دور میں اور پھر مغل دور میں چلتی رہی۔

یہاں ایک بات پر غور فرمائیں کہ دنیا میں یہ سوال ہوتا ہے اور لوگ یہ تجزیہ کرتے ہیں کہ فقہ حنفی کو دنیا میں عروج کیوں حاصل ہوا کہ عباسیوں کی فقہ بھی وہی تھی،عثمانیوں کی فقہ بھی وہی تھی اور مغلوں کی فقہ بھی وہی تھی۔ایک جواب تو یہ دیا جاتا ہے کہ چونکہ فقہ حنفی والے اقتدار

میں آگئے تھے، اس لیے ان کی فقہ کو پذیرائی ملی۔ مگر میرا تجزیہ ہے کہ ایسی بات نہیں ہے۔ اس کی اصل وجہ امام ابو حنیفہؒ کا وہ کارنامہ تھا کہ جس حکومت کو مربوط، دفعہ وار اور باقاعدہ ایک مرتب قانون کی ضرورت پیش آئی، تو ایسا قانون صرف حنفیوں کے پاس ہی تھا، اور کسی کے پاس تھا ہی نہیں۔ حکومتوں کو تو ایک اچھے مرتب قانون کی ضرورت ہوتی ہے۔ نئے قانون کوئی اتنی آسانی سے تو نہیں بن جایا کرتے۔ اس کے لیے زندگی کے مختلف شعبوں کے ماہرین کی سالہا سال کی عرق ریزی درکار ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتب قانون کی جب بھی کسی کو ضرورت پیش آئی تو وہ صرف حنفیوں کے پاس تھا۔ باقی آئمہ بھی میرے آئمہ ہیں، ان کا احترام اور ان کی خدمات کا اعتراف اپنی جگہ پر۔ لیکن یہ بات کہ اجتماعی مشاورت کے ساتھ، کھلے مباحثوں سے، اور مسئلوں کے تمام پہلوؤں پر غور وفکر کر کے جو قانون مرتب ہوا، ایسا مرتب و منظم قانون کسی دوسری فقہ کے پاس نہیں تھا۔

امام صاحبؒ کی مجلس کا ماحول:

حضرت امام ابو حنیفہؒ نے تو اپنے ہاں علمی مباحثے کا یہ ماحول پیدا کیا تھا کہ آپ کی محفل میں آپ کے شاگردوں کو اختلاف رائے کا پورا حق حاصل تھا۔ شاگرد احترام کے دائرے میں رہ کر دلیل کے ساتھ اپنا اختلاف پیش کرتے۔ اگر امام صاحب ان کا اختلاف تسلیم نہ کرتے تو شاگرد یہ نہ کہتے کہ ٹھیک ہے استاد نے جو کہہ دیا ہم نے مان لیا۔ بلکہ وہ باقاعدہ الگ اپنا اختلافی نوٹ لکھواتے کہ اس مسئلے میں ابو یوسف کا موقف یہ ہے، محمد کا موقف یہ ہے، زفر داؤد ظاہری کا موقف یہ ہے اور احسن کا موقف یہ ہے۔ امام صاحبؒ کی محفل میں ایک مسئلے پر ہفتوں بحث چلتی رہتی تھی، سب باری باری اپنے دلائل پیش کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے مسائل میں ہمارے ایک سے زیادہ اقوال ہیں۔

مورخین ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ امام صاحبؒ کی علمی مجلس میں بحث چل رہی تھی۔ بعض لوگوں کے بات کرنے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ اپنی طرف سے وہ نرمی سے بھی بول

رہے ہوں تو مخاطب کو یوں لگتا ہے جیسے وہ لڑائی کر رہے ہیں۔ تو مجلس میں ایک صاحب اپنی بات ذرا سخت انداز سے کر رہے تھے۔ کسی نے اٹھ کر ٹوکا کہ استاد محترم بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کی موجودگی میں تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو۔ امام صاحب نے ٹوکنے والے صاحب کو منع کر دیا۔ "نحن عودناہ" کہ ان لوگوں کو یہ عادت ہم نے ہی ڈالی ہے۔ یعنی امام صاحبؒ نے کہا کہ چھوڑو بھئی، اسے بات کرنے دو، یہ بے جھجھک بات کرنے کی عادت ہم نے خود ہی ڈالی ہے ان لوگوں کو۔ ان صاحب کو اپنا موقف اپنے طریقے سے بیان کرنے دو۔ چنانچہ امام صاحبؒ کا یہ کارنامہ تھا کہ مربوط قانون سازی کی ایک نجی مجلس قائم کی، اور آج تک اسی مجلس کے چالیس علماء و ماہرین کا کیا ہوا کام دنیا بھر میں قانون سازی کی بنیاد ہے۔

2) حکومتی مناصب کے لیے افراد سازی:

امام صاحبؒ نے دوسرا کام جو کیا وہ تھا افراد سازی۔ میں اس کے لیے کسی لمبی بات کے بجائے ایک حوالہ پیش کرنا چاہوں گا۔ جب امام صاحبؒ کا علمی کام تکمیل کے مرحلے کو پہنچا تو امام صاحبؒ نے کوفہ کی جامع مسجد میں ایک اجتماع کیا۔ روایت ہے کہ تقریباً ایک ہزار کے قریب علماء اس اجتماع میں جمع ہوئے جن سے امام صاحبؒ نے خطاب فرمایا، اور یہ امام صاحبؒ کے شاگرد تھے۔ اس خطاب کے کچھ حصے حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی کتاب "امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی" میں نقل کیے ہیں۔

امام صاحبؒ نے اپنے شاگرد علماء سے خطاب کیا کہ بھئی میں نے تم لوگوں کو پڑھایا ہے اور تمہیں تیار کیا ہے۔ تم میں سے چالیس تو وہ ہیں جو قاضی بننے کی اہلیت رکھتے ہیں، اور ان میں سے دس وہ ہیں جو قاضیوں کی تربیت و نگرانی کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔ یہ میں نے رجال کار تیار کیے ہیں تاکہ حکومتی مناصب پر جو لوگ فائز ہوں، وہ اہلیت کے حامل ہوں۔ اب میں تمہیں امت کے حوالے کر رہا ہوں۔

نفاذِ اسلام کا مطالبہ اور اس کے تقاضے:

یعنی امام صاحب نے دوسرے لفظوں میں یہ کہا کہ صرف یہ مطالبہ کر دینا کافی نہیں ہے کہ اسلام نافذ کرو۔ اسلام نافذ کرنے کے لیے اسلامی نظام چلانے والے بندے تیار کر کے دینا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ اور امام صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے تم لوگوں کو اسی مقصد کے لیے تیار کیا ہے تاکہ تم ایک اسلامی حکومت کی بھاگ دوڑ سنبھال سکو۔ اور تم لوگوں میں سے چالیس لوگ قاضی بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور دس وہ ہیں جو قاضی سازی یعنی نئے قاضی بنانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ یعنی آئندہ اگر قاضیوں کی ضرورت ہوئی تو یہ دس آدمی میرے والا کام کریں گے۔ امام صاحبؒ خود قاضی نہیں بنے کہ اس اہم کام کے لیے حکومتی اثر سے الگ رہنا ضروری تھا، لیکن شاگردوں کو قضاۃ کے لیے تیار کیا۔

امام صاحبؒ نے صرف صحیح اسلامی نظام کے نفاذ کا ہی مطالبہ نہیں کیا بلکہ امام صاحبؒ نے یہ جانچ لیا کہ جب تک اسلامی قانون ایک مدون شکل میں موجود نہ ہو، اور جب تک قانون کو سمجھنے والے اور قانون کے مطابق فیصلے کرنے والے قاضی موجود نہ ہوں، اس وقت تک بات آگے نہیں بڑھے گی۔ گویا امام صاحبؒ نے اپنے وقت میں امت کی علمی و افرادی ضرورت کو پورا کیا کہ ایک قانون مرتب کیا اور اسے چلانے والے افراد تیار کیے اور پھر دنیا کو دو عظیم تحفے دے کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ ایک قانون اور دوسرا قانون چلانے والے اہل کار لوگ۔

امام ابو یوسفؒ کا قاضی القضاۃ کا منصب قبول کر لینا:

اب یہ وقت تھا کہ امام یوسف قاضی القضاۃ کا منصب قبول کر لیتے۔ تاریخ کے حوالے سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تو قاضی القضاۃ کا منصب قبول نہیں کیا لیکن ان کے شاگرد اور جانشین امام ابو یوسفؒ نے قبول کر لیا تھا، آخر کیوں؟

اس بات کو سمجھنے کے لیے میں یہاں اپنے ایک بیوروکریٹ دوست کی رائے عرض کرنا چاہوں گا۔ نوے کی دہائی میں پاکستان میں شریعت بل کے نفاذ کی جدوجہد عروج پر تھی۔ میں بھی شریعت بل کے نفاذ کی تحریک کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ ہم دینی سوچ رکھنے والے سب علماء وطلباء اور عوام الناس بہت متحرک تھے۔ سرکاری سطح پر ہم اراکین پارلیمنٹ سے ملاقاتیں کرتے اور انہیں اِس بل کی ضرورت اور افادیت سے آگاہ کرتے۔ عوامی سطح پر ہم جلسے کرتے تھے اور جلوس نکالتے تھے، ایک وقت میں تو ہم نے پارلیمنٹ تک کا گھراؤ کر لیا تھا۔ اس زمانے میں غلام مرتضیٰ پراچہ صاحب ہمارے گوجرانوالہ شہر کے کمشنر ہوتے تھے۔ پراچہ صاحب بڑے پرانے اور گھاک قسم کے بیوروکریٹ تھے اور میرے دوست تھے۔ ایک دن ہم ایک شادی کی مجلس میں بے تکلفی سے بیٹھے ہوئے تھے، بارات کا انتظار ہو رہا تھا اور ہمارے پاس بات کرنے کے لیے وقت تھا۔ یہ شریعت بل کی تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ پراچہ صاحب نے پوچھا، مولوی صاحب (سیاسی حوالے سے) کیا ہو رہا ہے؟ میں نے کہا، شریعت بل کی تحریک چلا رہے ہیں۔ پوچھا، اس سے کیا ہوگا؟ میں نے کہا، شریعت نافذ ہوگی۔ پوچھا کیسے؟ میں نے کہا، اسلامی شریعت کو ملک میں قانون کی حیثیت حاصل ہوگی۔ پراچہ صاحب نے کہا، وہ تو ٹھیک ہے کہ شریعت ملک کا قانون بن جائے گی لیکن اسے تم لوگ ملک کے اندر عملی طور پر نافذ کیسے کرو گے؟ پھر پراچہ صاحب نے دو باتیں کہیں۔ پہلی یہ کہ مولوی صاحب، موجودہ سسٹم کے اندر تم لوگ (مولوی صاحبان) اقتدار میں نہیں آسکتے۔ یہ سسٹم بنایا ہی ایسا گیا ہے۔ اور فرض کر لو کہ تم لوگ اقتدار میں آجاتے ہو اور ایک مولوی صاحب وزیر اعظم بن جاتے ہیں۔ پھر کیا ہوگا؟ انہوں نے کہا کہ چلیں دومنٹ کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ آپ وزیر اعظم بن جاتے ہیں، اب آپ بحیثیت وزیر اعظم کیا کریں گے؟ میں نے کہا کہ شریعت نافذ کروں گا۔ پراچہ صاحب نے کہا، مولوی صاحب شریعت کس کے ذریعے نافذ کریں گے؟ میرے ذریعے؟

چار ضلعے تو میرے کنٹرول میں ہیں۔ کیا آپ میرے جیسے افسروں کے ذریعے شریعت نافذ کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اگر میری جگہ پر بٹھانے کے لیے تمہارے پاس کوئی اپنا بندہ ہے تو پھر شریعت کی بات کرو، ورنہ بھول جاؤ۔ اگر تمہارے پاس یہ انتظام ہے کہ ایسے افسر لاسکو جو اسلامی شریعت کو سمجھتے ہیں اور تمہارے مزاج کے مطابق کام کر سکتے ہیں، پھر شریعت کی بات کرو۔ لیکن اگر اس موجودہ بیوروکریسی کے ذریعے اسلامی نظام نافذ کرنا ہے تو پھر مولوی صاحب خواہ مخواہ وقت ضائع مت کرو۔ یہ بات پراچہ صاحب نے 88ء میں کہی۔

میں نے عرض کیا کہ امام صاحبؒ نے قانون سازی بھی کی اور افراد سازی بھی۔ اور یہ دو مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی جب اسلام کے نفاذ کی بات ہوتی ہے تو اس کے بارے میں کوئی ابہام نہیں ہوتا بلکہ یہ یقین ہوتا ہے کہ ہمارے پاس ایک اسلامی قانون میسر ہے جس میں صرف آج کے زمانے کے مطابق تجدید کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ جب یہ دو بنیادیں موجود نہیں تھیں تو امام صاحبؒ نے قاضی القضاۃ کا منصب قبول نہیں کیا۔ لیکن امام ابو یوسفؒ کے زمانے میں یہ دو بنیادیں موجود تھیں، ایک مدوّن قانون موجود تھا، اور قانون کو چلانے والے افراد موجود تھے، سارا انتظام مکمل تھا، اس لیے انہوں نے قاضی القضاۃ کا منصب قبول کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ موقع دیا اور انہوں نے امام ابو حنیفہؒ کے تیار کیے ہوئے قانون اور افراد کو ایسے استعمال کیا کہ پھر فقہ حنفی آئندہ صدیوں میں عباسیوں کے قانون کی بنیاد بھی بنی اور اس کے بعد مغلوں کے قانون کی بنیاد بھی بنی۔

آج کا دور اور امام صاحبؒ کی حکمت عملی:

کچھ دیر کے لیے تصور کریں کہ اگر امام صاحبؒ آج ہمارے ہاں موجود ہوتے تو آج کے ہمارے حالات کے تناظر میں ان کی کیا حکمت عملی ہوتی اور وہ ہمیں اس ناگفتہ بہ صورت حال سے نجات دلانے کے لیے کونسے کام کرتے؟

میری رائے میں امام صاحب مندرجہ ذیل تین کام کرتے:

☆ اصلاحِ نظام اور نفاذِ اسلام کی تحریکات کی سرپرستی

☆ گڈ گورننس کے قیام کے لیے راہنمائی

☆ علمی دنیا میں اجتماعی مشاورت کا اہتمام

اصلاحِ نظام کی تحریکات کی سرپرستی:

پہلا کام میرے خیال میں امام صاحبؒ یہ کرتے کہ وہ اصلاحِ نظام اور نفاذِ اسلام کی تحریکات کی سرپرستی کرتے۔ اس لیے کہ امام صاحبؒ کے دور میں بھی اصلاحِ نظام کی تحریکیں تھیں، مسلح بھی اور غیر مسلح بھی۔ امام زید ابن علی کی تحریک، محمد بن ابراہیم، نفس زکیہ کی تحریک۔ یہ اُس دور کے مطابق اصلاح عامہ کی تحریکیں تھیں۔ امام صاحب نے یہاں بھی حکمت عملی سے کام لیا کہ خود براہ راست سامنے نہیں آئے لیکن ان تحریکوں کی پشت پناہی اور سرپرستی کی۔ مالی معاونت بھی کی، سیاسی سپورٹ بھی کی، مشاورت بھی کی اور اخلاقی سپورٹ بھی کی۔ میرے خیال میں امام صاحبؒ آج ہمارے ہاں ہوتے تو آج کی دینی و اصلاحی تحریکوں کے سب سے بڑے سرپرست ہوتے۔

لیکن ظاہر ہے کہ امام صاحبؒ آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ لیکن امام صاحب کی سیرت ہمارے سامنے ہے۔ ان کی حکمت عملی، ان کے طریقہ کار اور ان کی جدوجہد کے وہ سارے پہلو ہم سنتے، پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ چنانچہ ہم یقیناً امام صاحبؒ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی روشنی میں، ان کی جدوجہد کے طریقہ کار سے اور اُن کی ذہانت وفراست سے راہنمائی لیتے ہوئے آج کے دور میں ایک فلاحی اسلامی حکومت کے قیام و بقاء کے لیے اپنی حکمت عملی وضع کر سکتے ہیں؟

گڈ گورننس کے قیام کے لیے راہنمائی:

دوسرا کام آج کے دور میں امام صاحبؒ یہ کرتے کہ ہمارے معاشرے کو ناانصافی

اور بدعنوانی سے نجات دلاتے۔ آج کے دور کا ایک بہت بڑا مسئلہ جسے ایک عام آدمی سے لے کر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس تک ہر آدمی ایک تشویشناک مسئلہ سمجھتا ہے، وہ ہے کرپشن اور بددیانتی۔ یہ کرپشن ہماری قوم کو اوپر سے نیچے تک کھا گئی ہے اور برباد کر گئی ہے۔ امام صاحبؒ کی ذات عالیہ کی جو کمال درجے کی صفتِ انصاف اور صفتِ امانت تھی، ہمیں آج کے دور میں اُن کی ضرورت ہے۔ میں ایک دن امام صاحبؒ کی دیانت کا یہ واقعہ پڑھ رہا تھا کہ ایک بیمار دوست کے ہاں عیادت کے لیے گئے۔ امام صاحبؒ کے بیٹھے بیٹھے وہ بندہ فوت ہوگیا۔ چراغ جل رہا تھا، امام صاحبؒ نے پھونک مار کر چراغ بجھا دیا۔ اور ایک ساتھی کو پیسے دیے کہ جا کر بازار سے چراغ لے کر آؤ۔ اور فرمایا کہ دیکھو بھئی، جب تک یہ شخص زندہ تھا، یہ چراغ اس کی مِلک تھی۔ اس کے فوت ہونے کے بعد یہ چراغ ورثاء کی مشترک مِلکیت ہے۔ اور ورثاء کی مِلک سب کی رضامندی کے بغیر استعمال نہیں کرنی چاہیے، اس لیے میں نے یہ چراغ بجھا دیا۔

چنانچہ آج ہمارے لیے امام صاحبؒ کے اسوہ میں انصاف اور امانت کا یہ سبق موجود ہے کہ کس طرح چھوٹی سے چھوٹی چیز اور معمولی سے معمولی سے معاملے میں انصاف کا پہلو اجاگر کر کے انہوں نے آنے والوں کو یہ فکر دی کہ انصاف اور دیانت انسانی معاشرے کی بقاء کی ضمانت ہوتے ہیں۔ آج ہمیں چاہیے کہ امام صاحبؒ کی سیرت اور اسوہ سے رہنمائی لیتے ہوئے کرپشن، بددیانتی اور ناانصافی کے خلاف جدوجہد اور جہاد کریں اور امانت، سچائی اور دیانت کا علم بلند کریں۔

علمی دنیا میں اجتماعی مشاورت کا اہتمام:

میرا تو حضرت امام ابوحنیفہؒ کی اس دور کی جدوجہد کے حوالے سے ایمان ہے کہ امام صاحبؒ آج ہمارے درمیان ہوتے تو وہ علمی دنیا میں اجتماعی مشاورت کو فروغ دیتے۔ امام صاحبؒ الگ الگ علمی کاموں کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے علمی دنیا میں

اجتماعی مشاورت کا اہتمام کرتے۔ علماء کو اکٹھا کرتے کہ بھئی امت اور قوم کے مسائل پر اکٹھے بیٹھ کر سوچو اور اکٹھے مل کر اجتماعی رہنمائی کرو۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے لیے ان تمام شعبوں میں وہ اسباب موجود ہیں جن کے لیے امام ابوحنیفہؒ کی سیرت میں ہمارے لیے رہنمائی کے اسباق میسر ہیں۔ میں شرحِ صدر سے یہ بات کہتا ہوں کہ آج بھی دنیا کو انفرادی و اجتماعی معاملات میں، نجی و قومی معاملات میں اور دینی و علمی معاملات میں اگر راہنمائی درکار ہے تو میری رائے میں امام ابوحنیفہؒ کی شخصیت ایک بہترین آئیڈیل ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں امام ابوحنیفہؒ کی حسنات کو زندہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ہم حنفی کیوں کہلاتے ہیں؟

"27 رمضان المبارک 1430ھ کو بعد نماز فجر سلطان میرج ہال پیپلز کالونی گوجرانوالہ میں 27 روزہ "تعلیم دین کورس" کی آخری نشست سے خطاب"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

بزرگان محترم اور برادران اسلام!

آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ گزشتہ سال میں نے اسی جگہ آپ کے اس کورس کی آخری نشست سے خطاب کرتے ہوئے اس موضوع پر گفتگو کی تھی کہ "ہم سنی کیوں کہلاتے ہیں؟" اور اہل سنت کے تاریخی پس منظر، علمی و فکری مسلمات اور دائروں کے حوالہ سے کچھ گزارشات پیش کی تھیں، اسی وقت سے میرے ذہن میں ترتیب یہ تھی اور میں نے بعض دوستوں سے عرض بھی کر دیا تھا کہ اگلے سال میری گفتگو "ہم حنفی کیوں کہلاتے ہیں؟" کے عنوان پر ہوگی اور اس سے اگلے سال انشاء اللہ تعالیٰ "ہم دیوبندی کیوں کہلاتے ہیں؟" کے موضوع پر گفتگو کروں گا، چنانچہ اس ترتیب کے مطابق آج آپ حضرات کی خدمت میں حنفیت کے حوالہ سے کچھ معروضات پیش کرنا چاہوں گا۔

ہم عقیدہ کے حوالہ سے اہل السنۃ والجماعۃ ہیں، فقہی مذہب کے حوالہ سے حنفی ہیں اور علمی

مشرب و مسلک کے حوالہ سے دیوبندی ہیں ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا دائرہ ہے اپنا اپنا پس منظر ہے اور اپنا اپنا تعارف ہے جو ہم میں سے ہر ایک کے ذہن میں ہونا چاہیے اہل سنت کے بارے میں گزشتہ سال معروضات پیش کر چکا ہوں، حنفیت کے بارے میں آج گفتگو ہوگی اور دیوبندیت کے بارے میں زندگی کے ساتھ صحت و توفیق شامل حال رہی تو اگلے سال اسی پروگرام میں انشاء اللہ تعالیٰ آپ حضرات سے مخاطب ہوں گا۔

حنفی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم فقہی احکام، فقہی اصول اور فروعات میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں یعنی ان کے علم، ثقاہت، دیانت اور فراست پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے اقوال و فتاویٰ کو دلائل کی بحث میں پڑے بغیر قبول کرتے ہیں اور دوسرے ائمہ کرامؒ کے اقوال و فتاویٰ پر ترجیح دیتے ہیں۔

ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس کو سمجھنے کے لئے چند اصولی باتوں کو پہلے سمجھ لینا ضروری ہے، پہلی بات یہ ہے کہ قرآن کریم کے اس اسلوب سے ہمیں واقف ہونا چاہیے کہ قرآن کریم میں ہدایت اور راہنمائی کے لئے صرف اصول و احکام اور قوانین و ضوابط کی بات نہیں کی گئی بلکہ ان اصول و احکام پر عملدرآمد کے لئے افراد و شخصیات کو بطور نمونہ اور آئیڈیل پیش کیا گیا ہے اور ان کی اقتدا و اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔

چنانچہ سورۃ فاتحہ میں جہاں ہمیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہر روز اور بار بار صراط مستقیم پر چلائے رکھنے کی دعا کرنے کے لئے کہا گیا ہے وہاں صراط مستقیم کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے ”صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ“ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا گویا صراط مستقیم کا تعین کرتے وقت ہمارے سامنے صرف راستے کے نشانات ہی نہیں بلکہ اس پر چلنے والے لوگ بھی ہونے چاہییں اور ہم انہی کو دیکھ کر یہ طے کر سکیں گے کہ صراط مستقیم کون سا ہے؟

ان افراد و طبقات میں سب سے پہلا طبقہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا ہے جن میں سے چند بزرگوں کا ذکر کر کے سورۃ الانعام کی آیت 90 میں کہا گیا ہے کہ

”فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ“ ان کی ہدایت پر چلو اور ان کی پیروی کرو اور اس طرح ہدایت کا معیار شخصیات کو قرار دیا گیا ہے۔

طبقہ کے حوالہ سے دوسرا طبقہ حضرات صحابہ کرامؓ کا ہے جن کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے اور اسے حق کا معیار بتایا گیا ہے، چنانچہ سورۃ البقرہ آیت نمبر 13 میں کہا گیا ہے کہ

”وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ“

”جب ان (منافقین) سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس طرح ایمان لائیں جیسے دوسرے لوگ (صحابہ کرامؓ) ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسے ایمان لائیں جیسے بیوقوف لوگ (معاذ اللہ) ایمان لائے ہیں؟“

یہاں ”كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ“ میں ”النَّاسُ“ سے مراد صحابہ کرامؓ ہیں اور انہی کو ایمان کے لئے آئیڈیل اور مثال بتایا گیا ہے۔

اسی طرح سورۃ البقرہ کی آیت 137 میں صحابہ کرامؓ سے خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ

”بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ“

”پس اگر وہ (دوسرے لوگ) اس طرح ایمان لائیں جیسے تم ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر وہ اس سے پھر گئے تو پختہ بات ہے وہ گمراہی میں ہیں۔“

اس آیت کریمہ میں صحابہ کرامؓ کو ایمان کے لئے صرف مثال اور آئیڈیل نہیں کہا گیا بلکہ معیار بھی قرار دیا گیا ہے کہ ان کے طریقے سے پھر جانا گمراہی ہے۔

اسی طرح سورۃ النساء کی آیت 115 میں فرمایا گیا ہے کہ

''وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ''

''اور جو شخص رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرے گا اس کے بعد کہ اس پر ہدایت واضح ہو چکی اور مومنین کے راستے سے ہٹ کر چلے گا ہم اس کو اسی طرف پھیر دیں گے جدھر وہ پھرے گا اور اس کو جہنم میں داخل کر دیں گے۔''

یہاں بھی ''وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ'' کا اولین مصداق صحابہ کرامؓ ہیں اور ان کے راستے سے ہٹ جانے کو جہنم کے راستے پر چلنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پھر سورۃ لقمان میں حضرت لقمان حکیمؒ کی اپنے بیٹے کیلئے وصیت کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات فرمائی گئی ہے کہ ''وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ''

اس شخص کی راہ پر چلو جو میرے سامنے جھک گیا ہے۔

ان آیات کریمہ کا حوالہ دینے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم نے صرف اصول وضوابط اور احکام وقوانین کی پیروی کا حکم نہیں دیا بلکہ اس کے لئے کچھ طبقات اور افراد کو معیار اور آئیڈیل قرار دے کر ان کی اتباع کی تلقین فرمائی ہے۔

دوسری اصولی بات جس کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا ارشاد گرامی ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ جو شخص کسی شخصیت کو اپنا مقتداء اور پیشوا بنانا چاہتا ہے تو اس کے لئے ان لوگوں میں سے انتخاب کرے جو فوت ہو چکے ہیں اس لئے کہ زندہ شخص کسی وقت بھی فتنہ میں مبتلا ہو سکتا ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا یہ ارشاد گرامی مشکوۃ شریف میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔

''من کان منکم مستنا فلیستن بمن قدمات فان الحی لا تؤمن علیه الفتنة اولئك أصحاب محمد ﷺ کانوا أفضل هذه الأمة

ابرھا قلوبا واعمقھا علما واقلھا تکلفا اختارھم اللہ لصحبة نبیہ ولا قامة دینہ فاعرفوا لھم فضلھم واتبعوھم علی اثرھم وتمسکوا بما استطعتم من اخلاقھم وسیرھم فانھم کانوا علی الھدی و صراط مستقیم"

جو شخص کسی کی پیروی کرنا چاہتا ہے تو ان کی کرے جو فوت ہو چکے ہیں اس لئے کہ زندہ آدمی فتنہ سے محفوظ نہیں ہے اور وہ لوگ اصحاب محمد ﷺ ہیں جو سب سے زیادہ نیک دل تھے، سب سے زیادہ گہرے علم والے تھے اور سب سے کم تکلف والے تھے، انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت اور اپنے دین کی اقامت کے لئے چنا تھا پس ان کے فضل کو پہچانو، اور ان کے نقش قدم پر چلو اور جہاں تک تمہارے بس میں ہو ان کے اخلاق و عادات کو مضبوطی سے تھام لو کیونکہ وہی لوگ سیدھے راستے پر ہیں۔

ان ارشادات کی روشنی میں عرض کرتا ہوں کہ طبقات کے حوالہ سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور حضرات صحابہ کرامؓ واجب الاتباع ہیں اور ہم اسی وجہ سے اہل السنة والجماعة کہلاتے ہیں کہ جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت اور حضرات صحابہ کرامؓ کی جماعت ہماری علمی اور فکری اساس ہیں۔

حضرات صحابہ کرامؓ کے بعد اتباع واقتداء اور فالو کرنے کے لئے شخصیات کا چناؤ اس بنیاد پر ہوگا کہ کس کے پاس دین کا علم زیادہ ہے، کون دینی تفقہ کی دولت سے مالا مال ہے اور کس کے تقویٰ و دیانت پر امت کو زیادہ اعتماد ہے۔

یہاں میں جناب نبی اکرم ﷺ کا ایک ارشاد گرامی پیش کرنا چاہوں گا جو مسند دارمی میں حضرت جبیر بن معطمؓ سے روایت ہے کہ جناب رسالت مآب ﷺ نے فرمایا کہ

"نَضَّرَ اللّٰہُ عَبْداً سَمِعَ مَقَالَتِیْ فَوَعَاھَا ثُمَّ اَدَّاھَا اِلٰی مَنْ لَمْ یَسْمَعْھَا

فَرب حامل فقه لا فقه له وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلٰى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ ''

اللہ تعالیٰ اس شخص کو تر و تازہ رکھے جس نے میری بات سنی اسے یاد رکھا اور پھر اسے آگے ایسے شخص تک پہنچا دیا جس نے اسے نہیں سنا اس لئے کہ بعض سننے والے ایسے ہوتے ہیں جنہیں اس کی سمجھ نہیں ہوتی اور بعض سننے والے اسے خود سے زیادہ سمجھنے والے تک پہنچا دیتے ہیں۔

اس ارشاد نبوی کی روشنی میں دو باتیں عرض کرنا چاہوں گا ایک یہ کہ حدیث اور چیز ہے اور فقہ اس سے مختلف چیز ہے اور دونوں دین کا مطلوب ہیں، قرآن کریم بھی ''لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ'' کے تحت اس کی اہمیت بیان کرتا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ایک اور حدیث میں فرمایا ہے کہ مَنْ يُّرِدِ اللهُ بِهٖ خَيْرًا جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں ''يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ'' اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں۔

حدیث محض سننے یاد کرنے اور آگے پہنچا دینے سے پوری ہو جاتی ہے لیکن اسے سمجھنے کے لئے عقل درکار ہے، درایت کی ضرورت اور دانش مطلوب ہے اور اس عقل و دانش کے درجات مختلف ہیں جن میں سے ''أَفْقَهُ مِنْهُ'' کی تلاش دینی ضروریات میں سے ہے، اس لئے ہمارا طریق کار یہ ہے کہ ہم خالی روایت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کے بعد تفقہ کی ناگزیر ضرورت کی طرف بھی توجہ دیتے ہیں اور حدیث وفقہ کے امتزاج کو اپنے فقہی مذہب کی اساس سمجھتے ہیں۔

یہاں ایک بات اور عرض کرنا چاہوں گا کہ خالی روایت حدیث کہلاتی ہے اس کے ساتھ درایت اور تفقہ شامل ہو جائے تو اس سے سنت مستنبط ہوتی ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''سنت'' کو واجب الاتباع قرار دیا ہے جو حدیث وفقہ کے امتزاج سے وجود میں آتی ہے اور یہی اہل السنۃ والجماعۃ کی بنیاد ہے۔

اس کے بعد اس طرف آنا چاہوں گا کہ صحابہ کرامؓ کے بعد فقہاء کرامؒ کی پیروی کی بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر فقہاء کرامؒ کی اتنی بڑی جماعت میں سے ہم نے امام ابوحنیفہؒ کا انتخاب کیوں کیا ہے؟ تو حضرت امام ابوحنیفہؒ کی ترجیح کی وجوہ میں دو تین باتوں کی طرف توجہ دلاؤں گا، پہلی بات وہی کہ حدیث نبوی میں ''مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ'' فرمایا گیا ہے اور حضرات فقہاء کرامؒ میں سے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ''افقہ'' ہونا ایک ایسی متفقہ علیہ بات ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ان کے بارے میں حضرت امام شافعیؒ کا ارشاد گرامی ہے،

''مَنْ اَرَادَ الْفِقْهَ فَهُوَ عِيَالٌ عَلٰى اَبِيْ حَنِيْفَةَ''

جو شخص بھی فقہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ امام ابوحنیفہؒ کے سامنے بچوں کی طرح ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ ''اَفْقَهُ النَّاسِ اَبُوْ حَنِيْفَةَ'' اور ''وَمَا رَأَيْتُ فِي الْفِقْهِ مِثْلَهٗ'' لوگوں میں سے بڑے فقیہ ابوحنیفہؒ ہیں اور میں نے فقہ میں ان جیسا کوئی نہیں دیکھا۔

ہماری دوسری وجہ ترجیح یہ ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے عقل وقیاس کو اس کے صحیح مقام پر رکھا ہے، نہ اس سے انکار کیا ہے اور نہ ہی اتنا سر چڑھا دیا ہے کہ نصوص پر حکومت کرنے لگے، عقل اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے جس کے استعمال سے گریز اس نعمت کی ناشکری ہے اور اس کی حدود متعین ہیں ان سے اس کو آگے بڑھانا بھی جائز نہیں ہے۔

اس بارے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی ترتیب ملاحظہ فرمائیے کہ وہ دلیل میں سب سے پہلا درجہ قرآن کریم کو دیتے ہیں، اس کے بعد حدیث نبوی کو اور حدیث نبوی کے بارے میں ان کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر ضعیف حدیث بھی موجود ہو تو وہ اسکے مقابلہ میں قیاس نہیں کریں گے اور حدیث کو ترجیح دیں گے۔

بلکہ وہ تو صحابہ کرامؓ کے اقوال کو بھی قیاس سے مقدم رکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے کسی مسئلہ میں اقوال مختلف بھی ہوں تو وہ انہی میں سے ایک کا انتخاب کریں گے اور صحابہؓ کے اقوال سے باہر نہیں نکلیں گے گویا وہ صحابی کے قول کو بھی قیاس پر مقدم قرار دیتے ہیں اور وہ ان سب کے بعد قیاس کا درجہ تسلیم کرتے ہیں۔

اور عقل کا صحیح مقام بھی یہی ہے کہ وہ نصوص کی تفہیم اور استنباط و استدلال میں معاون ہے اور نصوص کے درجات ختم ہو جانے کے بعد وہ اس پوزیشن میں ہے کہ اسے کسی فیصلے یا حکم کی بنیاد بنایا جائے، اس لئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے وحی اور عقل کے درمیان حقیقی توازن قائم کیا ہے اور ان کی فقہ کی مقبولیت کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے۔

ہماری تیسری وجہ ترجیح یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی فقہ شخصی نہیں شورائی ہے اور اس فقہ کی بنیاد کسی ایک شخصیت کے استدلال و استنباط پر نہیں بلکہ پورے ایک شورائی نظام پر ہے جس میں فقہاء کرام کی ایک بڑی جماعت نے اجتماعی غور و خوض اور بحث و مباحثہ کے بعد ہزاروں مسائل مستنبط کئے ہیں اور ان ہزاروں مسائل میں ایک بڑی تعداد ان مسائل و احکام کی ہے جن میں ہم امام ابوحنیفہؒ کی بجائے ان کی مجلس مشاورت کے دوسرے شرکاء کے اقوال کو قبول کرتے ہیں اس بناء پر مجھے ان حضرات کی بات سے اتفاق نہیں ہے جو احناف کو تقلید شخصی کا طعنہ دیتے ہیں، مجھے تقلید شخصی سے بھی انکار نہیں ہے، کیونکہ دیگر فقہی مذاہب مثلاً مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کی بنیاد تقلید شخصی پر ہی ہے لیکن احناف کے بارے میں یہ بات قبول کرنے میں مجھے تامل ہے اس لئے کہ ہمارے پورے فقہی نظام کی بنیاد صرف حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اقوال و فتاویٰ پر نہیں بلکہ ان کے ساتھ شریک دوسرے فقہاء کرام کے اقوال و فتاویٰ بھی ہمارے فقہی احکام کی بنیاد ہیں۔

فقہ حنفی اجتماعی ہے اور شورائی ہے جس میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کو اس شورائی نظام کے سربراہ اور علمی و فکری راہ نما کی حیثیت حاصل ہے اور اسی وجہ سے یہ فقہ ان کی طرف

منسوب ہے لیکن عملی طور پر یہ فقہ شخصی نہیں ہے اجتماعی ہے۔

ہماری چوتھی وجہ ترجیح یہ ہے کہ فقہ حنفی عملی اور پریکٹیکل ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں قبولیت عطا فرمائی ہے، خلافت عباسیہ میں اسے ملکی قانون کا درجہ حاصل رہا ہے اور خلافت عثمانیہ میں بھی یہی ملک کا عام قانون تھی، اسی طرح مغل حکمرانوں کے دور میں جنوبی ایشیا میں بھی اسے قانون و دستور کی حیثیت حاصل تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ متوازن ہے ،قابل عمل ہے اور سوسائٹی کی ضروریات کا لحاظ رکھتی ہے۔

حضرات محترم!

وقت کی قلت کے باعث میں اس عنوان پر تفصیلی گفتگو نہیں کر سکا البتہ اصولی طور پر میں نے چند اشارات میں یہ بات عرض کی ہے کہ ہم حنفی کیوں کہلاتے ہیں اور فقہی احکام و مسائل میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کی جماعت و رفقاء کو ترجیح کیوں دیتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح باتوں پر عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

امام ابو حنیفہؒ کی فقہ
ایک مکمل اور جامع فقہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

میں اِتحاد اہل سنت اور مولانا محمد الیاس گھمن کا شکر گزار ہوں کہ یہ لوگ حضرت اِمام اعظم ابو حنیفہؒ کے حوالے سے وقتاً فوقتاً اجتماعات کرتے رہتے ہیں۔ اس سے سامعین کو تو فائدہ ہوتا ہی ہے لیکن مجھے اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ مجھے امام صاحبؒ کے حوالے سے کسی نئے موضوع پر مطالعہ کا موقع مل جاتا ہے۔ کچھ نہ کچھ پڑھنے کا اور تحقیق کا موقع فراہم ہو جاتا ہے، ورنہ عام روزمرہ کے معمول میں فرصت نہیں ملتی۔

میں نے اسلام آباد کے سیمینار میں امام صاحبؒ کی سیاسی جدوجہد کے چند پہلوؤں پر بات کی تھی۔ جبکہ لاہور کے سیمینار میں مختصراً حضرت امام صاحبؒ کی فقہی خدمات اور ان کی اہمیت کا تذکرہ کیا تھا۔ آج کے اِس سیمینار میں حضرت اُمام صاحبؒ کی جدوجہد کے مزید ایک پہلو پر گفتگو کرنا چاہوں گا۔ وہ یہ امام ابو حنیفہؒ کی فقہ ایک مکمل اور جامع فقہ ہے۔

امام صاحبؒ نے مختلف شعبوں میں، مختلف حوالوں سے کام کیا ہے۔ ویسے تو پوری اسلامی تاریخ اور تمام اسلامی شخصیات کا تذکرہ ہماری آج کے دور کی ضرورت ہے۔ لیکن آج کے عمومی حالات سامنے رکھ کر میں یہ بات کہا کرتا ہوں کہ تین اسلامی شخصیات ایسی ہیں

کہ آج کا پورا عالمی ماحول اور آج کی پوری دنیا ان تینوں سے فیضیاب ہوئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ہم میں سے ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ ہم آج کے تناظر میں ان تین شخصیات سے واقفیت حاصل کریں اور آج کی دنیا میں اسلام کی بات ان شخصیات کے عنوان اور ان کی فکر کی روشنی میں کریں کہ آج کی دنیا ایسی بات زیادہ بہتر سمجھے گی۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تو سب سے بالا ہے، اور صحابہ کرامؓ کا اپنا مقام ہے۔ ہر شخصیت کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے، ایک نفسیات ہوتی ہے، ایک خاص ذہنی سطح ہوتی ہے، اور پیغام پہنچانے کی ایک مخصوص فریکونسی ہوتی ہے۔

عصرِ حاضر اور تین اہم اسلامی شخصیات:

آج کی دنیا کی فریکونسی ہماری تین شخصیات سے بہت فٹ بیٹھتی ہیں۔ میں آج کے نوجوان علماء کو یہ دعوت دیا کرتا ہوں کہ ان شخصیات کا بطور خاص مطالعہ کیا کریں۔

(1) سیاسیات اور حکومت میں حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ سے

(2) فقہ و قانون میں حضرت امام ابوحنیفہؒ سے

(3) سیاسی فکر و فلسفے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ سے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا طرزِ حکومت:

انقلاب کس کا نام ہے، اصلاحِ احوال کیسے ہوتی ہے، نظم کیسے درست ہوتا ہے، امت کے مسائل کیسے حل ہوتے ہیں اور حکومت کیسے کی جاتی ہے۔ ان موضوعات پر پڑھنا ہے تو بڑے حضرت عمرؓ اور پھر ان کے پرتاؤ چھوٹے حضرت عمرؒ۔ یہ دونوں آئیڈیل ہیں۔ صرف ہم مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ دنیا کے بھی آئیڈیل ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ بھی۔ میں ان شخصیات کے متعلق تفصیل میں جاؤں گا تو معاملہ لمبا ہو جائے گا لیکن میں ایک جزوی واقعہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے حوالے سے نقل کرنا چاہوں گا۔ آج

ہمیں اپنے ملک میں ایک بہت بڑا مسئلہ درپیش ہے۔ وہ یہ کہ ہماری قومی دولت بڑے بڑے لوگوں کی تجوریوں میں ہے اور سرکاری خزانہ خالی ہے۔ ہمارے ملک کے سرکاری خزانے میں لوگوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی جھلک آپ کے سامنے پیش کرنا چاہوں گا۔ چند ہفتے پہلے آپ نے بھی سوئس بینکوں کے ایک ڈائریکٹر کا یہ بیان اخبارات میں پڑھا ہوگا۔ اس نے کہا کہ ہمارے سوئس بینکوں میں پاکستانیوں کی اتنی دولت بیکار پڑی ہے کہ اگر یہ دولت واپس پاکستان چلی جائے تو پاکستان کو تیس سال تک اپنے بجٹ میں کوئی نیا ٹیکس لگانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اور اس نے یہ لکھا کہ سوئس بینکوں میں پاکستانیوں کی رقوم جو بے مصرف پڑی ہیں، اگر یہ واپس پاکستان چلی جائیں تو یہ اتنی رقم ہوگی کہ حکومت پاکستان اگر اپنے ہر شہری کو بیس ہزار روپے سالانہ وظیفہ دے تو یہ رقوم ساٹھ سال کے لیے کافی ہوں گی۔ یعنی ہمارا سرکاری خزانہ اور سرکاری دولت بااثر لوگوں کی ذاتی تجوریوں میں ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ 100ھ یا 101ھ میں برسرِ اقتدار آئے۔ حضرت عمرؒ نے تقریباً اڑھائی برس حکومت کی لیکن اس مختصر عرصے میں انہوں نے جس طرح حکومت کی اور حکومتی نظام میں جس طرح انہوں نے اصلاحات کیں اسے آج تک دنیا یاد کرتی ہے۔ امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ جب وہ اقتدار میں آئے تو سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ بیت المال کے پچاسی فیصد اثاثے شاہی خاندان کے قبضے میں تھے۔ حضرت عمر ابن عبد العزیز کے ایک دوست تھے حیوۃ بن شریح۔ محدثین کے ہاں یہ ایک بڑا نام ہے۔ انہوں نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے ذکر کیا کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ ایک محفل میں تشریف فرما ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس محفل میں تم (عمر بن عبد العزیز) اور میں (حیوۃ بن شریح) بھی بیٹھے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے خطاب کر کے کہا کہ اگر تمہیں حکومت ملے تو ابوبکر و عمر جیسی حکومت کرنا۔

چنانچہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ جب خلیفہ بنے تو سب سے بڑا مسئلہ جو درپیش تھا وہ یہ تھا کہ شاہی خاندان سے پچاسی فی صد قرضے وصول کیے جائیں کہ یہ سارے اثاثے بیت المال میں واپس آئیں اور بیت المال اپنا نظام صحیح طریقے سے چلائے۔ خود حضرت عمر بن العزیزؒ کے ذاتی قبضے میں وہ معروف باغ فدک تھا جو کہ تاریخ میں ایک معرکۃ الآراء باغ ہے۔ حلف اٹھانے کے بعد، بیعت کے بعد سب سے پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ بیت المال کے انچارج کو بلایا اور کہا کہ یہ باغ میرے قبضے میں چلا آرہا ہے، یہ باغ تم بیت المال کے لیئے واپس لے لو۔ جس باغ پر سیدہ فاطمہؓ کا قبضہ تسلیم نہیں ہوا، میں کون ہوتا ہوں اس باغ پر اپنا قبضہ رکھنے والا۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے اپنی جائیداد واپس کی۔ پھر اپنے گھر اپنی بیوی کے پاس تشریف لے گئے۔ فاطمہ بنت عبد الملک۔ وہ خاتون جسے ایک امیر المؤمنین کی بیٹی، ایک امیر المؤمنین کی بیوی، اور بعد میں تین امراء المؤمنین کی ماں بننے کا اعزاز حاصل ہے۔ اور پھر کمانڈر انچیف مسلمہ ابن عبد الملک کی بہن تھی۔ تو حضرت عمرؒ نے اپنی بیوی فاطمہ سے کہا کہ مسلمانوں کی حکومت میرے سپرد کر دی گئی ہے اور مسئلہ بہت نازک ہے کہ ہمیں بیت المال کے اثاثے واپس کرنے ہیں۔ میں نے تو وہ باغ واپس کر دیا ہے جو میرے پاس تھا۔ جبکہ تمہیں یہ بات معلوم ہے کہ تمہارے باپ اور تمہارے بھائیوں نے جو کچھ تمہیں دے رکھا ہے، یہ ان کی ذاتی مِلک نہیں تھیں بلکہ یہ سب دراصل بیت المال کی چیزیں ہیں۔ تمہارے ذاتی استعمال میں جو چیزیں ہیں، زیورات اور قیمتی کپڑے اور سامان وغیرہ، یہ سب کچھ بیت المال کی دولت سے ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے کہا کہ فاطمہ میں تم پر جبر نہیں کرتا کہ یہ چیزیں تمہیں تمہارے باپ اور بھائیوں نے دی ہوئی ہیں۔ لیکن میں یہ بات تم سے کہوں گا کہ اِس گھر میں یا تو یہ چیزیں رہیں گے یا پھر عمر رہے گا۔ یہ بیت المال کی چیزیں اور عمر دونوں یکساتھ نہیں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ فاطمہ بنت عبد الملک کے درجات بلند فرمائے، یہ ایک اچھے زمانے کی ایک

اچھی عورت تھی۔ آج کے دور میں ایسا ہوتا تو خاتون شاید یہ کہتی کہ حضرت آپ تشریف لے جائیں، آپ کو رہنے کے لیے کوئی کوٹھی یا بنگلہ مل جائے گا، میں تو یہ سامان واپس کرنے والی نہیں۔ لیکن فاطمہ نے کہا کہ حضرت میرا زیور بھی آپ ہیں اور میرا لباس بھی آپ ہی ہیں۔ اس گھر میں جو چیز بھی بیت المال کی نظر آتی ہے، اسے اٹھا کر واپس کر دیں، یہ فاطمہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گی۔ تو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اپنا باغ واپس کیا، بیوی کے زیورات اور وہ سامان واپس کروایا جو دراصل بیت المال کی دولت سے تھا۔ یہ سارا کام مکمل کر کے اپنی برادری کو، شاہی خاندان کو بلوالیا کہ بھئی بیت المال کے پچاسی فیصد اثاثے تمہارے پاس ہیں اور میں نے یہ اثاثے بیت المال کو واپس دلوانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میں نے اپنے اور بیوی کے اثاثے واپس کر دیے ہیں، اب تم بتاؤ کہ کتنے دنوں میں اپنے تصرف کی چیزیں واپس کرتے ہو۔ امام سیوطیؒ کہتے ہیں کہ پندرہ دن کے اندر اندر تمام اثاثے بیت المال کو واپس کر دیے گئے۔

یہ سیمینار امام اعظم ابوحنیفہؒ کے حوالے سے ہے اس لیے میں اِن تین اسلامی شخصیات کے تعارف کے حوالے سے یہ بات مزید لمبی نہیں کرتا۔ لیکن ایک طالب علم کے طور پر میری ذاتی رائے یہ ہے کہ انقلاب اور حکومتی نظام میں حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ، فقہ اور قانون میں حضرت امام ابوحنیفہؒ جبکہ فکر و فلسفے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ۔ میں علماء سے درخواست کیا کرتا ہوں کہ ان شخصیات کا بطور خاص مطالعہ کریں۔ آج کے حالات کو سامنے رکھ کر گہرائی سے ان شخصیات کی اسٹڈی کریں۔ اس سے آج کے دور کے تناظر میں آپ کو اپنی جدو جہد کے حوالے سے بہت اچھی راہنمائی ملے گی اور معاملات ایک ایک کر کے آپ کے سامنے واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

فقہ حنفی، ایک ہمہ گیر فقہ:

اب میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی طرف آتا ہوں۔ امام صاحبؒ کی جدو جہد کا ایک بڑا

شعبہ علم الکلام، مناظرہ اور عقائد کی وضاحت کا تھا۔ امام صاحب کا دور تابعین کا دور تھا، اور یہ صحابہ کرامؓ کے آخر کا زمانہ تھا۔ یہ وہ دور تھا جب اعتقاد کے فتنے سر اٹھانے شروع ہوئے تھے۔ معتزلہ، خوارج، مرجعہ اور خرامیہ، یہ فتنے سر اٹھا رہے تھے۔ کوئی ظاہر پرستی کی بنیاد پر اور کوئی عقل کی بنیاد پر۔ ایک طرف خوارج کی ظاہر پرستی تھی اور دوسری طرف معتزلہ کی عقل پرستی۔ دونوں انتہاء پر کھڑے تھے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے جو کام کیا وہ فقہ کے اجتماعی مفہوم میں کیا۔ میں علماء کرام کی خدمت میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ امام صاحب کے دور میں فقہ کی یہ تعریف نہیں تھی کہ فقہ صرف احکام شرعیہ کا نام ہے۔ امام صاحبؒ نے فقہ کی جو تعریف کی ہے وہ صرف احکام پر موقوف نہیں ہے۔ فقه النفس ما له وما عليه، اس فقہ میں عقائد بھی تھے، اس میں وجدانیات بھی تھیں اور اس فقہ میں احکام بھی تھے۔ فقہ النفس، فقہ الاحکام اور فقہ العقائد۔ امام صاحبؒ جس فقہ کے فقیہ ہیں اور جس فقہ میں آپؒ نے کام کیا ہے وہ صرف احکام کی فقہ نہیں تھی بلکہ ایک کامل فقہ تھی۔

امام صاحب نے عقائد پر جو رسالہ لکھا ہے اس کا نام ہے ''الفقہ الاکبر''۔ حضرت ملا علی قاریؒ نے اس کی بڑی اچھی شرح لکھی ہے۔ ہمارے چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ نے ''البیان الازہر'' کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے جس پر حضرت والد صاحبؒ کا ''الفقہ الکبر'' کے نام سے مقدمہ ہے۔ چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک فقہ کا سب سے بڑا شعبہ عقائد کی تشریح وتعبیر تھا۔ فقہ کا دوسرا بڑا شعبہ احکام کا تھا، جسے عام طور پر ہمارے ہاں پوری فقہ سمجھا جاتا ہے۔ اور پھر فقہ النفس کا شعبہ جسے اخلاقیات کہتے ہیں، جسے تصوف کہتے ہیں، یہ بھی ہماری فقہ اور ہمارے نصاب کا حصہ تھا۔ تصوف، اخلاقیات، وجدانیات، دل کی کیفیات، عقیدے کے ساتھ دل کی صفائی، احوال کی وضاحت، یہ چیزیں بھی فقہ کا حصہ تھیں۔ لیکن ہوا یہ کہ بعد میں عقائد نے علم الکلام کا رنگ اختیار کر لیا اور دوسرے معاملات نے تصوف کا روپ دھار لیا تو ہمارے ہاں یہ تقسیم پیدا ہوگئی۔ میں اس بات کی

طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ یہ تقسیم کہ احکام تو فقہ کے دائرے میں آتے ہیں، لیکن عقائد، تصوف و اخلاقیات، یہ فقہ سے الگ کوئی چیزیں ہیں، ایسا امام صاحب کے دور میں نہیں تھا۔ امام صاحب کے ہاں یہ تمام شعبے دراصل فقہ کے شعبے ہی تھے۔ 'توضیح التر ہیب' ہماری اصولِ فقہ کی بڑی مرکزی کتاب ہے۔ اس کتاب کا آغاز ہی اس بحث سے ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ کے نزدیک فقہ صرف احکام اور معاملات کا نام نہیں ہے۔ فقہ میں عقائد بھی شامل ہیں، فقہ میں تصوف بھی شامل ہے، اور فقہ میں اخلاقیات بھی شامل ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ اور دینی تعلیم و تربیت:

آج یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ ہمارے ہاں مدارس میں تعلیم ہے لیکن تربیت نہیں ہے۔ گزشتہ دنوں مفتی رفیع عثمانی دامت برکاتہم ہمارے ہاں تشریف لائے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک جملہ کہا کہ مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے، سکھایا نہیں جاتا۔ یہ جملہ کہہ کر انہوں نے اس مسئلے کی بڑی اچھی وضاحت کی۔ ہمارے ہاں نہ عقائد کی تربیت منظم ہے اور نہ فکری تربیت۔ کیف دما اتفق۔ جیسے ہمارے بزرگ کہتے ہیں۔ چنانچہ ہماری اعتقادی اور فکری تربیت کا حال بھی یہی ہے۔ ہمارا حال خون کے الگ الگ گروپوں کی طرح ہے۔ جس کا گروپ جس شخصیت کے مزاج سے مل جاتا ہے تو بس وہ اسی کے ساتھ لگا رہتا ہے۔

کیا آپ کے خیال میں ہمارے مدارس میں فکری و اعتقادی تربیت ہو رہی ہے؟ اگر ہو رہی ہے تو کیا کسی پالیسی کے تحت ایک منظم انداز میں ہو رہی ہے؟ اور پھر اخلاقی تربیت، اعمال کی تربیت، دل اور اس کی کیفیات کی تربیت۔ کیا آپ کو ہمارے ہاں یہ خلاء محسوس ہوتے ہیں یا نہیں؟ تو میری درخواست ہے کہ ہم حضرت امام صاحبؒ کی طرف واپس چلے جائیں۔ یعنی ہم فقہ کی اس تعریف کی طرف واپس چلے جائیں جو امام ابوحنیفہؒ نے کی، اور اسے ہم اپنے نصاب کا حصہ بنا لیں۔ دماغ کی اعتقادی و فکری تربیت کو بھی، اور دل کی اخلاقی و عملی تربیت کو بھی۔ آج ہم اپنے مدارس کے نظام میں جو جو خلاء محسوس کرتے

ہیں، اس خلاء کو پُر کرنے کے لیے میں ایک تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں امام صاحبؒ کی شخصیت کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور فقہ کی اس تعریف کو سامنے رکھ کر اپنے مسائل کا حل کرنا چاہیے جو امام صاحب نے کی۔ امام غزالیؒ بھی یہی واویلا کرتے دنیا سے رخصت ہوئے کہ بھئی فقہ کی اصل بات کی طرف آئیں۔ امام غزالیؒ نے اس پر پوری لڑائی لڑی ہے کہ یتفقہ فی الدین کا مطلب صرف قدوری پڑھنا نہیں ہے۔ یتفقہ میں عقائد، تربیت، اخلاق اور دین کے تمام شعبے شامل ہیں، اور فقہ دراصل پورے دین سے عبارت ہے۔

تو میں نے ایک بات یہ عرض کی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے فقہ کے ایک عمومی دائرے مین کام کیا جس میں عقائد، احکام، اخلاقیات اور اصلاح نفس سب شامل ہیں۔ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم بھی اس عمومی دائرے کی طرف واپس جائیں جو امام صاحبؒ نے بتایا تھا۔ اس کے بغیر ہمارے نظام کی اصلاح نہیں ہوگی اور ہم اپنی دینی تعلیمی ضروریات پوری نہیں کر پائیں گے۔

امام صاحبؒ کا اصولِ استدلال:

دوسری بات یہ کہ امام صاحبؒ نے صرف احکام و معاملات کی تشریح نہیں کی بلکہ عقائد میں بھی ہمیں ایک میزان دیا ہے۔ امام صاحبؒ کا اصولِ استدلال ہمارے سامنے بار بار آتا ہے۔ امام صاحبؒ نے یہ فرمایا ہے کہ میں سب سے پہلے مسئلہ لیتا ہوں قرآن سے، پھر سنت و حدیث سے اور پھر صحابہؓ سے۔ امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں صحابہؓ کے اقوال سے باہر نہیں نکلتا۔ یعنی صحابہؓ میں کسی مسئلے پر اختلاف ہو تو صحابہؓ ہی میں سے کسی کا قول لیتا ہوں، اور ان کے اقوال سے باہر نہیں نکلتا۔ جو بات یہاں وضاحت طلب ہے وہ یہ کہ امام صاحب کا یہ اصول استدلال صرف احکام و معاملات میں ہی میزان نہیں ہے بلکہ عقیدے کا میزان بھی یہی ہے اور اس سے بڑھ کر تصوف کا میزان بھی یہی ہے۔ یعنی عقائد، احکام، اخلاقیات و

تربیت، فقہ النفس، اور دین کے دیگر تمام شعبوں میں امام صاحبؒ کا میزان یہی ہے۔

آج عقائد کی بحث ہے اور تصوف کے بھی بڑے میدان ہیں۔ آج یہ ضروری ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے جو توازن قائم کیا تھا، ہر شعبے میں اسی کو میزان مانا جائے۔ عقائد کی جو تعبیرات اس میزان پر پوری اترتی ہیں وہ صحیح ہیں اور جو پوری نہیں اترتی وہ صحیح نہیں ہیں۔ اہل السنت والجماعت کا معنٰی یہی ہے کہ عقائد و احکام کی جو تعبیرات و تشریحات امام صاحبؒ کے اس میزان پر پوری اترتی ہیں وہ اہل السنت والجماعت کے عقائد ہیں اور جو پوری نہیں اترتی وہ اہل السنت والجماعت کے عقائد نہیں ہیں۔ اسی طرح تصوف و اخلاقیات میں بھی جو کچھ امام صاحبؒ کے اس میزان پر پورا اترتا ہے وہ صحیح ہے، اور جو پورا نہیں اترتا وہ صحیح نہیں ہے۔

وحی الٰہی کی روشنی میں عقل کا استعمال:

معتزلہ اور خوارج کی دو انتہاؤں کے درمیان امام صاحبؒ نے ایک توازن قائم کرتے ہوئے بتایا کہ ہماری بنیاد قرآن و حدیث کے نصوص پر ہوگی اور نصوص کی تفہیم میں ہم عقل کا استعمال بھی کریں گے۔ لیکن ہماری ضرورت عقل کو استعمال کرنا ہے، عقل کے ہاتھوں استعمال ہونا نہیں ہے۔ ہم یہ بات بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ ایک صاحب الرائے ہیں۔ امام صاحبؒ رائے، عقل اور قیاس کی بات کرتے ہیں۔ لیکن امام صاحبؒ عقل کو استعمال کرنے کی بات کرتے ہیں، اور جہاں عقل کے ہاتھوں استعمال ہونے کی نوبت آتی ہے، وہاں وہ قرآن و سنت اور صحابہؓ کی پناہ لیتے ہیں۔ یعنی بنیاد نصوص پر ہے جن میں تین باتیں شامل ہیں۔ قرآن، حدیث اور تعامل و آثارِ صحابہؓ۔ چنانچہ تعبیر و تشریح میں ہم عقل کی نفی بالکل نہیں کرتے۔ ہم عقل کا استعمال کرتے ہیں، اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور عقل کا ایک جائز مقام ہے۔

فقہ حنفی کی مقبولیت کی وجہ:

اب میں تیسری اور آخری بات عرض کرنا چاہوں گا۔ ذرا غور فرمائیے کہ اللہ رب العزت نے امام اعظمؒ کی دین کی تعبیر کو کتنی عظمت عطا فرمائی ہے۔ اہل سنت کے اندر بھی عقائد کی تعبیر کے حوالے سے بڑے مکاتب فکر ہیں۔ اشاعرہ ہیں، ماتریدیہ ہیں اور ظواہر ہیں۔ لیکن اللہ رب العزت نے یہ مقبولیت اور یہ مقام امام ابوحنیفہؒ کو عطا فرمایا ہے کہ آج کے دور میں بھی، تمام تر داخلی اختلافات کے باوجود عقائد اور عقائد کی تعبیر و تشریح میں امام ابوحنیفہؒ ہی سند سمجھے جاتے ہیں۔ دنیا میں، عقیدے کے باب میں سب سے زیادہ پڑھائی جانے والی کتاب ''العقیدۃ الطحاویہ'' ہے۔ کوئی ابوحنیفہؒ کو اپنا امام مانتا ہے، وہ بھی اسی کتاب کو پڑھاتا ہے اور جو ابوحنیفہ کو اپنا امام نہیں مانتا وہ بھی یہی کتاب پڑھاتا ہے۔ آج کی دنیا میں اہل سنت کے عقائد کی سب سے متوازن تعبیر کی سب سے متوازن کتاب جو پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے وہ ''العقیدۃ الطحاویہ'' ہے۔ حنابلہ بھی پڑھاتے ہیں، ظواہر بھی پڑھاتے ہیں اور شافعی بھی پڑھاتے ہیں۔ مکہ مکرمہ میں بھی یہ کتاب پڑھائی جاتی ہے اور یہاں آپ کے شہر میں بھی یہی کتاب پڑھائی جاتی ہے۔ آج یہ اعزاز اللہ تعالیٰ نے امام ابوحنیفہؒ کو دیا ہے کہ تمام تر داخلی اختلافات و تعبیرات کے فرق کے باوجود دنیائے اہل سنت کے مختلف دائروں میں عقائد کی سب سے زیادہ مستند کتاب ''العقیدۃ الطحاویہ'' سمجھی جاتی ہے۔

ایک بات اور بھی آپ کی خدمت میں عرض کر دوں، جو شاید پہلے ہی آپ کے مطالعہ میں ہوگی۔ مغربی ممالک میں تو سب سے زیادہ ''العقیدۃ الطحاویہ'' پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن یہ جو مشرقی پٹی ہے، انڈونیشیا اور ملائیشیا وغیرہ، یہ سب شوافع ہیں۔ اور شوافع ہمارے بھائی ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ کے مقلدین دنیا میں تیس کروڑ سے زیادہ ہیں۔ بمبئی سے آگے نکل جائیں، سارے شوافع ہی ہیں۔ ایسٹ کی پٹی میں اکثریت شوافع کی ہے۔ لیکن شوافع کی اس ساری پٹی میں فقیہ ابو اللیث سمرقندی کی کتاب ''العقیدۃ'' سب سے زیادہ پڑھائی جاتی ہے۔

امام طحاویؒ تیسری صدی ہجری کے ہیں جبکہ ابو اللیث سمرقندیؒ چوتھی صدی ہجری کے ہیں۔ دونوں حنفی بزرگ ہیں۔

گفتگو کا خلاصہ:

اس وقت امام صاحبؒ کے مناظروں کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے لیکن میں نے امام صاحبؒ کی جدوجہد کے حوالے سے چند باتیں آپ کی خدمت میں عرض کی ہیں۔ پہلی بات میں نے یہ عرض کی کہ امام صاحبؒ کی فقہ ایک جامع اور مکمل فقہ ہے۔ فقہ حنفی صرف احکام شرعیہ کا نام ہی نہیں ہے بلکہ یہ دین کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ امام صاحب نے عقل وفکر اور وحی الٰہی کی کشمکش کے تناظر میں ایسا میزان قائم کیا کہ ان کے دور میں بھی دنیا نے اس میزان کو تسلیم کیا اور آج کی دنیا میں بھی اس میزان کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔ تیسری بات میں نے یہ عرض کی کہ یہ اعزاز بھی امام ابوحنیفہؒ کا ہے کہ آج کی دنیا میں بھی اور آج کے مدارس میں بھی ایک طرف عقیدے کے باب میں سب سے زیادہ پڑھائی جانے والی کتاب ''العقیدۃ الطحاویۃ'' ہے، جبکہ دوسری طرف فارس کی پوری پٹی میں عقیدے کی پڑھائی جانے والی کتاب ''العقیدۃ'' ہے۔ ان دونوں کتابوں کے مصنفین حنفی مکتب فکر کے عالم تھے۔ اللہ رب العزت نے اہل سنت کے عقائد کی وضاحت میں اور علم الکلام کی تشریحات وتعبیرات میں امام صاحبؒ کو اور ان کے شاگردوں کو یہ اعزاز عطا کیا ہے۔ اللہ کرے کہ ہم بھی اس سے کچھ استفادہ کرسکیں اور ہم بھی اس معاملے میں کوئی خدمت سرانجام دے سکیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

حج کا سب سے بڑا سبق

"11 اکتوبر 2010ء کو بعد نماز عصر لنڈا بازار لاہور کی جامع مسجد کوثر میں عازمین حج سے خطاب"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

جو حضرات حج بیت اللہ کے لئے جا رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے لئے اسے مبارک کریں اور سب مسلمانوں کو اپنے گھر کی حاضری نصیب فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

حج اسلام کے بنیادی فرائض اور ارکان میں سے ہے جناب نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے

(1) کلمہ شہادت کا اقرار (2) نماز (3) زکوٰۃ (4) روزہ (5) حج

جبکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سورۃ آل عمران آیت نمبر 97 ارشاد فرمایا ہے کہ . . .

"وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً"

اللہ تعالیٰ کے لئے لوگوں پر حج فرض ہے جو بیت اللہ شریف تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، استطاعت کی حد فقہاء کرام نے یہ بیان کی ہے کہ حرم پاک تک پہنچنے اور واپسی کا کرایہ، جتنے دن وہاں رہنا ہے ان کا خرچہ اور اس دوران گھر کے معمول کے اخراجات کا خرچہ جس مسلمان کے پاس ہو اس پر حج فرض ہے اس کے ساتھ ہی آمدورفت کی سہولت

اور راستے کا پرامن ہونا بھی اس میں شامل ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کے گھر کی حاضری ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ کے روضۂ اطہر کی حاضری ہے جو بہت بڑی سعادت اور برکت کی بات ہے اور جنہیں نصیب ہو جائے وہ بہت خوش نصیب ہیں۔

حج ایک ایسی عبادت ہے جس میں مال بھی لگتا ہے، وقت بھی لگتا ہے، اور مشقت بھی اٹھانا پڑتی ہے، یہ بہت مشقت کا عمل ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ اگر میسر آجائے تو جوانی میں ہی کر لینا چاہیے، بڑھاپے میں اتنی مشقت اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے، مجھے یاد ہے کہ 1985ء میں حج کے موقع پر جب ہم منیٰ سے سامان اٹھا کر واپسی کی تیاری کر رہے تھے تو ہمارے ساتھ والے خیمے میں ایک ضعیف بڑھیا اپنے سامان کی گٹھڑی باندھے اپنے کسی ساتھی کا انتظار کر رہی تھی کافی دیر انتظار کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ بیٹا یہ گٹھڑی میرے سر پر رکھ دو، میں نے جب وہ گٹھڑی بڑھیا کے سر پر رکھی تو اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ:

''پتر! رب گناہ تے معاف کردا ای پر ''منجھ'' کڈھ کے کردا ای''

مجھے اب تک بڑھیا کے یہ الفاظ اور اس کا لہجہ یاد ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ گناہ تو معاف کرتا ہے مگر کچومر نکال کر کرتا ہے۔''

بڑھاپے میں ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے اس لئے کوشش یہ کرنی چاہیے کہ حج جوانی میں ہو جائے تاکہ اطمینان کے ساتھ سارے مناسک ادا کئے جاسکیں، اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حج کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے حج کا طریقہ اور اس کے مسائل سیکھ لئے جائیں اور اس کا نقشہ اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے، کیونکہ وہاں ہجوم ہوتا ہے، رش ہوتا ہے اور بسا اوقات نفسا نفسی کا عالم ہو جاتا ہے اگر پہلے سے معلوم نہ ہو اور وہاں ہر جگہ آدمی یہ پوچھتا پھرے کہ اب کیا کرنا ہے اور اب کدھر جانا ہے، تو بہت سے ضروری کام رہ جاتے

ہیں، اس لئے یہ ضروری ہے کہ حج کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے اس کا طریقہ، مسائل، آداب اور احکام اچھی طرح معلوم کر لئے جائیں اور اپنے کسی معتمد عالم دین سے جس نے حج کر رکھا ہو اس کی تربیت حاصل کر لی جائے اتنی محنت کا عمل جب کوئی شخص کرتا ہے تو اس کی فطری طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ یہ عمل قبول بھی ہو اور ہر شخص کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی یہ محنت اور عمل قبولیت کے قابل ہو جائے کیونکہ جناب نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس کو حج مقبول نصیب ہو جائے وہ گناہوں سے ایسے پاک ہو جاتا ہے جیسے پیدا ہوتے وقت پاک تھا، حج مقبول کی علامت کیا ہے جس سے پتہ چل جائے کہ حج قبول ہو گیا ہے؟ اصل علم تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس کس کا حج قبول ہوا ہے مگر بعض بزرگوں نے اس کی علامت یہ بیان کی ہے اگر حج کے بعد کی زندگی اس سے پہلے کی زندگی سے مختلف ہے اور حج نے اس کے اعمال اور اخلاق و عادات میں بہتر تبدیلی پیدا کی ہے تو یہ خوشی کی بات ہے اور اس بات کی علامت ہے کہ حج قبول ہو گیا ہے لیکن اگر حج کے بعد خدانخواستہ پہلے جیسے اچھے اعمال بھی نہیں رہے اور حاجی صاحب کا چھرا پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو گیا ہے تو فکر کرنے کی بات ہے کیونکہ یہ اشارہ ہے کہ حاجی صاحب نے حج کا کچھ اثر بھی قبول نہیں کیا۔

بیت اللہ کا یہ حج جناب نبی اکرم ﷺ سے پہلے بھی ہوتا تھا اور جاہلیت کے زمانے میں بھی لوگ اللہ تعالیٰ کے گھر کے طواف کے لئے آتے تھے لیکن اس میں بہت سی رسوم اور خرافات شامل ہو گئی تھیں جن کی وجہ سے حج کا اصل مقصد ہی فوت ہو کر رہ گیا تھا اس لئے اسلام نے اس میں بہت سی اصلاحات کی ہیں، قرآن کریم نے اس کی بہت سی جاہلی رسوم کو ختم کیا ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ نے بعض سابقہ روایات کو تبدیل کیا ہے ان میں سے چند اصلاحات کا میں آج کی مجلس میں آپ حضرات کی معلومات کے لئے تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

بت پرستی کا خاتمہ:

جاہلیت کے دور میں بیت اللہ اور اس کے ارد گرد سینکڑوں بت لوگوں نے کھڑے کر رکھے تھے جن کی پوجا ہوتی تھی اور بیت اللہ کے طواف کے لئے آنے والے لوگ ان بتوں کی بھی عبادت کرتے تھے جناب نبی اکرم ﷺ نے بیت اللہ کو اور اس کے پورے ماحول کو بتوں سے پاک کیا اور سارے بتوں کو توڑ کر یہ تعلیم دی کہ ساری دنیا میں صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے مگر بیت اللہ اور حرم پاک کے ماحول کو بالخصوص شرک اور بت پرستی سے مکمل طور پر پاک رکھا جائے اور ہر قسم کی عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے مخصوص کی جائے۔

غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع:

جناب نبی اکرم ﷺ کے حج کے لئے تشریف لے جانے سے قبل ہر قسم کے لوگ بیت اللہ کے طواف عمرہ اور حج کے لئے آتے تھے اور مسلم کافر کی کوئی تمیز نہیں تھی مگر قرآن کریم نے حرم مکہ میں یہ کہہ کر مشرکین کے داخلہ کی مخالفت کر دی کہ ......

''فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا''

* اس سال کے بعد مشرک اور کافر مسجد حرام کے قریب نہیں آسکیں گے سورۃ التوبہ آیت نمبر 28 اور فتح مکہ کے بعد 9 ہجری والے حج کے موقع پر جناب نبی اکرم ﷺ نے باقاعدہ اعلان کرایا کہ اگلے سال کوئی مشرک و کافر حج کے لئے نہیں آئے گا اس طرح حج عمرہ اور طواف کی عبادت کو صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا اور اس میں کسی کافر کی شرکت ممنوع قرار دے دی گئی چنانچہ اس کے بعد سے حرم پاک اور حج صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص چلا آرہا ہے اور کسی غیر مسلم کو وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے چوری چھپے بھیس بدل کر اور مسلمانوں کا روپ اختیار کر کے بہت سے لوگ وہاں چلے جاتے ہیں لیکن باقاعدہ شرعاً اور قانوناً کسی کو اس کی اجازت نہیں دی جاتی۔

ننگے طواف کی ممانعت:

جاہلیت کے دور میں حج کے لئے آنے والے بہت سے قبائل کے لوگ بیت اللہ کا طواف ننگے ہو کر کرتے تھے اور ان کی دلیل یہ ہوتی تھی کہ یہ ہماری نیچرل حالت ہے کہ ہم دنیا میں ننگے آئے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ کے گھر میں ننگے حاضری دیتے ہیں، مرد بھی ننگے ہوتے تھے اور عورتیں بھی پہلوانوں والی ایک لنگوٹی کے سوا کوئی لباس نہیں پہنتی تھیں بلکہ عورتیں طواف کرتے ہوئے تلبیہ کے ساتھ ساتھ یہ شعر بھی پڑھا کرتی تھیں کہ

اليوم يبدو كله او بعضه
فالذی يبدو فلا احله

آج کے دن میرا بدن سارا ننگا ہو یا اس کا کچھ حصہ ننگا ہو مگر جتنا جسم ننگا ہے میں اس کو کسی کے لئے حلال نہیں کرتی یعنی کسی کو اسے دیکھنے کی اجازت نہیں دیتی گویا اس دور میں اتنی حیا بہر حال باقی تھی کہ عورتیں اپنی عریانی کی طرف لوگوں کو دعوت نظارہ نہیں دیتی تھیں آج کی عورت ننگی بھی ہوتی ہے اور سب لوگوں کو کھلم کھلا دعوت نظارہ بھی دیتی ہے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بے حیائی کی بھی ممانعت فرما دی اور اپنے حج پر تشریف لے جانے سے ایک سال قبل باقاعدہ اعلان کرا دیا کہ اگلے سال سے کوئی مرد یا عورت ننگی حالت میں بیت اللہ کا طواف نہیں کرسکیں گے، مرد کے لئے دو چادریں ضروری ہوں گی اور عورت مکمل لباس میں ہوگی اس طرح حج بیت اللہ کو جاہلیت کی اس بے حیائی سے بھی پاک کر دیا گیا۔

وی آئی پی سسٹم ختم:

عرفات کی حاضری اور 9 ذی الحجہ کا دن وہاں گزارنا حج کا بنیادی رکن ہے مگر قریش وہاں نہیں جایا کرتے تھے اور حرم کی حدود میں ہی رہتے تھے وہ کہتے تھے کہ ''نحن حمس'' اس کا

ترجمہ میں یہ کیا کرتا ہوں کہ "ہم وی آئی پی ہیں" عرفات کی حاضری باقی لوگوں کے لئے ہے ہمارے لئے نہیں ہے بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق حضرت جبیر بن مطعمؓ فرماتے ہیں کہ میں نو ذی الحجہ کو اپنے اونٹوں کی تلاش میں عرفات تک گیا تو وہاں حضرت محمد ﷺ کا خیمہ بھی دیکھا جس پر مجھے تعجب ہوا اور میں نے لوگوں سے پوچھا کہ ان کا یہاں کیا کام؟ یہ تو قریشی ہیں اسلام نے یہ وی آئی پی سسٹم بھی ختم کر دیا اور قریش کو حکم دیا کہ

"ثُمَّ اَفِيۡضُوۡا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ" سورۃ بقرہ آیت نمبر 199

تم بھی (عرفات میں) وہیں وقوف کرو جہاں باقی لوگ کرتے ہیں اور اپنے گناہوں پر استغفار کرو اس طرح یہ وی آئی پی سسٹم ختم کر دیا گیا ویسے بھی حج اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب برابر ہیں نہ کوئی وی آئی پی ہے اور نہ ہی کسی کا پروٹوکول اور پرسٹیج ہے، انسانوں میں مساوات کا حقیقی منظر اللہ تعالیٰ کے گھر میں ہی نظر آتا ہے کہ کوئی بادشاہ ہے یا رعیت، امیر ہے یا غریب، مالک ہے یا مزدور، پیر ہے یا مرید اور بڑا ہے یا چھوٹا سب کے سب ایک ہی رنگ کی دو سفید چادروں میں اپنے رب کے حضور عاجزی اور زاری کر رہے ہیں اور کوئی تفریق یا امتیاز باقی نہیں رہ گیا۔

صفا مروہ کی سعی:

جاہلیت کے زمانے میں حج اور عمرہ میں بیت اللہ کا طواف تو سب لوگ کرتے تھے مگر صفا اور مروہ کی سعی سب نہیں کرتے تھے صرف قریش اور ان کے حلیف قبائل صفا مروہ کی سعی کرتے تھے باقی قبائل نے اس کی جگہ اپنے اپنے الگ بت خانے بنا رکھے تھے جہاں وہ طواف بیت اللہ کے بعد چلے جاتے تھے اور ان بت خانوں کی حاضری کو صفا مروہ کی سعی کا متبادل قرار دیتے تھے۔

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہ سعی چونکہ حضرت ہاجرہؑ کی یاد میں ہے جو قریش کی ماں

تھی اس لئے یہ سعی انہی کے لئے ہے دوسروں کے لئے نہیں ہے، صفا مروہ کی سعی نہ کرنے والوں میں انصار مدینہ کے دونوں قبائل اوس اور خزرج بھی شامل تھے، حضرت انس بن مالکؓ جو انصار میں سے تھے فرماتے ہیں کہ ہم اسے جاہلیت کی بات سمجھتے تھے کہ ماں نے ایک دفعہ دوڑ لگائی ہے تو قیامت تک اس کے بیٹے بھی دوڑتے رہیں۔

- انصار مدینہ کے دونوں قبائل جاہلیت کے زمانے میں بیت اللہ کا طواف کرنے کے بعد قدید کے مقام پر اپنے بت خانے ''مناۃ'' میں چلے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہماری سعی یہاں کی حاضری ہے لیکن فتح مکہ کے بعد جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرے بت خانوں کی طرح ''مناۃ'' کا بھی صفایا کر دیا تو انصار مدینہ کیلئے مسئلہ بن گیا کہ ہمارے مہاجر بھائی تو طواف کے بعد صفا مروہ کی سعی کر لیں گے مگر ہم کہاں جائیں گے؟ ہمارا مناۃ تو ختم کر دیا گیا ہے اور صفا مروہ کی سعی کو ہم جاہلیت کی روایت سمجھا کرتے تھے، چنانچہ انصار مدینہ کی طرف سے اس بارے میں سوال کے بعد سورۃ بقرہ کی یہ آیت نمبر 182 نازل ہوئی کہ ......

''إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا''

بے شک صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہیں پس جو شخص حج یا عمرہ کرے تو کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ ان کی سعی بھی کر لے، پہلے ذہن صاف کیا کہ صفا مروہ کی سعی صرف قریش کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ دو پہاڑیاں خود شعائر اللہ میں سے ہیں پھر فرمایا کہ صفا مروہ کی سعی کو جاہلیت سمجھنے والوں کی سوچ درست نہیں ہے بلکہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس طرح صفا مروہ کی سعی جو اس سے پہلے صرف قریش اور ان کے دوست قبائل کیا کرتے تھے اسے باقاعدہ حج اور عمرے کا حصہ بنا کر سب لوگوں کے لئے ضروری قرار دیا گیا۔

گھروں میں دروازے سے داخل ہو:

جاہلیت کے زمانے میں ایک رواج یہ بھی تھا کہ مکہ مکرمہ کے لوگ جب احرام باندھ کر حج کے لئے گھر سے روانہ ہو جاتے تھے اس کے بعد حج مکمل ہونے سے پہلے اگر کسی کام سے گھر آنا پڑتا تو گھر میں دروازے سے داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ عقب سے چھت پھلانگ کر یا نقب لگا کر گھر میں داخل ہوتے تھے ان کا خیال یہ تھا کہ حج مکمل ہوئے بغیر احرام کی حالت میں دروازے سے گھر میں آنا اچھا شگون نہیں ہے، قرآن کریم کی سورۃ بقرہ آیت نمبر 189 نے یہ رسم بھی ختم کر دی اور فرمایا کہ

''وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا''

احرام کے دوران گھر میں کسی ضرورت سے آنا پڑے تو گھر کے دروازے سے ہی گھر میں داخل ہو۔

مزدلفہ اور منیٰ کی روانگی:

جاہلیت کے زمانے کی ایک روایت یہ بھی تھی کہ نو ذی الحجہ کو عرفات میں دن گزار کر شام کو مزدلفہ جانے کے لئے غروب آفتاب سے پہلے ہی لوگ روانہ ہو جاتے تھے جبکہ اگلے روز مزدلفہ سے منیٰ جانے کے لئے سورج طلوع ہو جانے کے کافی دیر بعد روانگی کرتے تھے جناب نبی اکرم ﷺ نے اس کی ممانعت فرما دی اور فرمایا کہ ہم عرفات سے مزدلفہ کی طرف غروب آفتاب کے بعد روانہ ہوں گے اور مزدلفہ سے منیٰ کی طرف دس ذی الحجہ کو سورج طلوع سے قبل روانگی کریں گے، یہ وہ چند تبدیلیاں اور صلاحات ہیں جو جناب نبی اکرم ﷺ نے حج اور عمرہ کے جاہلیت کے دور سے چلے آنے والے نظام میں کیں اور جاہلی رسوم وخرافات کا خاتمہ کر کے اسے ایک صحیح عبادت کی شکل دی مگر اس کے ساتھ حج کے حوالہ سے میں ایک اور بات کا تذکرہ بھی کرنا چاہوں گا کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے حجۃ

الوداع کے تاریخی خطبہ میں ایک جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ......

''كُلُّ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعٌ تَحْتَ قَدَمَيَّ''

جاہلیت کی ساری روایات اور رسوم آج میرے قدموں کے نیچے ہیں گویا نبی اکرم ﷺ نے اعلان فرمایا کہ میں دور جاہلیت کا خاتمہ کر کے اسلام اور روشنی کی طرف اپنی امت کو لے کر جا رہا ہوں، سوال یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے آخری حج کے موقع پر جاہلیت کی جن رسموں کو قدموں کے نیچے روندنے کا اعلان کیا تھا کیا وہ ہماری سوسائٹی میں دوبارہ تو واپس نہیں آ گئیں؟

شرک، بت پرستی، باہمی قتل وقتال، شراب، جوا، سود، عریانی، ناچ گانا، زنا، نسلی تفاخر، اور قبائلی عصبیت جیسی جاہلی رسوم و عادات جنہیں نبی اکرم ﷺ نے سوسائٹی سے ختم کر کے مسلم معاشرے کو ان سے پاک کر دیا تھا اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں تلقین فرمائی تھی کہ ''لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ ضُلَّالًا'' میرے بعد پھر گمراہی کے دور میں واپس نہ چلے جانا، وہ ساری کی ساری جاہلی رسوم و خرافات آج پھر ہماری سوسائٹی میں واپس آ گئی ہیں اور ہم عملاً جاہلیت اور گمراہی کے دور کی طرف واپس چلے گئے ہیں اس لئے آج ہمارے لئے حج کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ ہم جاہلیت کے دور سے نکلنے کی کوشش کریں اور اسلام کی روشن تعلیمات کو سوسائٹی میں عملی طور پر واپس لانے کی جدوجہد کریں اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائیں. آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

عید قربان اور اس کا فلسفہ

"28 نومبر 2009ء کو مرکزی عید گاہ اہل سنت مبارک شاہ روڈ گوجرانوالہ میں نماز عید الاضحیٰ کے اجتماع سے خطاب"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

آج عید کا دن ہے، قربانی کی عید جس میں دنیا بھر کے مسلمان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نذرانہ پیش کرنے کے لئے جانور ذبح کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنا مال خرچ کرتے ہیں، یہ قربانی نسل انسانی کے آغاز سے چلی آرہی ہے، قرآن کریم نے سب سے پہلی قربانی کا حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ھابیل اور قابیل کے حوالہ سے ذکر کیا ہے ،ان کا رشتے پر جھگڑا ہو گیا تھا، فیصلے کے لئے انہیں قربانی پیش کرنے کو کہا گیا دونوں نے قربانی پیش کی ایک کی قبول ہوئی جو اس کے حق میں فیصلے کی علامت تھی اور دوسرے نے غصے اور انتقام میں بھائی کو قتل کر دیا۔

اسلام سے پہلے قربانی کی قبولیت کی علامت:

اس دور میں قربانی کی قبولیت کی علامت یہ ہوتی تھی کہ قربانی خواہ جانور کی صورت میں یا کسی اور شکل میں اسے میدان میں رکھ دیا جاتا تھا، آسمان سے آگ آکر اسے جلا دیتی تھی جو اس قربانی کے قبول ہو جانے کی علامت ہوتی تھی، آسمانی آگ سے جل

جانے والی یہ قربانی موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی تھی جس کا ذکر بائیبل میں ”سوختنی قربانی“ کے نام سے موجود ہے اور قرآن کریم کی سورۃ آل عمران آیت نمبر 183 میں بھی اس حوالہ سے اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب یہود مدینہ نے جناب نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ وہ کسی رسول پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک وہ ......

حَتّٰى　يَأْتِيَنَا　بِقُرْبَانٍ　تَأْكُلُهُ　النَّار

ایسی قربانی نہ پیش کردے جسے آگ جلاڈالے

یہ وہی سوختنی قربانی ہے جو بنی اسرائیل میں رائج تھی اور اسی کا جناب نبی اکرم ﷺ سے مدینہ منورہ کے یہودیوں نے تقاضا کیا تھا، اس کا جواب قرآن کریم نے یہودیوں کو یہ دیا کہ پھر تم نے بنی اسرائیل کے ان انبیاء اکرام علیہم السلام کو کیوں قتل کر دیا تھا؟ جو واضح دلائل لانے کے ساتھ ساتھ تمہارے کہنے کے مطابق سوختنی قربانی بھی پیش کر چکے تھے۔

قربانی کی تاریخ پرانی ہے اور نبی کا خواب وحی ہوتا ہے:

یہاں یہ بات عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قربانی کی تاریخ بہت پرانی ہے، اس کا ذکر حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کے حوالہ سے بھی ملتا ہے اور بنی اسرائیل کے حوالہ سے بھی موجود ہے اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کا تو قرآن کریم نے اہتمام اور تفصیل کے ساتھ کیا ہے کہ انہوں نے جب خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کر رہے ہیں تو اسے حکم خداوندی سمجھتے ہوئے اس کے لئے تیار ہو گئے، اللہ تعالیٰ کے نبی کا خواب وحی ہوتا ہے، حجت ہوتا ہے اور دلیل ہوتا ہے، یہ ہمارے آپ کے خواب کی بات نہیں کبھی سچا بھی ہو جاتا ہے مگر اکثر غلط ہی ہوتا ہے اسی لئے وہ حجت اور دلیل نہیں ہے جبکہ پیغمبر کے خواب اور بیداری میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور جیسے پیغمبر پر بیداری میں نازل ہونے والی بات وحی ہوتی ہے اسی طرح خواب میں ہونے والا اشارہ بھی وحی کا درجہ رکھتا ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ خواب اپنے جواں سال اور اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بتایا تو وہ بھی اس حقیقت کو سمجھتے تھے کہ یہ پیغمبر کا خواب ہے اس لئے کسی تردد اور تذبذب کے بغیر تیار ہو گئے کوئی تفصیل نہیں پوچھی کوئی وجہ دریافت نہیں کی بے ساختہ جواب دیا ''یَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ '' ابا جان جو حکم ہوا ہے کر گزریے مجھے آپ صبر و حوصلہ کے ساتھ تعمیل کرنے والا پائیں گے۔

''فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ '' دونوں یعنی باپ بیٹا اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے جھک گئے اور باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کیلئے پیشانی کے بل زمین پر لٹا دیا۔

باپ نے اپنی طرف سے ذبح کر دیا اور بیٹا اپنے تئیں ذبح ہو گیا مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا آواز آئی اے ابراہیم ؑ! آپ نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، یہ آزمائش تھی جس میں پورا اترنے کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کی زندگی بھی بچا لی اور باپ بیٹے کو قربانی کی قبولیت کا پروانہ بھی دے دیا، ابراہیم علیہ السلام کو ذبح عظیم سے نوازا اور ''وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ '' ہم نے اس سنت پر بعد والوں کو قائم کر دیا، اسی لئے جب جناب نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ ''مَا هٰذِهِ الْأَضَاحِيُّ يَا رَسُوْلَ اللهِ '' یا رسول اللہ۔

قربانی کیا ہے؟

یہ قربانی کیا ہے؟ تو جواب میں فرمایا کہ ''سُنَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ '' تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے، نبی اکرم ﷺ نے اسے ابراہیم علیہ السلام کی سنت بھی فرمایا اور خود اپنی سنت سے بھی تعبیر کیا، بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس نے عید کی نماز ادا کرنے کے بعد قربانی کی ''فَقَدْ أَصَابَ سُنَّتَنَا '' اس نے ہماری سنت کو پالیا اس لئے قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت بھی ہے اور جناب

نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ بھی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے دس سال مدینہ منورہ میں قیام فرمایا اور وہ ہر سال قربانی کرتے تھے، انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ ہر سال دو مینڈھے قربانی کیا کرتے تھے اور میں بھی دو مینڈھے قربانی دیتا ہوں، ایک روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ قربانی میں دو مینڈھے ذبح کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ایک جانور اپنی طرف سے قربان کر رہا ہوں اور دوسرا اپنی اُمت کے ان افراد کی طرف سے ذبح کر رہا ہوں جو قربانی نہیں کر سکیں گے۔

یہاں ایک فرق ذہن میں رکھیں کہ نبی اکرم ﷺ نے قربانی امت کے ان افراد کی طرف سے کی ہے جو قربانی نہیں کر سکیں گے اور اس کی استطاعت نہیں رکھتے ہوں گے، ان کی طرف سے نہیں کی جو استطاعت رکھتے ہوئے بھی قربانی نہیں کریں گے ان کے بارے میں الگ حکم بیان فرمایا کہ ''مَنْ وَجَدَ سَعَةً وَلَمْ يَضَحِّ فَلَا يَقْرِبَنَّ مُصَلَّانَا'' جس نے قربانی کی استطاعت پائی اور قربانی نہیں کی وہ ہماری عید گاہ کے قریب نہ آئے، یہ لا تعلقی کا اظہار ہے اور برأت کا اظہار ہے ان لوگوں سے جو استطاعت رکھتے ہوئے بھی قربانی نہیں کریں گے لیکن جو لوگ استطاعت نہیں رکھتے ہوں گے اور ناداری کی وجہ سے قربانی نہیں کر سکیں گے انہیں بھی محروم نہیں رکھا اور فرمایا کہ ان کی طرف سے میں قربانی کر کے جا رہا ہوں۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اپنی قدر و قیمت اور عظمت کے اعتبار سے کون سی قربانی بڑی ہے؟ ان کی قربانی جو خود قربانی کر رہے ہیں یا ان کی قربانی جن کی طرف سے نبی اکرم ﷺ نے قربانی کی تھی، میرا ایمان ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی ایک قربانی پوری اُمت کے لئے کافی ہے اور نبی اکرم ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے کی جانے والی قربانی کی طرف نسبت بھی ایک مسلمان کے لئے باعث سعادت و نجات ہے۔

بہر حال نبی اکرم ﷺ نے خود قربانی کی ہے اور امت کو قربانی کرنے کا حکم دیا ہے ،حضرت عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ عید الاضحی کے موقع پر جناب نبی اکرم ﷺ نے بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ میرے سپرد کیا اور فرمایا کہ اسے میرے صحابہ میں قربانی کے لئے تقسیم کر دو، حضرت علی کرم اللہ وجہہ دو جانور عید قربان پر ذبح کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ مجھے نبی اکرم ﷺ نے وصیت فرمائی تھی کہ ان کی طرف سے بھی قربانی دیا کروں اس لئے میں ایک جانور ان کی طرف سے ذبح کیا کرتا ہوں۔

قربانی کی شرعی حیثیت کے انکاریوں کا عذر لنگ:

آج کل بعض لوگوں کی طرف سے یہ شوشہ چھوڑا جاتا ہے کہ قربانی صرف اس لئے تھی کہ حج کے موقع پر منٰی میں حاجیوں کی ایک بڑی تعداد جمع ہو جاتی ہے، ان کی مہمان نوازی کے لئے کچھ جانور ذبح کرنے کا حکم دیا گیا لیکن یہ بہت بڑا مغالطہ ہے اس لئے کہ میں نے آپ کے سامنے قربانی کے بارے میں جتنی روایات کا ذکر کیا ہے ان سب کا تعلق مدینہ منورہ سے ہے اور یہ ساری قربانیاں مدینہ منورہ میں ہوئی ہیں، کوفہ میں ہوئی ہیں اور بصرہ میں ہوتی رہی ہیں۔

قربانی کے بارے میں ایک مغالطہ اور بھی دیا جاتا ہے کہ قربانی کے لئے جانور ذبح کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کی بجائے نقد رقم خرچ کر کے بھی یہ ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے اور قربانی کا مقصد پورا کیا جا سکتا ہے، یہ بھی قطعی طور پر غلط ہے اس لئے کہ قربانی عبادت ہے اور کسی عبادت کی جو صورت جناب نبی اکرم ﷺ نے متعین فرمادی ہے وہ اسی صورت میں ادا ہوگی تو وہ عبادت میں شمار ہوگی ورنہ نہیں ہوگی، مثلاً فجر کی نماز میں دو رکعت فرض ہیں جو ایک خاص کیفیت میں ادا کی جاتی ہیں کوئی صاحب ان کی بجائے فجر کا سارا وقت قرآن کریم کی تلاوت میں گزار دیں اور کہیں کہ میں نے عبادت ہی تو کی ہے بلکہ زیادہ وقت صرف کیا ہے تو ان کی دو گھنٹے تلاوت آٹھ دس منٹ میں پڑھی جانے والی دو رکعتوں کا

متبادل نہیں ہوگی اور وہ فرض نماز کے تارک ہی متصور ہوں گے، اسی طرح اگر کسی شخص پر حج فرض ہوگیا ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں حج پر دو، چار لاکھ روپے خرچ کرنے کی بجائے دس لاکھ روپے کسی مسجد پر لگا دیتا ہوں تو دس لاکھ نہیں بلکہ دس کروڑ لگا کر اگر وہ انتہائی خوبصورت اور وسیع مسجد تعمیر کر دے تب بھی یہ اس کے حج کا متبادل نہیں ہوگا اور وہ شخص فریضہ حج کے ترک کا مرتکب قرار پائے گا، اسی طرح قربانی اسی صورت میں قبول ہوگی جس شکل میں جناب نبی اکرم ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے اس سے ہٹ کر اس کی جگہ دس گنا رقم بھی خرچ کر دی جائے تو وہ قربانی متصور نہیں ہوگی میں اس پر بخاری شریف کی ایک روایت کا حوالہ دینا چاہوں گا، اس روایت کی تفصیل سن کر خود آپ لوگ فیصلہ کر لیں کہ قربانی کس شکل میں قبول ہوتی ہے اور کس صورت میں قبول نہیں ہوتی۔

قربانی کے دن کی ترتیب:

بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم ﷺ نے ایک بار عید الاضحیٰ کے خطبہ میں فرمایا کہ قربانی کے دن کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے عید کی نماز ادا کی جائے اور اس کے بعد قربانی کی جائے جس نے نماز سے پہلے قربانی کی ہے اس کی قربانی نہیں ہوئی اور اسے دوبارہ قربانی کرنا ہوگی۔

یہ سن کر ایک صحابی حضرت ابو بردہ بن نیازؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں تو نماز کے لئے گھر سے روانہ ہونے سے قبل قربانی کی نیت سے جانور ذبح کر کے آیا ہوں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ وہ عام گوشت کی طرح ہے جو تم نے اپنے گھر والوں کو کھلایا ہے اس کی جگہ تمہیں دوسرا جانور ذبح کرنا ہوگا، حضرت ابو بردہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں مگر میرے پاس اب ایک جانور ہے جو عمر میں کم ہے اور قربانی کے لئے عمر کی شرط پوری نہیں کرتا کیا میں اسے ذبح کر سکتا ہوں؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں بطور خاص اس کی اجازت دے رہا ہوں تم اس کم عمر والے جانور کو ذبح کر سکتے ہو لیکن

تمہارے علاوہ کسی اور کو یہ رعایت حاصل نہیں ہوگی۔

اس روایت سے دو باتیں بالکل واضح ہیں ایک یہ کہ قربانی میں جانور ہی ذبح کرنا ہے اور دوسری یہ کہ جانور بھی عمر اور وقت کی شرط کے مطابق ذبح ہوگا تو قربانی ہوگی ورنہ نہیں ہوگی۔

اس لئے میں آپ سب حضرات سے عرض کرتا ہوں کہ قربانی سنت کے مطابق اور جناب نبی اکرم ﷺ کی ہدایات کے مطابق ادا کریں اور آج کل کے زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کی باتوں کی طرف نہ جائیں جو خود بھی کنفیوژڈ ہیں اور دوسرے مسلمانوں کو بھی کنفیوژن کا شکار کرنے میں مصروف ہیں۔

قربانی میں اللہ کو تقویٰ مطلوب ہے وہاں غریبوں کے لئے اللہ کی طرف سے مہمانی بھی ہے:

قربانی کے حوالہ سے میں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ قربانی کا ایک پہلو وہ ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اور وہ انسان کا خلوص اور اس کی نیت ہے اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ ہمیں تمہارے جانور کے گوشت اور خون سے کوئی غرض نہیں ہے ''وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ'' اللہ تعالیٰ کے پاس تو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے یعنی تمہاری نیت اور خلوص کا اعتبار ہوتا ہے، یہ تو قربانی کا وہ پہلو ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے اور یہ خدا اور اس کے بندے کا معاملہ ہے لیکن قربانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کی مہمانی ہے یعنی کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ ذریعہ بناتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نمائندے بن کر اس کے بندوں کو ان دنوں میں کھلائیں پلائیں، گویا قربانی کرنے والے کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے کارندے کی ہے اور یہ بہت بڑی سعادت اور خوش بختی کی بات ہے، اس لئے اس بات کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے کہ اپنے محلہ میں، برادری میں اور ارد گرد

کے ماحول پر نظر رکھتے ہوئے کوشش کی جائے کہ کوئی شخص اس سے محروم نہ رہ جائے، بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک بار عید الاضحی کے موقع پر کچھ قبائل کے مفلوک الحال لوگ مدینہ منورہ آئے ہوئے تھے ان کی رعایت کرتے ہوئے جناب نبی اکرم ﷺ نے عید کے خطبے میں اعلان فرمادیا کہ کسی شخص کے گھر میں تیسرے دن کے بعد گوشت کا کوئی حصہ باقی نہ رہے، مقصد یہ تھا کہ قربانی کے گوشت کو بچا کر نہ رکھا جائے بلکہ سارے کا سارا لوگوں کو کھلا دیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور کسی صحابی نے گوشت کی ایک بوٹی بھی تین دن کے بعد گھر میں بچا کر نہ رکھی۔ اگلے سال عید الاضحی کے موقع پر صحابہ کرامؓ نے نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت گھر میں نہ رکھنے کا حکم اب بھی باقی ہے یا وہ صرف گزشتہ سال کے لئے تھا؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ وہ حکم صرف گزشتہ سال کے لئے تھا اب تم گوشت کھا بھی سکتے ہو اور ذخیرہ بھی کر سکتے ہو۔

اتفاق سے حضرت ابوسعیدؓ خدری کو یہ دوسرا حکم معلوم نہیں تھا وہ سفر پر تھے واپس آئے تو گھر والوں نے کھانے میں گوشت پیش کیا اور بتایا کہ قربانی کا گوشت ہم نے بچا کر رکھا ہوا تھا، حضرت ابوسعید خدریؓ نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک نبی اکرم ﷺ سے خود نہ پوچھ لوں میں یہ گوشت نہیں کھاؤں گا۔

نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ پابندی والا حکم صرف گزشتہ سال کے لئے تھا کہ اس موقع پر کچھ مفلوک الحال اور نادار لوگ آئے ہوئے تھے ان کی وجہ سے میں نے یہ پابندی لگا دی تھی اور اس سال میں نے اجازت دے دی ہے کہ قربانی کا گوشت کھا سکتے ہو اور ذخیرہ بھی کر سکتے ہو میں اسی روایت کے حوالہ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ چند مفلوک الحال لوگوں کے مدینہ منورہ آنے کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے تین دن سے زیادہ گوشت گھر میں رکھنے پر پابندی لگا دی تھی تو آج بھی ہمیں ارد گرد ضرور دیکھنا چاہیے کہ کتنے لوگ ایسے ہیں جنہیں ہفتہ میں ایک بار بھی گوشت نصیب نہیں ہوتا اور کتنے ایسے

ہیں جن کو پورا پورا مہینہ گوشت کی ایک بوٹی دیکھنا نصیب نہیں ہوتی، میں یہ نہیں کہتا کہ گوشت بالکل ذخیرہ نہ کریں، شوق سے ایسا کریں لیکن اپنے ارد گرد کے قبیلہ برادری کے اور گلی محلے کے ان لوگوں کو بھی یاد رکھیں جنہیں مہینوں گوشت کھانے کو نہیں میسر آتا، یہ قربانی کا معاشرتی پہلو ہے اور سوسائٹی کی ضروریات سے اس عبادت کا عملی تعلق ہے جس کا ہمیں ضرور لحاظ رکھنا چاہیے۔ میں آج کے اجتماع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قربانی کے ایک اور پہلو کی طرف بھی آپ حضرات کو متوجہ کرنا چاہوں گا کہ اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرم ﷺ سے فرمایا کہ "قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ" آپ کہہ دیجئے کہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے لیکن آج ہمارا حال کیا ہے؟ ہماری قربانیاں کس کے لئے ہیں؟

قربانیاں ہم بھی دے رہے ہیں لیکن کن چیزوں کی قربانیاں دے رہے ہیں؟ ہمارا قومی المیہ یہ ہے کہ ہم اپنے ایمان کی قربانی دے رہے ہیں، عقیدہ کی قربانی دے رہے ہیں، ثقافت کی قربانی دے رہے ہیں، ملکی سالمیت کی قربانی دے رہے ہیں، عوام کے جان و مال کی قربانی دے رہے ہیں، قومی حمیت اور ملی غیرت کی قربانی دے رہے ہیں اور قومی وحدت اور خودمختاری کی قربانی دے رہے ہیں کس کے لئے؟ امریکہ کے لئے، ایک عالمی قوت کو خوش کرنے کے لئے اور ایک استعماری قوت کو راضی رکھنے کے لئے ہم نے اپنی زندگی اور موت کے فیصلے بھی امریکی استعمار کے سپرد کر دیے ہیں کہ وہ جسے چاہے زندہ رہنے دے اور جسے چاہے ڈرون حملوں کے ذریعہ موت کی نیند سلا دے، ہمارے قومی فیصلے اور پالیسی کے معاملات اسلام آباد میں نہیں واشنگٹن میں ہوتے ہیں اور ہمارے حکمران روبوٹ کی طرح ان احکام کی تعمیل کیے جا رہے ہیں۔ ہمارا حال یہ ہے کہ قرآن کریم کے احکام ہمارے سامنے ہیں مگر ہماری ان کی طرف توجہ نہیں ہے جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات شب و روز ہم سنتے ہیں مگر ہمارے معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن

رات دو بجے امریکہ کا حکم آجائے تو ہم اڑھائی بجے تک اس پر عمل کر کے اس کی رپورٹ بھی دے چکے ہوتے ہیں، ہمیں اسی کی سزا مل رہی ہے اور ایک اللہ کے سامنے سرنڈر نہ ہونے کے نتیجے میں ہمیں خدا جانے کون کون سے دروازے پر ناک رگڑنا پڑ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ کتاب اللہ کے فیصلوں سے انحراف کرنے والوں پر ہم دنیا میں رسوائی اور ذلت مسلط کر دیتے ہیں، ہماری صورت حال آج کل یہی ہے کہ ہم نے شریعت سے انکار کیا، قرآن وسنت کی بالادستی سے منہ موڑا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام وقوانین سے اعراض کیا تو ہر طرف سے ہم پر ذلت اور رسوائی مسلط ہے اور عزت ووقار کا کوئی راستہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہا، قربانی ہمیں یہ سبق بھی دیتی ہے کہ قربانی اللہ تعالیٰ کے لیے دنیا کو قربان کرنے کا نام ہے، دنیا کی خاطر اللہ تعالیٰ کے احکام سے منہ موڑنے کا نام نہیں ہے، دنیا کی خاطر دین کی قربانی اور دنیا والوں کی خاطر اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسول ﷺ کی شریعت اور احکام کی قربانی سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔

آج بھی ہم اللہ کے در پر جھک جائیں، جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات و تعلیمات کے سامنے جھک جائیں اور شریعت اسلامیہ کے سامنے سرنڈر ہو جائیں تو ساری صورت حال بدل سکتی ہے۔ اس دلدل سے نجات مل سکتی ہے اور ہم قومی طور پر عزت ووقار کی شاہراہ پر گامزن ہو سکتے ہیں لیکن اس کے لئے اجتماعی طور پر توبہ واستغفار کی ضرورت ہے، ملی حمیت وغیرت کو جگانے کی ضرورت ہے اور عوامی سطح پر بیداری پیدا کرنے کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

دینی مدارس کی تعلیم اور انسانی معاشرہ کی ضروریات

"16 جولائی 2011ء کو مسجد حمزہ لانگ آئی لینڈ نیویارک (امریکہ) میں دارالعلوم نیویارک کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد سے خطاب"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

دارالعلوم نیویارک کے مختلف اجتماعات میں کئی سالوں سے وقتاً فوقتاً حاضری کا موقع ملتا رہتا ہے اور اساتذہ و منتظمین کے ذوق و محنت کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے، آج اللہ تعالیٰ نے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد و انعامات میں شرکت کی توفیق دی ہے، علماء کرام، اساتذہ، طلبہ اور طلبہ و طالبات کے والدین کے اس بڑے اجتماع میں آپ حضرات سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں، اور آپ سب حضرات کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اس سال دارالعلوم سے گیارہ طلبہ نے قرآن کریم حفظ مکمل کیا ہے اور آٹھ طلبہ نے درس نظامی کے دارالعلوم کے نصاب کی تکمیل کی جس پر آج انہیں اسناد دی جارہی ہیں۔

ابھی آپ کے سامنے دو تین گھنٹوں سے دارالعلوم سے فیض یافتہ طلبہ اور نوجوان مختلف عنوانات پر تقاریر کر رہے تھے، چھوٹے چھوٹے بچوں نے مختلف زبانوں میں خطابات کئے

ہیں، نظمیں اور نعتیں پڑھی ہیں اور بہت اچھے انداز میں قرآن کریم کی تلاوت کی ہے جس سے ہمارے ایمان اور حوصلہ کو تازگی ملی ہے، میں اس سلسلہ میں آپ حضرات کو ایک سوال پر غور کی دعوت دینا چاہتا ہوں کہ یہ بچے جو پڑھ رہے تھے، بول رہے تھے اور اظہار خیال کر رہے تھے کیا یہ خود پڑھ رہے تھے یا ان کے پیچھے کوئی اور بول رہا تھا؟ میرے خیال میں ان کے پیچھے ان کے اساتذہ پڑھ رہے تھے اور مدرسہ کے منتظمین بول رہے تھے، اس لئے کہ انہوں نے ہی ان کو پڑھایا ہے اور ان کو تعلیم کے ساتھ ساتھ یہ ذوق اور تربیت دی ہے ،اس لئے مبارک باد اور داد کے مستحق اصل میں یہ اساتذہ، والدین اور منتظمین ہیں جن کا حسنِ ذوق اور تعلیم وتربیت کی محنت ان طلبہ کی زبانوں سے بول رہی تھی، اللہ تعالیٰ ان اساتذہ و منتظمین کو جزائے خیر اور قبولیت وثمرات سے نوازیں، آمین۔

میں اس سے آگے ایک اور سوال بھی آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا کہ ان اساتذہ اور منتظمین کے پیچھے کون بول رہا تھا؟ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے پیچھے آپ حضرات کھڑے نظر آتے ہیں اور وہ اصحابِ خیر دکھائی دیتے ہیں جنہوں نے تعاون کیا ہے، پیسے خرچ کئے ہیں اور دارالعلوم کے انتظامات اور اخراجات میں حصہ لیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ”پیسہ بولتا ہے“ اس محاورہ سے لوگ اپنا اپنا مطلب مراد لیتے ہیں لیکن مجھے یہاں ان تلاوت کرتے ہوئے تقریریں کرتے ہوئے اور حمد ونعت پڑھتے ہوئے بچوں کے پیچھے آپ حضرات کا پیسہ بولتا نظر آرہا ہے اور اس پر میں ایک تاریخی واقعہ آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت ربیعۃ الرائےؒ کا واقعہ:

تابعین کے دور کے ممتاز ارباب علم میں ایک بڑا نام ”ربیعۃ الرائے“ کا ہے جو بہت بڑے محدث تھے، فقیہ تھے اور علماء وفضلاء کی راہ نمائی کا مرجع تھے، امام اعظم حضرت

امام ابوحنیفہؒ کے اساتذہ میں سے ہیں اور ان کے علم وفضل اور کمال کے بارے میں اس حوالہ کے بعد میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، ان کا نام ربیعہؒ تھا والد محترم فروخؒ تھے اور ربیعہؒ، رائے کی پختگی اور اصابت میں اس قدر معروف تھے کہ ان کا نام ہی ''رائے'' پڑ گیا تھا، علم اور دینی مسائل میں ان کی رائے حکمت و دانش سے پُر ہوتی تھی اور عام طور پر اس قدر صائب ہوتی تھی کہ انہیں صائب الرائے کہا جانے لگا اور رائے ان کے نام کا حصہ بن گیا، ان کے والد محترم فروخؒ مجاہد تھے اور میدان جنگ میں ہمیشہ کفار کے خلاف جنگ میں مصروف رہتے تھے، تاریخی روایات میں آتا ہے کہ ربیعہؒ ابھی پیدا ہوئے تھے یا پیدا ہونے والے تھے کہ حضرت فروخؒ کو جہاد کا سفر پیش آگیا، وہ اپنی جمع پونجی جو ہزاروں دینار کی مقدار میں بتائی جاتی ہے اہلیہ محترمہ کے حوالہ کر کے اور بچے کی دیکھ بھال کی تلقین کر کے جہاد کے لئے روانہ ہو گئے، خدا کی قدرت ایک جہاد کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا، اور تیسرے کے بعد چوتھا، جہاد کے اس تسلسل نے اس قدر مصروف رکھا کہ فروخؒ کو کم وبیش ستائیس سال کے بعد گھر واپس آنا نصیب ہوا، جب وہ مدینہ منورہ میں اچانک اپنے گھر پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ایک وجیہ نوجوان نے دروازہ کھولا، فروخؒ نے ایک خوبصورت نوجوان کو اپنے گھر میں دیکھا تو اندیشوں کا شکار ہو گئے اور غصے سے بولے کہ تم میرے گھر میں کیا کر رہے ہو؟ اس نوجوان نے ایک اجنبی مرد کو گھر کے دروازے سے اندر آتے دیکھا تو وہ بھی غصے میں آگئے کہ تم میرے گھر میں کیوں گھس رہے ہو؟ دونوں باپ بیٹا تھے لیکن ایک دوسرے کو دیکھا ہوا نہیں تھا اس لئے دونوں کا غصہ بجا تھا، آپس میں الجھ پڑے اور اچھا خاصا جھگڑا ہو گیا، جھگڑا دیکھ کر پڑوسی آگئے، اندر سے ربیعہؒ کی والدہ نے بھی باہر جھانک کر دیکھا تو فروخؒ کو پہچان لیا اور ربیعہؒ کو آواز دی کہ یہ تمہارے والد محترم ہیں ان کو اندر آنے دو اور فروخؒ سے کہا گیا کہ یہ آپ کا بیٹا ہے، اس پر دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے سے گلے لگ گئے، فروخؒ گھر میں داخل

ہوئے، مدتوں کے بعد اہل خانہ کی آپس میں ملاقات ہوئی تھی جب آرام وغیرہ سے فارغ ہوئے تو فروخؒ نے اہلیہ سے اس رقم کے بارے میں پوچھا، اہلیہ نے کہا کہ وہ خزانہ مدفون ہے، مناسب وقت پر ظاہر کر دوں گی۔

ربیعہؒ نوجوان تھے اور اللہ تعالیٰ نے علم وفضل کی دولت سے اس قدر نوازا تھا کہ مسجد نبوی ﷺ میں ان کا حلقہ لگتا تھا اور سینکڑوں علماء وطلبہ ان سے استفادہ کرتے تھے، ایک دن فروخؒ مسجد نبوی ﷺ میں نماز ادا کرنے گئے تو نماز کے بعد مختلف تعلیمی حلقوں کو دیکھا کہ اساتذہ بیٹھے ہیں اور ارد گرد طلبہ اور معتقدین کا ہجوم ہے جو ان سے فیض حاصل کر رہا تھا، وہ ان حلقوں میں سے سب سے بڑے حلقہ کی طرف بڑھے کہ شیخؒ کی زیارت کریں تو دیکھا کہ ان کا بیٹا ربیعہؒ اس حلقہ کا شیخ ہے جو علم کے پیاسوں کی تشنگی دور کر رہا ہے اور علم وفضل کی روشنی پھیلا رہا ہے، اپنے بیٹے کی یہ قدر ومنزلت دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور گھر جا کر اہلیہ کے سامنے اس خوشی اور فخر کا اظہار کیا تو اس نے موقع غنیمت جان کر خاوند سے پوچھا کہ آپ کو وہ دولت درکار ہے یا اپنے بیٹے کے اس مقام ومرتبہ کو زیادہ عزیز رکھتے ہیں؟ فروخؒ نے کہا کہ مجھے اپنے بیٹے کا یہ مقام اور اعزاز اس دولت سے کہیں زیادہ محبوب ہے، اہلیہؒ نے کہا کہ میں نے وہ ساری دولت اس بیٹے کی تعلیم وتربیت پر خرچ کی ہے اور ربیعہؒ کے اس علم وفضل اور مقام ومرتبہ کے پیچھے تمہاری وہ دولت جھلک رہی ہے جو تم میرے حوالہ کر کے گئے تھے، فروخؒ نے یہ سن کر اطمینان کا سانس لیا اور اہلیہ کی تعریف کی کہ اس نے عقلمندی اور دانش سے کام لیا ہے۔

واقعہ سے سبق:

اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ تعلیم وتعلم اور تدریس وتربیت میں صرف اساتذہ، منتظمین، طلبہ، طالبات اور ان کے والدین کا کردار ہی نہیں ہوتا بلکہ ان کے ساتھ وہ معاونین بھی برابر کے شریک ہوتے ہیں جن کی رقم اور دولت صرف ہوتی ہے اور جو اپنے

مال کے ساتھ مدارس کی معاونت کرتے ہیں، میں آپ دوستوں سے عرض کرتا ہوں کہ پیسہ تو ہر جگہ بولتا ہے، عیاشی کرنے والے گھروں میں بولتا ہے، گناہ کے مقامات پر بھی بولتا ہے اور ظلم و ناانصافی کی شکلوں میں بھی بولتا ہے لیکن مبارک ہے وہ پیسہ جو ان طلبہ اور طالبات کی شکل میں بول رہا ہے، تلاوت قرآن کریم کی صورت میں بول رہا ہے، حمد و نعت کے لہجے میں بول رہا ہے اور مختلف زبانوں میں طلبہ کی تقریروں اور خطابات کی شکل میں بول رہا ہے۔

دوسری بات جو میں آج کی اس محفل میں آپ حضرات سے عرض کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ دینی مدارس جو آج دنیا کے مختلف حصوں میں دین کی تعلیم دے رہے ہیں، قرآن و سنت کی روشنی پھیلا رہے ہیں اور آسمانی تعلیمات نسل انسانی کے سامنے پیش کر رہے ہیں، ان کے بارے میں ایک سوال عام طور پر کیا جاتا ہے کہ ان کی تعلیم کا آج کی عملی زندگی میں کیا تعلق ہے؟ انسانی معاشرہ کے مسائل سے کیا تعلق ہے؟ اور پریکٹیکل لائف میں یہ تعلیم ہمیں کس جگہ کام آتی ہے۔

ہماری عملی زندگی کے مختلف دائرے ہیں، فرد کی زندگی ہے، خاندان کی زندگی ہے، سوسائٹی کی زندگی ہے اور گلوبل انسانی معاشرہ کی زندگی ہے اور پھر ان کے بھی بیسیوں پہلو ہیں جن پر اس سوال کے جواب میں گفتگو کی ضرورت ہے اور معروضات پیش کی جاسکتی ہیں مگر وقت کا دائرہ بہت تنگ ہے، آپ حضرات تین گھنٹوں سے مسلسل بیٹھے ہوئے ہیں عصر کی نماز کا وقت بھی محدود ہوتا جا رہا ہے اس لئے صرف ایک پہلو پر کچھ عرض کرسکوں گا اور وہ فرد کے دائرے کا پہلو ہے، مغرب میں فرد کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور جس جگہ میں بیٹھ کر ہم یہ گفتگو کر رہے ہیں یہاں کے فلسفۂ حیات کی بنیاد ''انڈویجول ازم'' یعنی فرد کی آزادی اور اہمیت پر ہے اس لئے اسی حوالہ سے ایک دو گزارشات پیش کروں گا۔

میں اس انسانی معاشرہ کا ایک فرد ہوں جس کے افراد کی تعداد اس وقت ساڑھے چھ ارب سے زیادہ بتائی جاتی ہے ان میں سے ایک میں بھی ہوں اور اس معاشرتی

اجتماعیت کی ایک اکائی ہوں، اگر ایک فرد کے طور پر اپنے مقام اور کردار کے حوالہ سے بات کروں تو مجھے سب سے پہلے اپنا تعارف درکار ہے کہ میں کون ہوں اور اس انسانی معاشرہ میں میرا مقام اور کردار کیا ہے؟

کسی بھی چیز کے مقام و کردار کا تعین کرنے سے پہلے اس کی پہچان ضروری ہوتی ہے، یہ میرے سامنے مائیک ہے جس کے ذریعہ میں آپ حضرات سے مخاطب ہوں اس کے صحیح تعارف کے لئے مجھے تین سوالوں کا جواب درکار ہے، (1) یہ کیا ہے؟ (2) یہ کیوں ہے؟ (3) اسے کس نے بنایا ہے؟

یہ کیا ہے؟ اس کے جواب میں مجھے دیکھنا ہوگا کہ یہ کس چیز سے بنا ہے، اس کا میٹیریل کیا ہے، اس میں کون کون سے پرزے ہیں، اس کا نیٹ ورک کیا ہے اور اس کا میکنزم کیا ہے؟

یہ کیوں ہے؟ اس کے جواب میں دیکھا جائے گا کہ اس کا مقصد کیا ہے، یہ کیا کام کرتا ہے اور کس غرض سے اس کا استعمال کیا جاتا ہے؟ جبکہ اسے کس نے بنایا ہے کے جواب میں یہ سوال فطری طور پر ذہن میں آتا ہے کہ یہ کون سی فرم نے بنایا ہے؟ یہ میڈ اِن چائنا ہے، میڈ ان جاپان ہے، میڈ ان کوریا ہے یا میڈ ان جرمنی ہے؟

ان تینوں سوالوں کا جواب حاصل کئے بغیر میرے ذہن میں کسی بھی چیز کا تعارف مکمل نہیں ہوتا اور میں اس سے صحیح طور پر استفادہ نہیں کر سکتا، اسی طرح ان تینوں سوالوں کا جواب مجھے اپنی پہچان کے لئے بھی درکار ہے اور ان سوالوں کا جواب حاصل کئے بغیر میں نہ خود کو پہچان سکتا ہوں اور نہ ہی انسانی معاشرہ میں اپنے مقام و کردار کا صحیح طور پر تعین کر سکتا ہوں۔

میں اس بات کے اعتراف میں کوئی حجاب محسوس نہیں کرتا کہ ان میں ایک سوال پر

آج کی سائنس خوب بحث کر رہی ہے اور میڈیکل سائنس کا موضوع ہی یہ ہے کہ انسان اپنے جسم، اپنی مشینری اور اپنے مٹیریل کے حوالہ سے کیا ہے؟ "انسانی باڈی" میڈیکل سائنس کا سبجیکٹ ہے اور وہ اسی پر ہزاروں سال سے بحث کرتی آرہی ہے کہ انسانی چمڑے کے اندر چھپی ہوئی کائنات کی اس پیچیدہ ترین مشینری میں کیا کچھ ہے؟ یہ کیسے کام کرتی ہے، اس کی ضروریات کیا ہیں اور اس کے نفع ونقصان کا دائرہ کیا ہے؟ ہزاروں میڈیکل سائنٹسٹ ہزاروں سال سے اس پر بحث کر رہے ہیں، ہزاروں لیبارٹریوں میں انسانی جسم کے اعضا کی ہزاروں بار چیر پھاڑ کی جا چکی ہے جو اب بھی جاری ہے، ایک محاورہ ہمارے ہاں چلتا ہے کہ "بال کی کھال اتارنا" میں عرض کیا کرتا ہوں کہ یہ محاورہ کہیں اور فٹ بیٹھتا ہو یا نہیں میڈیکل سائنس پر ضرور صادق آتا ہے، اس لئے کہ ہمارے میڈیکل سائنٹسٹ نہ صرف بال کی کھال اتارتے ہیں بلکہ کھال کی بھی کھال اتار دیتے ہیں اور یہ عمل جاری ہے جو قیامت تک جاری رہے گا، یہاں ضمناً ایک اور بات بھی عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں سال کی اس محنت اور تگ و دو کے باوجود آج بھی دنیا بھر کے میڈیکل سائنٹسٹ اجتماعی طور پر یا کوئی سائنس دان انفرادی طور پر یہ دعویٰ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے کہ اس انسانی باڈی کو مکمل طور پر سمجھ لیا گیا ہے اور اب اس میں کسی اور چیز یا صلاحیت کے انکشاف کا کوئی امکان باقی نہیں رہا کیونکہ تحقیق قیامت تک چلتی رہے گی، نئی نئی باتیں سامنے آتی رہیں گی اور قیامت تک اس میں انکشافات ہوتے رہیں گے اور اس پس منظر میں قرآن کریم کے اس ارشاد کا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے کہ ......

"وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا"

"اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو انہیں شمار نہیں کر سکو گے"

یہ آیت کریمہ ہمیں بتاتی ہے کہ تم تو اپنے وجود کے اندر کی نعمتوں کو شمار نہیں کر سکتے کائنات میں ہر طرف بکھری ہوئی نعمتوں کو کیسے شمار کر سکو گے؟ لیکن اس پہلو پر مزید کسی گفتگو

کی بجائے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں کہ میڈیکل سائنس مجھے میرے بارے میں صرف ایک سوال کا جواب دینے کی کوشش کر رہی ہے کہ میں کیا ہوں؟ لیکن دوسرے دو سوال کہ میں کیوں ہوں؟ اور مجھے کس نے بنایا ہے؟ اس کے بارے میں نہ صرف میڈیکل سائنس بلکہ عمومی سائنس بھی مکمل طور پر خاموش ہے اور سائنس کا کوئی شعبہ سرے سے اس سوال کو ٹچ ہی نہیں کر رہا کہ انسان کو کیوں بنایا گیا ہے اور کس نے بنایا ہے؟ عجیب سی بات لگتی ہے کہ میں اپنے کرتے پر ٹانکے ہوئے ایک بٹن کے بارے میں تو جانتا ہوں کہ یہ کیوں بنایا ہے اور کس مقصد کیلئے بنایا ہے؟ ان دو سوالوں کا جواب کہ مجھے کس نے بنایا ہے اور کس مقصد کے لئے بنایا ہے؟ مجھے وحی الٰہی میں ملتا ہے، آسمانی تعلیمات میں ملتا ہے، قرآن کریم میں ملتا ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات میں ملتا ہے اور ان باتوں کی معلومات مجھے ان مدارس کی تعلیم سے حاصل ہوتی ہیں، یہ دو سوال آج کی کسی یونیورسٹی کا سبجیکٹ نہیں ہیں، نہ آکسفورڈ کے مضامین میں یہ سوال شامل ہیں، نہ کیمبرج اس پر گفتگو کرتی ہے اور نہ ہی ہاورڈ یونیورسٹی کے مضامین کا یہ باقاعدہ حصہ ہے، اس لئے میں عرض کرنا چاہوں گا کہ دینی مدرسہ کی تعلیم کے بغیر تو میں اپنی پہچان اور تعارف مکمل نہیں کر سکتا انسانی معاشرہ میں اپنے مقام اور کردار کا ادراک کس طرح حاصل کر سکتا ہوں، اور سوسائٹی میں اپنا دائرہ کار صحیح طور پر کیسے متعین کر سکتا ہوں؟

اس کے ساتھ ہی ایک اور سوال بھی ایک فرد کی حیثیت سے میری زندگی سے تعلق رکھتا ہے جس کے بغیر اپنے کردار اور انسانی معاشرت میں اپنے حصے کے بارے میں میرا علم مکمل نہیں ہو سکتا وہ یہ ہے کہ میرا فیوچر کیا ہے اور میرا مستقبل کیا ہے؟ آج کی دنیا نے تو "فیوچر" دنیا کی باقی ماندہ زندگی کو قرار دے رکھا ہے، جس کے بارے میں کسی کے پاس کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ وہ منٹوں میں ہے، گھنٹوں میں ہے، دنوں میں ہے، ہفتوں میں ہے یا سالوں میں ہے؟ یہ ان گارنٹڈ زندگی ہمارا فیوچر کہلاتی ہے جبکہ اصل فیوچر کی طرف سرے

سے ہماری توجہ ہی نہیں ہے، ہمارا مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ زندگی صرف اس دنیا کی زندگی کا نام نہیں بلکہ اس سے آگے زندگی کے بہت سے مراحل ہیں اور بہت لمبے مراحل ہیں، قبر کی زندگی ہے، حشر کی زندگی ہے، پل صراط کا مرحلہ ہے اور اس سے آگے جنت اور جہنم کی ان لمیٹڈ زندگی ہے اور زندگی کے وہ طویل ترین مراحل بھی ہمارے مستقبل کا اور ہمارے فیوچر کا حصہ ہیں، سوال یہ ہے کہ ہمارے مستقبل اور فیوچر کے یہ مراحل آج کی سائنس اور تعلیم کا کس قدر حصہ ہیں؟ اور آکسفورڈ، کیمبرج اور ہاورڈ سمیت دنیا کی کون سی یونیورسٹی کا یہ سبجیکٹ ہے کہ قبر کیا ہے اور اس میں انسان کے ساتھ کیا معاملات پیش آنے والے ہیں۔

مجھے اس بات سے انکار نہیں ہے کہ اس دنیا کی باقی ماندہ زندگی کے لئے مجھے ضرور اسباب مہیا کرنے چاہییں اس کے لئے محنت کرنی چاہیے، اس کو بہتر بنانے کیلئے کام کرنا چاہیے لیکن اس سے آگے جو میرا اصل فیوچر ہے اور یقینی فیوچر ہے جس نے بہر حال آکر رہنا ہے اس کی تیاری کرنا، اس کیلئے اسباب فراہم کرنا اور اس کے لئے محنت کرنا بھی میری ضرورت ہے اور یہ معلوم کرنا بھی میری ضرورت ہے کہ مجھے اس زندگی سے آنکھیں بند ہونے کے بعد فنا ہو جانا ہے یا کسی اور جہاں میں منتقل ہونا ہے اور اگر مجھے ایک اور جہاں میں جانا ہے اور یقیناً جانا ہے کہ جسے ہم آنکھیں بند ہونا کہتے ہیں یہ حقیقت میں آنکھیں بند ہونا نہیں بلکہ ایک اور جہاں میں آنکھیں کھلنا ہے جہاں مجھے حساب کتاب کا مرحلہ پیش آئے گا، سوال جواب سے گزرنا ہوگا، الم و راحت کی کیفیات پیش آئیں گی اور سزا و جزا کا سامنا کرنا ہو گا، وہاں میرے ساتھ کیا ہونا ہے اور مجھے کیا کرنا ہے اس کی تعلیم مجھے وحی الٰہی سے ملتی ہے، آسمانی تعلیمات سے ملتی ہے اور قرآن و سنت سے ملتی ہے جس کی تعلیم یہ مدرسہ دیتا ہے اور صرف تعلیم نہیں دیتا بلکہ اس کا عملی ماحول بھی فراہم کرتا ہے اور اس کے لئے تربیت بھی مہیا کرتا ہے، ان گزارشات کے ساتھ میں دارالعلوم نیویارک کی اس تعلیمی پیش رفت پر اور اس کی ترقی اور آج نظر آنے والے ثمرات و نتائج پر دارالعلوم کے

منتظمین، اساتذہ، طلبہ، طالبات، ان کے والدین اور آپ سب معاونین و متعلقین کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ یہ مبارک ماحول اور یہ ثمرات آپ سب کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ آپ سب دوستوں کو جزائے خیر سے نوازیں اور دار العلوم اور دوسرے مدارس دینیہ کو ترقیات و ثمرات اور قبولیت و رضا سے بہرہ ور فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

دینی علوم کے طلبہ سے چند باتیں

"21 شوال المکرم 1428ھ کو مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں تعلیمی سال کے آغاز کے موقع پر اساتذہ وطلبہ کے اجتماع سے خطاب"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

ہم آج اپنے اس مدرسہ میں نئے تعلیمی سال کا آغاز کر رہے ہیں، اس مناسبت سے میں آج کی دنیا میں دینی مدارس اور ان کے تعلیمی نظام کے حوالہ سے اٹھائے جانے والے ایک اہم سوال کا جائزہ لینا چاہتا ہوں، وہ سوال یہ ہے کہ ان دینی مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اور جن مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے ان کا ہمارا عملی زندگی کے ساتھ کیا تعلق ہے اور ہمیں زندگی میں پیش آنے والی ضروریات میں سے وہ کس ضرورت کو پورا کرتے ہیں؟ یہ سوال اٹھا کر اس کے بعد پھر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ چونکہ ان مدارس کی تعلیمات کا ہماری عملی زندگی اور اس کی ضروریات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے ان مدارس کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے اور یہ مدارس قوم کی کوئی مثبت خدمت کرنے کی بجائے غیر ضروری مضامین پر قوم کے ایک بڑے حصے کا وقت ضائع کر رہے ہیں یہ سوال نہ صرف پاکستان میں

بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی زیر بحث ہے اور ابھی حالیہ سفر امریکہ کے دوران میرے ساتھ گفتگو میں وہاں کے بعض حلقوں نے بھی اس سوال کی طرف توجہ دلائی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس سوال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لے لیا جائے۔

مجھے سکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم اور ان میں پڑھائے جانے والے مضامین کی ضرورت، افادیت سے کوئی انکار نہیں ہے اور میں ان عصری تعلیمی اداروں میں پڑھائے جانے والے علوم وفنون کو انسانی زندگی کے لیے ضرورت کے مضامین سمجھتا ہوں مثلاً ریاضی ہماری ضرورت ہے، انگلش زبان ہماری ضرورت ہے، سائنس ہماری ضرورت ہے ٹیکنالوجی ہماری ضرورت ہے، میڈیکل سائنس ہماری ضرورت ہے، انجینئرنگ ہماری ضرورت ہے اور ان کے علاوہ ان اداروں میں پڑھائے جانے والے علوم وفنون ہماری زندگی اور سوسائٹی کے لیے ازحد ضروری ہیں جن کے بغیر نہ ہم اپنی زندگی کا نظام باقی رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی سوسائٹی کے ارتقاء اور ترقی کی طرف قدم بڑھا سکتے ہیں اس لیے سکول، کالج، یونیورسٹی میں پڑھائے جانے والے تمام علوم وفنون اور مضامین کی اہمیت اور ضرورت کو میں کھلے دل سے تسلیم کرتا ہوں اور انہیں انسانی سوسائٹی اور زندگی کے لیے ضروری علوم تصور کرتا ہوں لیکن کیا سکول، کالج اور یونیورسٹی میں پڑھائے جانے والے مضامین اور علوم ہماری زندگی کی تمام ضروریات کا احاطہ کرتے ہیں؟ اس میں مجھے کلام ہے اور آج کی گفتگو میں اسی پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

میری اس سلسلہ میں گذارش یہ ہے کہ عصری تعلیمی اداروں کے مضامین اور علوم وفنون ہماری بہت سی ضروریات کو پورا کرتے ہیں لیکن ہماری بہت سی ضروریات ایسی بھی ہیں جن سے ہمیں روزمرہ سابقہ پیش آتا ہے مگر سکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم اس سلسلہ

میں ہماری سرے سے کوئی راہ نمائی نہیں کرتی مثلاً میڈیکل سائنس کا موضوع انسانی جسم ہے کہ اس مشینری کی ہیئت ترکیبی کیا ہے؟ اس کا میکنزم کیا ہے، یہ جسم کیسے کام کرتا ہے، کیسے خرابی سے دو چار ہوتا ہے اور اس خرابی کو کیسے دور کیا جا سکتا ہے؟

میڈیکل سائنس اس موضوع پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال سے کام کر رہی ہے اور اس نے بہت ترقی اور پیش رفت کی ہے لیکن تمام تر ترقی کے باوجود میڈیکل سائنس ہمیں ہمارے جسم کے بارے میں صرف دو سوالوں کا جواب فراہم کرتی ہے ایک یہ کہ یہ مشینری کیا ہے؟ اور دوسرا یہ کہ یہ کیسے کام کرتی ہے؟ ان دو سوالوں کا جواب حاصل کرنا ہمارے لیے ضروری ہے اور ہم اس جواب سے بہت فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن ایک سوال ان سے پہلے ہے اور ہمارے لیے اس سوال کا جواب معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ مشینری کس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے؟ ان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ اس کا ایجنڈا کیا ہے اور یہ کیوں بنایا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب میڈیکل سائنس کے پاس نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس سے کوئی بحث کرتی ہے اگر کوئی قوم، طبقہ یا فرد اپنے وجود میں آنے کا مقصد معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تو یہ اس کی مرضی ہے لیکن ہم اس سوال کا جواب ضروری سمجھتے ہیں اور ہمیں اس سوال کا جواب وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے جو سکول، کالج، اور یونیورسٹی کی بجائے ان دینی مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔

اسی طرح اس کائنات کے حوالہ سے بھی سائنس صرف کیا ہے اور کیسے ہے؟ کے دو جوابات تک محدود رہتی ہے اور اگرچہ اس کی اس تگ و دو اور ریسرچ سے ہم اپنی عملی زندگی میں بہت فائدے اٹھاتے ہیں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی مسلسل ترقی کے باعث بہت سی سہولتوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں لیکن یہ کائنات کیوں ہے؟ کے سوال کا جواب بھی

سائنس کے پاس نہیں ہے اور نہ ہی وہ اسے ٹچ کرتی ہے اس سوال کا جواب بھی ہمیں وحی الٰہی میں ملتا ہے، آسمانی تعلیمات میں ملتا ہے اور قرآن وسنت میں ملتا ہے جن کی تعلیم سکول، کالج، یا یونیورسٹی کی بجائے ان دینی مدارس میں دی جاتی ہے اور یہ دینی مدارس ہی انسان کو اس کے اور کائنات کے مقصد وجود سے آگاہ کرتے ہیں۔

اس مسئلہ کو ایک اور حوالہ سے بھی دیکھ لیا جائے کہ ہم اس دنیا میں رہتے ہیں اس میں ہمارے ارد گرد وہ دنیا بھی ہے جو ہمارے محسوسات، مشاہدات، مدرکات اور معقولات کے دائرے میں آتی ہے، اور وہ دنیا بھی ہمارے ارد گرد موجود اسی ماحول میں موجود و متحرک ہے جو ہمارے محسوسات اور معقولات سے بالاتر ہے، ہم اپنے عقائد کی رو سے فرشتوں کا وجود تسلیم کرتے ہیں، جنوں اور شیطانوں کے وجود کا اقرار کرتے ہیں، قرآن وسنت کی رو سے ان غیبی مخلوقات کا ایک وسیع ترین نیٹ ورک موجود ہے جو ہمارے ارد گرد ماحول میں مسلسل مصروف عمل رہتا ہے اور ہمیں ان کے ساتھ رابطہ رکھنے، اس سسٹم کے خیر کے پہلوؤں سے فائدہ اٹھانے اور اور شر کے پہلوؤں سے بچنے کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔

اسی طرح ہم اپنے ماحول میں برکت اور نحوست کے دو لفظ ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور صرف الفاظ کی حد تک نہیں بلکہ ان کے اثرات کو اپنی زندگی میں محسوس کرتے ہیں اور ان کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں لیکن کائنات میں اللہ تعالیٰ کے پھیلائے ہوئے اس وسیع ترین غیبی نظام کے بارے میں نہ آکسفورڈ یونیورسٹی معلومات فراہم کرتی ہے، نہ کیمرج یونیورسٹی میں یہ مضمون پڑھایا جاتا ہے اور نہ ہی ہاورڈ یونیورسٹی کے مضامین میں یہ بات شامل ہے، اس غیبی نظام کے نیٹ ورک اور اس سے استفادہ کے طریقوں کے بارے میں اگر کہیں سے راہ نمائی ملتی ہے تو وہ صرف اور صرف یہ دینی مدارس ہیں جو شب و روز ان

باتوں کی تعلیم دیتے ہیں کہ فرشتے ہمارے گھروں میں کیسے آتے ہیں اور کیسے چلے جاتے ہیں، وہ کن کاموں پر راضی ہوتے ہیں اور کن باتوں پر ناراض ہوجاتے ہیں شیطانوں کی آمد ورفت کیسے ہوتی ہے، زندگی میں برکات کے حصول کا کیا طریقہ ہے اور نحوست سے بچنے کے لیے کیا کچھ کرنا ضروری ہوتا ہے، یہ باتیں ہماری ضروریات کا حصہ ہیں اور مغرب کی طرح ہم خدانخواستہ ان کے سرے سے انکار کے مقام تک نہیں جا پہنچے تو پھر ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ ہماری ان ضروریات کو صرف اور صرف دینی مدرسہ پورا کرتا ہے اور سکول وکالج کی تعلیم ان ضروریات کے حوالہ سے ہماری کوئی راہ نمائی نہیں کرتی۔

میں ایک اور پہلو سے بھی اس مسئلہ کا جائزہ لینا چاہوں گا کہ سکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم ہماری بہت سی ضروریات کو پورا کرتی ہے اور ہماری عملی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کے بارے میں ہماری راہ نمائی اور مدد کرتی ہے لیکن اس تعلیم کی تمام تر افادیت و ضروریات اس دنیا کی زندگی تک محدود ہے، اس کی تمام تر تحقیق و ریسرچ ہماری آنکھ بند ہونے تک ہے، آنکھ بند ہوتے ہی اس تعلیم کی افادیت سٹاپ ہوجاتی ہے اور اس کے بعد قبر کی زندگی، حشر کی زندگی، قیامت کا مرحلہ اور جنت و دوزخ کے مراحل سے اسے کوئی سروکار نہیں ہے جبکہ ہمارے عقیدہ کے مطابق اس دنیا کی زندگی بہت محدود اور عارضی ہے اور آنے والی زندگی بہت طویل اور حقیقی ہے، آپ صرف ایک چھوٹی سی بات سے اندازہ کرلیجیے کہ مریض کی سانس جب تک چل رہی ہے ڈاکٹر صاحبان اس کے گرد موجود ہیں ،علاج سے متعلقہ مشینیں بھی کام کررہی ہیں لیکن جونہی سانس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، ڈاکٹر صاحبان وہاں سے اٹھ جاتے ہیں اور مشینیں اور دوائیں بھی سب ہٹالی جاتی ہیں گویا میڈیکل سائنس اپنی زبان حال سے یہ کہہ دیتی ہے کہ میرا کام یہاں تک ختم ہوگیا ہے اس سے آگے مولوی صاحب کا کام ہے اسی لیے اب انہیں بلایا جائے اور پھر اگلے مراحل کے لیے مولوی

صاحبان کو بلایا جاتا ہے۔

پھر سکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم اس محدود زندگی کی جن ضروریات کا احاطہ کرتی ہے وہ بھی صرف محسوسات، مشاہدات اور معقولات کے دائروں تک محصور ہیں جبکہ زندگی صرف اس کا نام نہیں ہے اور اس سے آگے روحانیات اور وجدانیات بھی ہماری عملی زندگی کا ناگزیر حصہ ہیں جن سے یہ عصری تعلیم سرے سے کوئی بحث نہیں کرتی ایک مثال سے بات سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جسے دل کہتے ہیں، میڈیکل سائنس اسے انسانی جسم کی مشینری کا مرکز قرار دیتی ہے جس کی حرکت پر پورے بدن کی حرکت کا مدار ہے، یہ حرکت کرتا ہے تو جسم کی حرکت بھی صحیح ہے اور اگر دل کی حرکت غیر متوازن ہوگئی ہے تو پورے جسم کا نظام غیر متوازن ہو جاتا ہے۔

اسی طرح روحانی دنیا بھی دل ہی کو انسانی وجدانیات کا مرکز قرار دیتی ہے خود جناب نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''اِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ'' انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جسے دل کہا جاتا ہے وہ اگر صالح ہے تو جسم کا سارا نظام صالح ہے اور اگر وہ فاسد ہو جائے تو پورے جسم کا نظام فاسد ہو جاتا ہے، ظاہر بات ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ اس ارشاد گرامی میں میڈیکل سائنس کا کوئی اصول تو بیان نہیں فرما رہے بلکہ انسان کی اصلاح و ہدایت کے حوالہ سے گفتگو فرما رہے ہیں جبکہ سکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم دل کی ظاہری حرکت، اس کے نظام اور اس کے میکنزم کے بارے میں بہت ضروری اور مفید معلومات فراہم کرنے اور ہماری بھرپور رہنمائی کرنے کے باوجود اس کے باطنی نظام کے حوالہ سے مکمل خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے اور اس سلسلہ میں راہ نمائی اور معلومات کے لیے ہمیں وحی الٰہی اور آسمانی

تعلیمات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جو سکول اور کالج کی بجائے دینی مدارس کے نصاب کا حصہ ہیں اور وہی ہمیں اس کی تعلیم فراہم کرتے ہیں۔

میں اس موقع پر یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ ہمیں اس دنیا کی محدود زندگی اور اگلی دنیا کی طویل زندگی کے درمیان تناسب کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا تاکہ ہم اپنے نفع ونقصان کا کوئی صحیح معیار طے کر سکیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے کہ تم اپنی دنیا میں ایک ہزار سال شمار کرو تو اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ ایک دن کے برابر ہے اس سے اندازہ کر لیجیے کہ ہم جس زندگی کو ستر سال، اسی سال اور نوے سال کے پیمانے سے ماپتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ایک دن میں کیا حیثیت رکھتی ہے؟ اس کی ایک ہلکی سی جھلک ہمیں سائنس بھی دکھاتی ہے، میں اپنے حالیہ سفر امریکہ کے دوران ہیوسٹن میں ناسا کے خلائی تحقیقاتی مرکز میں گیا اور وہاں خلائی شٹل میں داخل ہو کر اس کے کاک پٹ کا ماحول بھی دیکھا، اس موقع پر ہمیں بتایا گیا کہ یہ شٹل جب زمین کے مدار سے نکل کر خلاء میں داخل ہوتی ہے تو سورج کی وہ گردش جو زمین پر چوبیس گھنٹوں میں مکمل ہوتی ہے خلاء میں جا کر صرف نوے منٹ کی رہ جاتی ہے، جب ناسا کے دورے میں ہمیں بریفنگ دینے والے صاحب یہ بتا رہے تھے تو میرا ذہن فوراً قرآن کریم کی سورۃ حج کی آیت نمبر 37 میں اس ارشاد کی طرف متوجہ ہو گیا کہ ’’اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْن‘‘ تمہارے رب کا ایک دن تمہارے ایک ہزار سال کی گنتی کے برابر ہے، میں سوچ میں پڑ گیا کہ زمین کے مدار سے متصل خلاء میں اگر چوبیس گھنٹے نوے منٹ میں سمٹ جاتے ہیں تو اس کے اوپر خلاؤں اور پھر ان کے اوپر خلاؤں کا عالم کیا ہوگا؟ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایک اور آیت قرآنی میں بتایا ہے کہ جب تم اگلے جہان میں آنکھ کھولو گے اور وہاں کھڑے ہو کر اپنی دنیا کی زندگی کا اندازہ کرو گے تو

تمہیں یوں محسوس ہو گا کہ دنیا میں صرف دن کا پہلا حصہ یا پچھلا پہر گزار کر آئے ہیں "لَمْ يَلْبَثُوٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا" (سورۃ النازعات آیت نمبر 46)

یہ عرض کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ ہمیں اپنی زندگی کی ضروریات کا تعین کرتے وقت حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے اور اس دنیا کی زندگی اور آخرت کی زندگی کے تناسب کو سامنے رکھنا چاہیے جیسا کہ بعض صوفیاء کرامؒ فرماتے ہیں کہ اس دنیا کے لیے اتنی محنت کرو اور اتنا سامان فراہم کرو جتنا تم نے یہاں رہنا ہے اور اگلی زندگی کے لیے اتنی تیاری کرو جتنا تم نے وہاں رہنا ہے، اب آپ خیال فرمائیں کہ میں کسی شہر میں گیا ہوں اور مجھے وہاں صرف تین دن رہنا ہے تو تین دن کے حساب سے ہی انتظام کروں گا اور اگر مجھے وہاں ایک سال رہنا ہے تو انتظامات ایک سال کے حساب سے ہوں گے لیکن اگر میں نے کسی شہر میں مستقل طور پر رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے میرے انتظامات تین دن یا ایک سال کے حساب سے نہیں ہوں گے اس لیے ہمیں اپنی زندگی کی ضروریات کا تعین کرتے وقت آخرت کی طویل اور حقیقی زندگی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ میں مغرب کی بات نہیں کرتا اس لیے کہ مغرب تو آخرت کی زندگی کے تصور سے ہی فارغ ہو گیا ہے اس لیے وہ اگر اپنی تمام تر ضروریات کو اس دنیا کی زندگی تک محدود سمجھ کر اپنی تعلیمی ضروریات کو بھی اسی دائرے میں طے کرتا ہے تو اس کی بات کسی حد تک سمجھ میں آتی ہے لیکن ہمارا مسلمانوں کا معاملہ مغرب سے مختلف ہے، ہم خدا پر ایمان رکھتے ہیں، آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، قبر اور حشر پر ایمان رکھتے ہیں، روحانیات پر ایمان رکھتے ہیں، فرشتوں پر ایمان رکھتے ہیں، برکت اور نحوست پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے غیبی نظام پر ایمان رکھتے ہیں اور جب ان سب باتوں پر ایمان رکھتے ہیں تو ان کے حوالہ سے معلومات حاصل کرنا اور ان

کے نفع ونقصان کے نظام کو سمجھتے ہوئے اس کے دائرے میں اپنی زندگی کی ترجیحات طے کرنا ہماری ناگزیر ضرورت بن جاتا ہے اس لیے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ہمیں سکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیمات اور ان میں پڑھائے جانے والے علوم وفنون کی اہمیت وضرورت سے انکار نہیں لیکن حقائق کی دنیا میں ان کا دائرہ بہت محدود ہے اور ہماری زندگی کی ضروریات کا ایک بہت بڑا دائرہ وہ ہے جو سرے سے ان عصری تعلیمی نظام کے ایجنڈے میں ہی شامل نہیں ہے اور ان کے بارے میں ہمیں ضروری معلومات جن علوم وفنون اور مضامین کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے وہ ان دینی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں، اس طرح یہ مدارس انسانی زندگی اور انسانی سوسائٹی کی ضروریات کے ایک بڑے حصہ کو پورا کرتے ہیں اور نسل انسانی کی بہت بڑی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

ان گذارشات کے ساتھ میں دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ سے عرض کرتا ہوں کہ وہ کسی قسم کے احساس کمتری کا شکار نہ ہوں، کسی منفی پروپیگنڈے کو خاطر میں نہ لائیں، کسی قسم کی مایوسی کو قریب نہ آنے دیں اور پورے حوصلہ اور اعتماد کیساتھ یہ یقین رکھتے ہوئے دینی علوم کی تدریس وتعلیم کا سلسلہ جاری رکھیں کہ وہ انسانی زندگی کی ایک اہم ضرورت کو پورا کررہے ہیں، انسانی سوسائٹی کی بہت بڑی خدمت کررہے ہیں اور دنیا وآخرت دونوں حوالوں سے نسل انسانی کی فلاح ونجات کے لیے محنت کررہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان مدارس کو نسل انسانی کی یہ خدمت جاری رکھنے کی توفیق دیں اور نتائج وثمرات کے ساتھ ساتھ قبولیت سے بھی بہرہ ورفرمائیں۔ آمین

دینی مدارس کے طلباء اساتذہ حوصلہ رکھیں:

اس کے بعد میں طلبہ سے بطورخاص یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ آپ حضرات دین کی

تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لے رہے ہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ نیت صحیح ہو اور اس کے مطابق محنت بھی صحیح ہو نیت صحیح نہیں ہوگی تو محنت بیکار جائے گی اور محنت نہیں ہوگی تو نیت بے مقصد ہو جائے گی، دین کی تعلیم سے ہماری سب سے بڑی غرض یہ ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو جائے، اس کے بعد یہ کہ ہم اس کے مطابق عمل کر کے اپنی دنیا اور آخرت کی اصلاح کر لیں اور پھر یہ کہ ہم نے دین اور علم کی یہ امانت دوسرے لوگوں تک پہنچانی ہے آپ حضرات نے یہ محاورہ تو سن رکھا ہوگا کہ ''نیم حکیم خطرہ جان اور نیم ملا خطرہ ایمان'' حکیم کامل نہیں ہوگا تو جان کے لیے خطرہ ہوگا اور ملا ناقص ہوگا تو ایمان کے لیے خطرہ بن جائے گا یہ نیم ملا کون ہے؟ جس کی تعلیم ناقص رہی ہے، جس نے محنت نہیں کی، تکرار نہیں کیا، مطالعہ نہیں کیا، اسباق میں صحیح حاضری نہیں دی، استاد کی بات توجہ سے نہیں سنی، سمجھنے کی کوشش نہیں کی اگر یہ کام نہیں ہوں گے اور دوسرے کاموں میں وقت ضائع کرتے رہیں گے تو علم ناقص رہ جائے گا، علم ادھورا ہوگا، تعلیم نامکمل ہوگی اسی طرح عالم دین کی بجائے ''نیم ملا'' بنیں گے، لوگوں کی ہدایت کی بجائے گمراہی کا ذریعہ بنیں گے، اپنا بھی بیڑہ غرق کریں گے اور دوسروں کا بھی بیڑہ غرق کریں گے اسی لیے اس ذمہ داری کے احساس کے ساتھ تعلیم حاصل کریں اور اس کے لیے محنت کریں کہ کل ہم نے دین کے بارے میں لوگوں کی راہ نمائی کرنی ہے لوگوں کی ہدایت اور اصلاح کا ذریعہ بننا ہے اور اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے ہماری اصلاح ہو، تعلیم مکمل ہو، مضامین پر عبور ہو اور علم میں رسوخ حاصل ہو۔

اور طلبہ سے یہ گذارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس ماحول میں آپ رہتے ہیں آپ کے ارد گرد کے لوگ، مسجد کے نمازی محلہ کے باشندے اور آپ کو بازاروں میں چلتے پھرتے دیکھنے والے لوگ آپ کو دین کا نمائندہ سمجھتے ہیں، آپ کی ہر بات اور ہر حرکت دین

کی طرف منسوب ہوتی ہے، آپ کی طرف دیکھ کر لوگ دین کے بارے میں تاثر قائم کرتے ہیں اور رائے کا اظہار کرتے ہیں، اسی لیے ہمیں یہ بات ہر وقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ہماری کوئی حرکت اور ہمارا کوئی عمل دین کے لیے نقصان اور ہمارے اکابر اور بزرگوں کے لیے بدنامی کا باعث نہ بن جائے۔ اگر ہماری وجہ سے کوئی شخص دین سے متنفر ہوگا یا ہمارے اکابر اور بزرگوں سے بدظن ہوگا تو اس کی ذمہ داری سے ہم بری الزمہ نہیں ہوسکیں گے۔ مثلاً داڑھی نہ کٹوائیں، ننگے سر نہ رہیں، چلتے پھرتے مت کھائیں، بیہودہ مذاق نہ کریں، ساتھیوں کی چیز بلا اجازت استعمال نہ کریں، سگریٹ نوشی نہ کریں، کوشش کریں کہ عملی زندگی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق گزاریں۔

ان گذارشات کے ساتھ ہم سب مل کر دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ تعلیمی سال خیرو عافیت اور ذوق وتوفیق کے ساتھ مکمل کرنے کی توفیق دیں۔ آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

آج کے حالات میں علماء کرام کی ذمہ داریاں

"6 مارچ 2003ء کو دعوہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی فیصل مسجد اسلام آباد میں علماء کرام کی تربیتی کلاس سے خطاب"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْن

امابعد!

دعوہ اکیڈمی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر خالد علوی صاحب ہمارے محترم اور بزرگ دوست ہیں، میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے آج آپ حضرات کے ساتھ ملاقات اور گفتگو کا یہ موقع فراہم کیا، اللہ تعالیٰ ہمارے مل بیٹھنے کو قبول فرمائیں اور کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق عطا فرمائیں آمین۔ مجھے یہ کہا گیا ہے کہ آج کے حالات میں علماء کرام کی ذمہ داریوں کے عنوان پر آپ حضرات سے کچھ عرض کروں، میرے نزدیک یہ دو الگ الگ موضوع ہیں، آج کے حالات مستقل گفتگو کے متقاضی ہیں اور اپنے اندر اس قدر وسعت اور تنوع رکھتے ہیں کہ اگر ان پر بات شروع ہوگئی تو دوسرے عنوان پر کچھ کہنے کا وقت باقی نہیں رہے گا جبکہ علماء کرام کی ذمہ داریاں ایک الگ موضوع ہے اور اس کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ اس پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے، آج کے حالات چونکہ آپ کے سامنے ہیں اور آپ ان میں سے گزر رہے ہیں اس لیے اس حوالہ سے آپ کے مشاہدہ، فہم اور بصیرت پر اعتماد کرتے ہوئے دوسرے عنوان یعنی "علماء کرام کی ذمہ داریاں" پر دو چار باتیں اختصار کے ساتھ عرض کرنا چاہوں گا، علماء کرام کی ذمہ داریوں کا موضوع بھی بے پناہ وسعت کا حامل ہے اور اس

کے بہت سے پہلوؤں پر گفتگو ضروری ہے مگر میں نے ان میں سے تین امور کا آج کی محفل کیلئے انتخاب کیا ہے اور انہی کے حوالہ سے معروضات پیش کر رہا ہوں۔

علم سے بہرہ ور لوگوں کی کسی بھی سوسائٹی میں پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے علم کو خود اپنی ذات تک محدود نہ رکھیں بلکہ اپنے ارد گرد حالات اور ماحول پر نظر رکھتے ہوئے ان لوگوں کو بھی علم و دانش میں اپنے ساتھ شریک کرنے کی کوشش کریں جو اس نعمت سے محروم ہیں، علم کسی بھی نوعیت کا ہو اور دانش کا کوئی بھی میدان ہو اسے معاشرہ میں عام کرنا اور سوسائٹی کے دوسرے لوگوں کو اس میں شریک کرنا اہل علم کی ذمہ داری ہے، خاص طور پر دینی علوم سے بہرہ ور لوگوں کی ذمہ داری زیادہ ہے اس لیے کہ ان کے علم کے ساتھ لوگوں کی ہدایت اور دین و دنیا دونوں کی فلاح وابستہ ہے۔

اس سلسلہ میں دور نبوی ﷺ کا ایک واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں جسے امام محمد بن حسن شیبانیؒ نے ''کتاب الکسب'' میں نقل کیا ہے اور عرب دنیا کے محدث الشیخ عبد الفتاح ابو غدۃؒ نے جو میرے شیخ بھی ہیں اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے، حضرت عبد الرحمن بن ابزیؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن جمعۃ المبارک کے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ ''ما بال أقوام لا یفقھون جیرانھم ولا یعلمونھم ولا یفطنونھم ولا یأمرونھم ولا ینھونھم'' ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو اپنے ارد گرد کے لوگوں کو دین نہیں سمجھاتے، انہیں تعلیم نہیں دیتے، انہیں دانش سے بہرہ ور نہیں کرتے، انہیں نیکی کی تلقین نہیں کرتے اور انہیں برائی سے نہیں روکتے۔ اس کے بعد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''وما بال أقوام لا یتعلمون من جیرانھم ولا یتفقھون ولا یتفطنون'' اور ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو اپنے پڑوسیوں سے علم حاصل نہیں کرتے، ان سے دین نہیں سمجھتے اور ان سے دانش نہیں سیکھتے۔ ان دونوں طبقوں کا ذکر کرنے کے بعد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دونوں طبقے اپنے طرز عمل کی اصلاح کریں، علم والے اپنے

اردگرد کے لوگوں کو تعلیم دیں اور بے علم لوگ اپنے ماحول میں رہنے والے اہل علم سے تعلیم حاصل کریں اور اگر انہوں نے اپنا رویہ نہ بدلا اور طرز عمل کی اصلاح نہ کی تو ''لأعاجلنهم بالعقوبة فی دار الدنیا'' میں ان کیلئے اس دنیا کی زندگی میں سزا مقرر کروں گا یعنی آخرت کی سزا تو اپنی جگہ ہوگی اس دنیا میں بھی ان کیلئے سزا مقرر کی جائے گی، امام محمدؒ نے غالباً اس روایت سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ معاشرہ میں تعلیم کو عام کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے اور اس کیلئے ریاست جبر بھی کر سکتی ہے، روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کے بعد مدینہ منورہ میں حسب عادت چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں کہ یہ بات عام طور پر کہی گئی ہے یا کسی خاص طبقہ کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے، کچھ لوگوں نے کہا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات اشعریین کے بارے میں ارشاد فرمائی ہے، یہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا خاندان تھا جو یمن سے ہجرت کر کے آیا تھا اور مدینہ منورہ میں ایک طرف الگ بستی بسا کر آباد ہوگیا تھا، یہ خاندان پڑھے لکھے لوگوں کا خاندان کہلاتا تھا، انہیں قراء اور فقہاء کے خاندان کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا اور ان کا محلہ اشعریوں کا محلہ کہلاتا تھا جبکہ ان کے اردگرد اعرابی اور کاشت پیشہ لوگ آباد تھے جنہیں تعلیم وغیرہ کیلئے زیادہ وقت نہیں ملتا تھا اس لیے ماحول کی مناسبت سے لوگوں کی نظر ادھر چلی گئی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ان کے بارے میں فرمائی ہے، عام لوگوں کا یہ تاثر اشعریین تک بھی پہنچا اور ان کے سرکردہ لوگ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ اس بات کی تصدیق کر سکیں، روایت کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے استفسار پر اپنی بات دوبارہ دہرادی جو اس بات کی تصدیق تھی کہ لوگوں کا خیال درست ہے، اس پر اشعریوں کے وفد نے پوچھا یارسول اللہ! ان عاقب بطیر غیرنا وتقصیرہ ؟ کیا دوسروں کی کوتاہی اور قصور کی ہمیں سزا دی جائے گی؟ اس پر پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ارشاد گرامی دوبارہ دہرایا۔ اشعریین نے یہ سن کر عرض کیا کہ

"فأمهلنا سنة فأمهلهم سنة" یارسول اللہ ہمیں اس کوتاہی کی تلافی کیلئے ایک سال کی مہلت دے دیں چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک سال کی مہلت عطا فرمائی اور اس کے بعد قرآن کریم سورۃ المائدہ کی آیت 87 اور 97 تلاوت فرمائی

"لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ط ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝"

جس میں کہا گیا ہے کہ بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے جو لعنت فرمائی ہے اس کے اسباب میں ایک بات یہ بھی تھی کہ انہوں نے ایک دوسرے کو برائی سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ اس روایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ ذمہ داری صرف بے علم لوگوں کی نہیں ہے کہ وہ اہل علم سے رابطہ کریں اور ان سے تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کریں بلکہ اہل علم کی بھی اسی طرح یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اردگرد ماحول پر نظر رکھیں اور دین، علم اور دانش تینوں حوالوں سے جو کمی محسوس کریں اسے پورا کرنے کیلئے اپنا کردار ادا کریں، اس لیے میں آپ حضرات سے یہ گزارش کروں گا کہ آپ عالم دین کی سند اور مقام حاصل کرنے کے بعد جہاں بھی جائیں اور جس حوالہ سے بھی اپنی عملی زندگی کا آغاز کریں وہاں کے ماحول میں آپ کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ ماحول اور سوسائٹی میں چاروں طرف نظر دوڑائیں اور علم و دانش کا جو خلا پر کرنے میں آپ کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں اس میں کوتاہی نہ کریں۔

دوسری گزارش یہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ حضرات نے علم دین حاصل کیا ہے جو سراسر خیر کا علم ہے اور خیر کے علوم حاصل کر کے آپ عالم دین بنے ہیں لیکن سوسائٹی میں اپنا کردار صحیح طور پر ادا کرنے کیلئے صرف خیر کا علم کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ شر کا علم بھی ضروری ہے کیونکہ جب تک شر کا علم نہیں ہوگا اور اس سے واقفیت نہیں ہوگی آپ اس سے لوگوں کو روکنے کا فریضہ صحیح طور پر سرانجام نہیں دے سکیں گے، شر کے علم کے بغیر خیر کی

پہچان بھی پورے طور پر نہیں ہو سکتی کہ چیزیں اپنی ضد کے ساتھ پہچانی جاتی ہیں، آپ کی ذمہ داری صرف خیر کو سوسائٹی میں عام کرنا نہیں ہے بلکہ شر کی روک تھام بھی آپ کے فرائض میں ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مطلب یہی ہے اس لیے جب آپ شر سے آگاہ نہیں ہوں گے، اس کے اسباب کا آپ کو علم نہیں ہوگا، اس کے مراکز اور سرچشموں سے واقفیت نہیں ہوگی اور اس کے طریق واردات سے باخبر نہیں ہوں گے اس وقت تک اس کی روک تھام اور سوسائٹی کو اس کے اثرات سے محفوظ رکھنے کیلئے کچھ نہیں کر سکیں گے۔ آج ہماری کمزوریوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہم شر کے اسباب، مراکز، سرچشموں اور طریق کار سے بے خبر ہوتے ہیں اور محض جذباتی اور سطحی طور پر اس کی مخالفت کرتے رہتے ہیں جو اکثر ناکام رہتی ہے اور شر اپنا کام کر گزرتا ہے، اس سلسلہ میں ایک معروف صحابی حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کے ارشاد اور ذوق کا حوالہ دینا چاہوں گا جو فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عام طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کی باتیں پوچھا کرتے تھے اور میں اکثر شر کی باتیں پوچھتا تھا (کانوا یسئالونہ عن الخیر و کنت أسالہ عن الشر۔) حضرت حذیفہؓ زیادہ تر فتنوں کے بارے میں دریافت کیا کرتے تھے کہ وہ کیسے رونما ہوں گے؟ ان کی نوعیت کیا ہوگی؟ اور ان سے بچاؤ کا طریقہ کیا ہوگا؟ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں انہیں فتنوں کا بڑا عالم سمجھا جاتا تھا اور اس حوالہ سے کوئی بات پوچھنے کیلئے عام طور پر ان سے رجوع کیا جاتا تھا، یہ ایک مستقل ذوق ہے اور مستقل دینی ذمہ داری ہے اور جس طرح باقی صحابہ کرامؓ کے اذواق اور خصوصیات کی بنیاد پر امت میں علماء کرام کے مستقل طبقات قائم ہوئے ہیں اسی طرح حضرت حذیفہؓ کے ذوق کو بھی علماء کرام کی ایک بڑی تعداد میں ہر دور میں دین کے مستقل شعبہ کے طور پر اپنایا ہے مثلاً محدثین کرام حضرت ابوہریرہؓ کے ذوق کے حاملین ہیں، مفسرین کرام نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے ذوق سے استفادہ کیا ہے، فقہاء کرام حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے خوشہ چین ہیں، قراء کرام

حضرت ابی بن کعبؓ کے پیروکار ہیں اور وراثت وفرائض کا علم رکھنے والوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کا نقش قدم اختیار کیا ہے اسی طرح ہر دور میں عقیدہ، عمل اور اخلاق کے حوالہ سے رونما ہونے والے فتنوں کی نشاندھی اور ان کی روک تھام کی جدوجہد کرنے والے علماء کرام نے حضرت حذیفہؓ کے مشن کا پرچم بلند رکھا ہے، ان میں حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دھلویؒ جیسے اساطین امت کے نام آتے ہیں۔

مجھے اس سلسلہ میں جب دینی مدارس کے اساتذہ سے گفتگو کا موقع ملتا ہے تو عام طور پر دیوان حماسہ کے دو اشعار کا حوالہ دیا کرتا ہوں جن کا پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک نوجوان کو اس کے خاندان نے پال پوس کر جوان کیا، ناز ونعم میں اس کی پرورش کی اور خوب کھلایا پلایا لیکن فنون حرب کی تعلیم نہیں دی اور اسے جوان ہونے کے بعد جن دشمنوں سے سابقہ پیش آنے والا تھا ان کے مقابلہ کیلئے انہیں تیار نہیں کیا، وہ جوان ہوا اور عملی زندگی میں داخل ہوا تو دشمنوں سے آمنا سامنا ہوا مگر وہ ان کا مقابلہ نہ کرسکا اور اسے شکست سے دوچار ہونا پڑا، وہ اس صورت حال میں اپنے خاندان اور قبیلہ کو کوستے ہوئے کہتا ہے کہ ؎

فهلا أعدونى لمثلى تفاقدوا

وهلا أعدونى لمثلى تفاقدوا

اذا لخصم أبزى مائل الرأس انكب

وفى الأرض مبثوث شجاع وعقرب

میرے خاندان اور قبیلہ والے ایک دوسرے کو گم پائیں جب انہیں معلوم تھا کہ میرا دشمن ٹیڑھی گردن والا، متکبر اور رعونت والا ہے تو انہوں نے مجھے اس کے مقابلہ کیلئے تیار کیوں نہیں کیا؟ اور وہ ایک دوسرے کو گم پائیں جب ان کے سامنے تھا کہ زمین میں ہر طرف سانپ اور بچھو بکھرے ہوئے ہیں تو انہوں نے مجھے ان سے بچاؤ کے طریقے کیوں نہیں سکھائے؟

علماء کرام اور خاص طور پر دینی مدارس کے اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ دشمنوں سے آگاہی حاصل کریں، ان کے طریقہ ہائے واردات کو سمجھیں، ان کے سرچشموں اور مراکز سے واقف ہوں اور ان کی قوت کار کا ادراک حاصل کریں پھر ان کے مقابلہ کیلئے خود بھی تیاری کریں اور اپنے تلامذہ اور خوشہ چینوں کو بھی تیار کریں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے شاگرد اور ہمارے خوشہ چین کل عملی زندگی میں اپنے مدمقابل لوگوں کا سامنا نہ کر پائیں اور دین کے دشمنوں کے سامنے جم کر کھڑے نہ ہو سکیں تو ہمیں یاد کر کے حماسہ کے یہ اشعار زیرلب گنگنانا شروع کر دیں۔

تیسری گزارش آپ حضرات سے یہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ جس ماحول میں جائیں اور جن لوگوں میں بیٹھ کر آپ نے کام کرنا ہے ان کی زبان کو سمجھیں، ان کی ذہنی سطح اور نفسیات سے واقفیت حاصل کریں اور ان کے اسلوب اور ذوق سے آگاہ ہو کر اس کے مطابق ان سے مخاطب ہوں، یہ گفتگو کا بنیادی اصول ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کریم میں اپنے اولین مخاطبین یعنی مشرکین عرب کے طرز گفتگو کو اپنایا ہے، ان کی زبان میں بات کی ہے، ان کے محاوروں اور ضرب الامثال کو اختیار کیا ہے اور ان کی نفسیات اور ذہنی سطح کے مطابق کلام کیا ہے، گفتگو اور خطاب کا پہلا اصول یہی ہے کہ متکلم اپنی زبان اور اسلوب میں نہیں بلکہ مخاطب کی زبان اور اسلوب میں گفتگو کرے ورنہ گفتگو بے فائدہ ہوگی، میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کر کے 1943ء میں گکھڑ ضلع گوجرانوالہ میں آئے تھے اور تب سے وہیں خطابت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں، یہ ساٹھ برس کا قصہ ہے، ان کی مادری زبان پشتو ہے اور اردو پر انہیں ماہرانہ عبور حاصل ہے لیکن انہوں نے خطابت اور درس میں ٹھیٹھ پنجابی زبان کو ذریعہ بنایا، ان کی پنجابی سن کر کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ ان کی مادری زبان نہیں ہے، ٹھیٹھ پنجابی زبان کے ساتھ اس علاقے کے عام محاورے، مثالیں اور

کہاوتیں ان کی زبان پر عام ہوتی ہیں یہی گفتگو اور خطاب کا اصول ہے، (مئی 2009ء میں حضرت کا انتقال ہو چکا) آپ اگر لوگوں کی زبان اور ذہنی سطح کا لحاظ کیے بغیر اپنی سطح اور علم کے معیار پر گفتگو کریں گے تو کسی کے پلے کچھ نہیں پڑے گا، ایسے موقع پر میں ایک لطیفہ علماء کرام کو سنایا کرتا ہوں، آپ حضرات سے بھی عرض کر دیتا ہوں۔

کہتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند سے نئے نئے فارغ ہو کر ایک عالم دین گھر واپس جاتے ہوئے لاہور ریلوے سٹیشن سے گزرے، علم تازہ تازہ تھا، سند بغل میں پڑی تھی، ریلوے سٹیشن پر ایک ریڑھی والے کو گول گپے بیچتے دیکھا، مولوی صاحب نے یہ چیز پہلے نہیں دیکھ رکھی تھی، قریب آئے اور چیک کرنے کیلئے گول گپے خریدنا چاہا، ریڑھی والے سے دریافت کیا کہ ارے میاں! عدداً بیچتے ہو یا وزناً؟ ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ چیز جو تم بیچ رہے ہو گن کر دیتے ہو یا تول کر۔ مگر اتنے بھاری بھرکم الفاظ سے اس ریڑھی والے کے کان آشنا نہیں تھے اس لیے اس نے ایک دفعہ مولوی صاحب کی طرف غور سے دیکھا اور پھر بڑی سادگی سے بولا "صوفی صاحب! میں تے گول گپے ویچناں" یعنی مجھے یہ علم نہیں کہ آپ کیا چیز مانگ رہے ہیں میں تو صرف گول گپے بیچتا ہوں۔ اس لیے آپ حضرات سے میری استدعاء ہے کہ جن لوگوں سے آپ نے مخاطب ہونا ہے اور جن کی تعلیم و اصلاح کے آپ محنت کرنا چاہتے ہیں ان کی زبان، اسلوب، ذہنی سطح اور نفسیات سے واقفیت حاصل کریں اور اس کے مطابق ان میں کام کریں ورنہ آپ کی محنت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں ایک بار پھر ڈاکٹر خالد علوی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے یہاں حاضری اور آپ حضرات سے گفتگو کا موقع عنایت فرمایا اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت ہم سب کو اپنے اپنے ماحول میں دین حق کی صحیح اور موثر خدمت کرتے رہنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

علماء اور جدید دور کے تقاضے

"15 جون 2010ء کو جامعہ دارالعلوم کورنگی کراچی میں "تخصص فی الدعوۃ والارشاد" کے شرکاء سے خطاب"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

آپ حضرات دعوت و ارشاد کے حوالہ سے تخصص کا دو سالہ کورس مکمل کر کے چند دنوں میں فارغ ہونے والے ہیں اور آپ میں سے بیشتر حضرات اپنا تعلیمی دورانیہ مکمل کر کے عملی زندگی کا آغاز کر رہے ہیں اس لئے آپ کے استاذ محترم حضرت مولانا ڈاکٹر ساجد الرحمن صدیقی صاحب کا ارشاد ہے کہ میں آپ حضرات کے سامنے اس موضوع پر گفتگو کروں کہ رسمی تعلیم کے دور سے فارغ ہونے کے بعد عملی زندگی میں داخل ہونے پر آپ لوگوں کو کس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا اور ان سے نمٹنے کے لئے آپ کیا تدابیر اختیار کریں گے۔

ہمارے بزرگوں اور اکابر میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ ایک معروف شخصیت ہیں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کے مایہ ناز شاگرد تھے اور اپنے دور کے ممتاز ارباب علم و دانش اور اصحاب قلم میں ان کا شمار ہوتا تھا، صاحب طرز ادیب اور محقق تھے، انہوں نے جس موضوع پر بھی لکھا خوب لکھا اور اس موضوع کا حق ادا کیا۔

انہوں نے ایک مقالے میں ہمارے دینی مدارس کے نظام تعلیم کو اصحاب کہف کے غار سے تشبیہ دی ہے کہ جس طرح اصحاب غار اپنا ایمان بچانے کے لئے غار میں داخل ہوئے

تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں سینکڑوں سال کے لئے سلا دیا تھا جس سے ان کا ایمان تو بچ گیا تھا مگر جب وہ غار سے نکل کر آبادی میں آئے تو سارا ماحول بدلا ہوا تھا، زبان بدل چکی تھی، سکہ اور کرنسی بدل چکی تھی اور شہر کا پورا منظر تبدیل ہو چکا تھا اسی طرح ہمارے بزرگوں نے برطانوی استعمار کے جبر و استبداد کے دور میں ایمان کے تحفظ کے لئے ہمیں ان غاروں میں داخل کر دیا اور ہم عام ماحول سے کٹ کر دینی مدارس کے اس مخصوص ماحول میں اپنا عقیدہ و ایمان بچانے میں بحمد اللہ کامیاب ہو گئے جو ہمارے ان اکابر کی فراست و بصیرت کا ثمرہ طیبہ ہے لیکن جب سالہا سال تک مدارس کے مخصوص ماحول میں رہنے کے بعد ہم عام سوسائٹی کے ماحول میں واپس آتے ہیں تو بہت سی چیزیں بدلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور بہت سے حوالوں سے عام سوسائٹی کا ماحول ہمارے لئے اجنبی اور ہم اس ماحول کے لئے اجنبی ہوتے ہیں۔

میں آپ دوستوں کو سب سے پہلے اس بات کا احساس دلانا چاہوں گا کہ ان غاروں سے نکل کر جب آپ سوسائٹی کے جنگل میں داخل ہوں گے اور عملی زندگی میں قدم رکھیں گے تو آپ کو بہت سی چیزیں بدلی ہوئی نظر آئیں گی، بہت سی باتیں آپ کو اجنبی دکھائی دیں گی اور بہت سے معاملات آپ کے لئے نامانوس ہوں گے۔

آپ حضرات کو سب سے پہلے اس پریشانی کا سامنا ہوگا اور یہ الجھن آپ کو قدم قدم پر پیش آئے گی، اپنے مانوس ماحول سے مختلف ماحول دیکھ کر آپ کیا کریں گے؟ ظاہر بات ہے کہ آپ کے سامنے دو ہی راستے ہوں گے ایک یہ کہ اصحاب کہف کی طرح واپس غار میں جا کر پھر سے سو جائیں اور دوسرا یہ کہ اپنے آپ کو بدلتے ہوئے ماحول کے ساتھ مانوس کریں اور زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ خود کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کریں کیونکہ کام تو آپ نے اسی ماحول میں کرنا ہے اور ارد گرد کے ماحول سے مانوس اور اس میں ایڈجسٹ ہوئے بغیر آپ اپنے کسی کام میں بھی پیش رفت نہیں کر پائیں گے اور کوئی

خدمت بھی موثر طور پر سر انجام نہیں دے سکیں گے، سوسائٹی کے عمومی ماحول اور زمانے کی تبدیلیوں کیساتھ ایڈجسٹ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اپنے عقیدہ وایمان میں لچک پیدا کریں یا خدانخواستہ اپنی دینی روایات واقدار سے دست بردار ہو جائیں ہرگز نہیں بلکہ اس کا مطلب ومقصد یہ ہے کہ اپنے عقیدہ وایمان اور روایات واقدار کے ساتھ مکمل وابستگی اور وفاداری کو برقرار رکھتے ہوئے ان کے اظہار اور تطبیق کے لئے طریق کار، زبان ولہجہ اور اسلوب وہ اختیار کریں جس کے ذریعہ آپ اپنے اردگرد کے ماحول تک اپنی بات صحیح طریقے سے پہنچا سکیں اور جن لوگوں میں آپ کام کر رہے ہیں ان کے اذہان وقلوب تک رسائی حاصل کر سکیں۔

مثال کے طور پر دو باتوں کی طرف توجہ دلاؤں گا ایک یہ کہ اب سے پون صدی قبل تک ہمارے ماحول میں حضرت مولانا ابو الکلام آزادؒ کی بھاری بھرکم زبان کا سکہ چلتا تھا، اس وقت فصاحت و بلاغت کا معیار یہ تھا کہ نادر الفاظ، مشکل تراکیب اور پرشکوہ جملوں سے کلام مزین ہو، مولانا ابو الکلام آزادؒ کے اسی اسلوب نے ایک عرصہ تک صحافت وخطابت کی دنیا پر حکمرانی کی ہے لیکن اب اس کا دور نہیں رہا اور اگر آج آپ اس زبان میں بات کریں گے تو بہت سے لوگوں کو لغت ومحاورہ کی کتابیں ساتھ رکھ کر آپ کی باتوں کا مطلب سمجھنا پڑے گا، آج کا اسلوب یہ ہے کہ آسان لفظوں میں سادہ ترکیب واسلوب کے ساتھ اپنا پیغام لوگوں تک پہنچائیں، آپ جتنے سادہ الفاظ میں اور آسان اسلوب میں تحریر وتقریر پر قادر ہوں گے اتنے زیادہ موثر طور پر اپنی بات لوگوں سے کہہ سکیں گے۔

ایک بات پر ضرور غور کریں کہ گزشتہ نصف صدی کے دوران ہمیں جن مفکرین اور دانشوروں کے بارے میں یہ شکایت رہی ہے کہ انہوں نے دین کے نام پر اپنے افکار و نظریات کا پرچار کیا ہے اور دین کے ساتھ لوگوں کے تعلق کو مضبوط کرنے کی بجائے فکری انتشار پھیلانے پر زیادہ توجہ دی ہے اور ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ انہوں نے اچھے خاصے حلقے

قائم کر لیے ہیں، میں اس کی عملی مثال کے طور پر غلام احمد پرویز، مودودی صاحب اور جاوید احمد غامدی صاحب کے نام لوں گا آپ اس بات کا ضرور جائزہ لیں کہ یہ حضرات اپنے ارد گرد لوگوں کا اتنا وسیع حلقہ جمع کرنے میں کیسے کامیاب ہوئے ہیں؟

میرے نزدیک اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ سادہ اور عام فہم اسلوب میں بات کرتے ہیں اور کامن سینس میں بات کرتے ہیں، وہ لوگوں کی ذہنی سطح اور نفسیات کو سمجھ کر اس کے مطابق بات کرتے ہیں اور اپنی بات ان کے ذہنوں تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، جبکہ ہم خطابت اور عمومی وعظ میں ابھی تک تدریس و مناظرہ کے اسلوب سے کام لے رہے ہیں اور عام لوگوں کے ساتھ بھی اسی انداز میں گفتگو کرتے ہیں جیسے وہ درس نظامی کی کسی کلاس کے طلبہ ہیں یا کسی مسئلہ میں ہمارے خلاف فریق کے طور پر بیٹھے ہیں اور ہم نے مجادلہ و مناظرہ کے ذریعہ ان سے اپنی بات منوانی ہے یہ اسلوب آج کے دور کا اسلوب نہیں ہے، یہ اسلوب مدت ہوئی متروک ہو چکا ہے اور ہمیں بھی عمومی ماحول میں اسے ترک کر دینا چاہیے، اگر آپ حضرات آج کی دنیا سے مخاطب ہیں اور آج کے لوگوں سے بات کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو بریفنگ اور کامن سینس کا اسلوب سیکھنا ہوگا اس کی مشق کرنا ہوگی اور اس میں مہارت پیدا کرنی ہوگی ورنہ آپ دین کی خدمت کے تقاضے آج کی دنیا میں اور آج کے ماحول میں پورے نہیں کر سکیں گے۔

دوسری بات جس کی طرف اس ضمن میں توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ اب سے نصف صدی پہلے تک خطابت کی دنیا میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے طرز خطابت کی حکمرانی تھی اور انہی کا سکہ چلتا تھا، اس دور میں خطابت کا کمال یہ تھا کہ آپ کتنے گھنٹے تقریر کر سکتے ہیں اور کتنی دیر تک اپنی خطابت کے سحر میں لوگوں کو مسحور کر کے جلسہ گاہ میں بٹھا سکتے ہیں، حضرت امیر شریعت کی خطابت کا نقطہ عروج یہ ہوتا تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد خطاب شروع ہوتا تھا اور فجر کی اذانوں کی آواز لوگوں کو چونکا کر احساس دلاتی تھی کہ رات بیت چکی ہے۔

آج کا اسلوب یہ نہیں ہے آج کی خطابت کا کمال یہ ہے کہ آپ کتنے مختصر وقت میں اپنی بات مکمل کر سکتے ہیں، آج عام لوگوں کے پاس ذہنی اور عملی دونوں حوالوں سے اتنی فرصت نہیں ہے کہ وہ گھنٹوں آپ کے سامنے بیٹھے آپ کی خطابت سے حظ اٹھاتے رہیں مگر ہمارا حال یہ ہے کہ ہم آج بھی اسی پرانے اور متروک اسلوب کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں، ہم میں سے کسی خطیب کو کسی جلسے میں یہ کہا جائے کہ آپ نے اپنی بات پانچ منٹ میں مکمل کرنی ہے تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں، ہم مائیک پر آ کر باقاعدہ غصے کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ ہماری توہین ہے پھر اس پانچ منٹ کے وقت کی تقسیم ہمارے پاس یہ ہوتی ہے کہ تین چار منٹ خطبے میں صرف کر دیتے ہیں، ایک دو منٹ میں غصے کا اظہار کر کے اپنا سارا وقت ضائع کر دیتے ہیں اور جو بات ہم کہنے کے لئے آتے ہیں وہ اسی کشمکش میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔

آج کی خطابت یہ نہیں ہے کہ آپ کتنے گھنٹے لوگوں کو اپنی لفاظی کے سحر میں مسحور رکھ سکتے ہیں بلکہ آج کی خطابت یہ ہے کہ آپ کتنے سادہ لہجے میں اور کتنے مختصر وقت میں اپنی مکمل بات لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں، آپ کو اس بات کی باقاعدہ مشق کرنا ہوگی اور یہ فن سیکھنا ہوگا کہ مختصر وقت میں اپنی بات کہہ سکیں، بات بھی ادھوری نہ ہو اور پیغام بھی نامکمل نہ ہو مگر وقت کم سے کم صرف کریں اور اسلوب و لہجہ لوگوں کے ذہنوں تک رسائی حاصل کرنے والا ہو، اس کے ساتھ ایک اور تبدیلی پر بھی غور کر لیں وہ یہ کہ اب سے دو تین عشرے قبل تک عام لوگوں اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کے پاس دین کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہم لوگ ہوتے تھے، کسی مسئلہ میں انہیں ہم جو معلومات فراہم کر دیتے تھے وہی ان کا سارا مبلغ علم ہوتا تھا، اس لئے ان معلومات کی بنیاد پر ہم ان سے جو بات فتویٰ اور رائے کے طور پر کہہ دیتے تھے وہ ان کے لئے بہرصورت قابل قبول ہوتا تھا۔

مگر آج یہ صورت حال نہیں ہے، عام لوگوں اور خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ حضرات

کے پاس دینی معلومات حاصل کرنے کے متبادل ذرائع موجود ہیں، اخبارات، ٹی وی چینلز اور انٹرنیٹ نے معلومات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے ضروری نہیں کہ یہ ساری معلومات صحیح بھی ہوں لیکن بہر حال معلومات تو موجود اور میسر ہیں اور معاشرے کا کم وبیش ہر تعلیم یافتہ فرد نہ صرف ان سے استفادہ کرتا ہے بلکہ ان کی بنیاد پر فیصلے بھی کرتا ہے، اس ماحول میں اگر ہم کسی مسئلہ میں محدود معلومات کی بنیاد پر بات کریں گے تو وہ لوگوں کو اپیل نہیں کرے گی اور ہمارا علمی اعتماد اور ثقاہت بھی مجروح ہوگی، اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ دینی معلومات میں عام لوگوں کو صحیح راہ نمائی فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی علمی ثقاہت اور اعتماد کو برقرار رکھنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ اپنی معلومات کا دائرہ وسیع کریں، مطالعہ کریں مسائل کے تجزیے کی عادت ڈالیں اور کسی مسئلہ کے تمام ممکنہ پہلوؤں سے واقفیت کے بعد اس کے بارے میں گفتگو کا مزاج بنائیں۔

مقابلہ بہت سخت ہے اور دن بدن سخت تر ہوتا جا رہا ہے اس لئے ہمیں ان تبدیلیوں اور ضروریات کا احساس کرنا ہوگا اور ان کے مطابق تیاری کر کے اپنے طرز عمل، طریق کار اور اسلوب ولہجہ کو اس کی روشنی میں از سر نو تشکیل دینا ہوگا کیونکہ اسی صورت میں ہم اپنی ذمہ داری کو صحیح طور پر ادا کر سکیں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

امت مسلمہ کو درپیش چیلنجز

19 اپریل 2009ء کو ڈیوزبری (برطانیہ) کی مسجد زکریا میں ظہر کی نماز کے بعد خطاب

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ
وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ اَجْمَعِيْنَ

امابعد!

اللہ تعالیٰ کا بے حساب شکر ہے کہ اس نے ہم سب کو اپنے گھر میں نماز کے بعد دین کی کچھ باتیں کہنے سننے کے لئے مل بیٹھنے کی توفیق عطا فرمائی، اللہ رب العزت کچھ مقصد کی باتیں عرض کرنے کی توفیق دیں اور ان پر عمل کی توفیق سے بھی نوازیں، آمین یارب العالمین۔

ابھی آتے ہوئے میرے میزبان دوست جناب سلیمان قاضی نے فرمائش کی ہے کہ ''ملت اسلامیہ کو درپیش چیلنجز'' کے عنوان پر کچھ معروضات پیش کی جائیں، یہ ایک وسیع اور متنوع موضوع ہے جس کے مختلف پہلوؤں پر ایک مجلس میں بات کرنا مشکل ہے البتہ اس کے چند بنیادی پہلوؤں پر کچھ معروضات پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

امت مسلمہ کو کیا مسائل درپیش ہیں اور کن چیلنجز کا سامنا ہے؟ اسے دینی نقطہ نظر سے میں چند تدریجی مراحل میں تقسیم کرنا چاہوں گا، پہلا مرحلہ ایک فرد کا ہے کہ ایک مسلمان فرد کے طور پر اسلام ہم سے کیا تقاضہ کرتا ہے، یہ بہت اہم مرحلہ ہے، اس لئے کہ سوسائٹی اور

اجتماعیت کی بنیاد فرد پر ہوتی ہے، افراد مل کر اجتماعیت اور سوسائٹی کی شکل اختیار کرتے ہیں، جس طرح ایک مشین بہت سے پرزوں پر مشتمل ہوتی ہے، اگر ہر پرزہ اپنی جگہ درست ہے اور صحیح کام کر رہا ہے تو مشین بھی صحیح کام کرے گی اور اگر پرزہ درست نہیں ہے اور اس میں خرابی ہے تو مشین بھی صحیح کام نہیں کرے گی، کسی مشین کے صحیح طور پر کام کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کے تمام پرزے صحیح ہوں، ان میں کوئی خرابی نہ ہو اور اس کے بعد یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ ان کا آپس کا جوڑ صحیح ہو اور نیٹ ورک درست ہو کیونکہ اگر پرزے صحیح ہیں لیکن باہمی جوڑ صحیح نہیں ہے تو بھی مشین صحیح کام نہیں کر سکے گی، اسی طرح سوسائٹی کا معاملہ ہے اگر فرد صحیح ہے اور بحیثیت مسلمان صحیح کام کر رہا ہے، پھر افراد کا باہمی جوڑ صحیح ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ ان کے معاملات درست ہیں تو سوسائٹی کا نظام صحیح ہو گا ورنہ بگڑ جائے گا۔

اسی لئے حضرات صوفیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کی توجہ سب سے زیادہ فرد پر ہوتی ہے، وہ فرد اور نفس کی اصلاح کو اپنا ہدف بناتے ہیں اور اسی پر محنت کرتے ہیں، اس لئے کہ اگر ایک مسلمان بطور مسلمان صحیح ہے تو وہ سوسائٹی کا ایک مفید اور کارآمد پرزہ بنے گا لیکن اگر وہ صحیح مسلمان نہیں ہے تو سوسائٹی میں بھی خرابی پیدا کرے گا، چنانچہ سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ہم سب صحیح مسلمان بننے کی کوشش کریں، ایک مسلمان کے طور پر اللہ تعالیٰ اور ان کے آخری رسول ﷺ کے احکام و فرامین کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں اور ایمان و عقائد، فرائض و عبادات، حلال و حرام، باہمی حقوق و معاملات اور آداب و اخلاق کے حوالہ سے قرآن و سنت کی تعلیمات کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں، یہ ہمارے لئے پہلا مرحلہ اور دائرہ ہے جس پر سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد دوسرا دائرہ خاندان اور فیملی کا دائرہ ہے اور اسلام ہم سے تقاضہ کرتا ہے کہ ہمارا گھر کا ماحول دینی ہو، اس میں قرآن و سنت کے احکام پر عمل ہو رہا ہو، گھر کے اندر

اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسول ﷺ کے احکام و فرامین کی عملداری ہو چنانچہ قرآن کریم کی سورۃ طٰہٰ آیت نمبر 136 میں فرمایا گیا ہے ''وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ'' کہ اپنے گھر والوں کو بھی نماز کی تلقین کرو اور اس پر صبر و حوصلہ سے کام لو یعنی ایک آدمی کا خود اپنے آپ کو نماز کا پابند بنا لینا کافی نہیں ہے بلکہ گھر میں نماز کا ماحول پیدا کرنا اور گھر والوں کو نماز و روزہ کا پابند کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہے، اس آیت کریمہ میں ایک جملہ اور کہا گیا ہے کہ اس پر صبر کرو اس کا ایک معنیٰ مفسرین کرامؒ یہ کرتے ہیں کہ گھر والوں کو نماز کا کہنا مشکل کام ہے اس لئے اس پر صبر و استقامت کا مظاہرہ بھی کرنا ہوگا، یہ بات ویسے بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ساری دنیا کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا آسان ہے لیکن یہ کام اپنے ہی گھر میں کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، اسی طرح ساری دنیا سے لڑنا آسان ہے مگر اپنے آپ سے لڑنا اور اپنے نفس کے خلاف جنگ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، حضرات صوفیاء کرامؒ فرماتے ہیں کہ اسی وجہ سے جناب نبی اکرم ﷺ کے ایک ارشاد گرامی میں اپنے نفس کے خلاف جہاد کو جہاد اکبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بہر حال فرد اور نفس کی اصلاح کے بعد دوسرا دائرہ فیملی اور خاندان کا ہے اور آج ہمیں درپیش چیلنجز اور تحدیات میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے گھروں کا ماحول دینی نہیں رہا اور اسلامی احکام و قوانین کی عملداری ہمارے گھروں کے اندر کم ہوتی جا رہی ہے، جناب نبی اکرم ﷺ نے ایک ارشاد گرامی میں فرمایا ہے کہ گھروں میں بھی نماز پڑھا کرو اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ یعنی جس گھر میں نماز کا ماحول نہیں ہے وہ جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشاد گرامی کے مطابق آباد گھر نہیں ہے بلکہ قبرستان ہے، اس طرح ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس گھر میں قرآن کریم کی تلاوت نہیں ہوتی وہ ویران گھر کی طرح ہے اس لئے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے گھروں کو ویرانی سے نکالیں اور انہیں آباد کرنے کی کوشش کریں جو نماز کا ماحول بنانے، قرآن کریم کی

تلاوت اور احکام اسلامی پر عمل کرنے سے ہوگا تیسرے مرحلہ میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ایک مسلم سوسائٹی اور مسلم کمیونٹی میں ہم مسلمانوں کا آپس میں جوڑ کیسا ہے؟ اور ہم ایک دوسرے کے حقوق وآداب میں اسلامی احکام کی پیروی کس حد تک کر رہے ہیں؟ اسلام نے باہمی حقوق وآداب اور معاشرتی اخلاقیات کی جتنی تفصیل بیان کی ہے اور کسی نظام میں اس کی مثال نہیں ملتی لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ ہماری باہمی معاشرت ان حقوق وآداب اور اخلاقیات سے خالی ہوتی جارہی ہے جن کی قرآن کریم نے اور جناب نبی اکرم ﷺ نے تلقین فرمائی ہے، اس کی صرف ایک مثال سے اندازہ کر لیجئے کہ دیانت اور امانت کے حوالہ سے ہماری معاشرتی صورت حال کیا ہے، آج دنیا کی اقوام میں دیانت اور کرپشن کے حوالہ سے ہمارا کیا تعارف ہے؟ ہمارے پرانے ادوار میں دین اور دیانت کو مترادف سمجھا جاتا تھا، اور دیانت کے لئے بھی دین ہی کا لفظ بولا جاتا تھا، لیکن آج دیانت وامانت کا تعلق ہماری دین داری کے ساتھ بھی قائم نہیں رہا، ایک شخص جو دینداری میں مصروف ہے اور اسے عام طور پر مذہبی آدمی سمجھا جاتا ہے لیکن دیانت کے باب میں وہ ناگفتہ بہ حد تک دین سے دور ہوتا ہے، ہمارے ہاں دیانت اس کو سمجھا جاتا ہے کہ کہیں داؤ نہ لگ سکے اور کہیں داؤ لگ گیا ہے تو کوئی بھی معاف کرنے کو تیار نہیں ہوتا، افراد ضرور مستثنیٰ ہوں گے اور ہیں، لیکن مجموعی طور پر ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے داؤ نہ لگ سکنے کا نام دیانت رکھ لیا ہے، ہماری اس حالت نے ہمیں دین سے تو دور کر ہی رکھا ہے، ہم دنیا سے بھی اس کی وجہ سے دور ہیں کہ بین الاقوامی معاملات میں، تجارت میں، لین دین میں اور معاہدات میں ہمارا اعتماد باقی نہیں رہا حالانکہ ہم سب اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اگر ہم کرپشن سے نجات حاصل کر لیں اور دیانت وامانت کے خوگر ہو جائیں تو ہمارے پچاس فیصد مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے اور ہم اقوام عالم کی برادری میں اپنا مقام حاصل کر لیں گے، اس لئے ہمیں درپیش آج کی تحدیات اور چیلنجز میں سے ایک بڑا چیلنج یہ ہے کہ ہم اپنے داخلی معاشرہ میں

بد دیانتی اور کرپشن سے کیسے نجات حاصل کر سکتے ہیں اور دیانت و امانت کے اسلامی احکام ہماری معاشرتی زندگی میں کس حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔

یہ مرحلہ تو دنیا کے کسی بھی ملک میں موجود مسلم کمیونٹی اور سوسائٹی کیلئے ہے لیکن اس سے اگلا ایک مرحلہ یہ بھی ہے کہ مختلف ممالک میں آباد مسلم سوسائٹیوں کا آپس میں جوڑ اور معاملہ کیسا ہے؟ انڈونیشیا میں مسلمان رہتے ہیں، مراکش میں رہتے ہیں، پاکستان میں رہتے ہیں، ترکی میں رہتے ہیں اور بیسیوں ممالک میں مسلمان اکثریت میں رہتے ہیں ان کا ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ مسلم کمیونٹیز اور مسلم سوسائٹیوں میں اسلامی احکام وقوانین کی عملداری کس درجہ میں ہے؟ وہاں قرآن وسنت کے احکام نافذ ہیں یا نہیں، پھر ان احکام وقوانین کا ایک درجہ یہ ہے کہ حکومتی سطح پر اسلامی قوانین کے نفاذ کا اہتمام ہو، ان ممالک میں نظام شرعی نافذ ہو اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ جن احکام وقوانین کا حکومت واقتدار سے تعلق نہیں ہے ان کا سوسائٹی میں فروغ ہو، رواج ہو اور مسلم سوسائٹیوں میں اسلامی احکام وقوانین اور معاشرتی اخلاقیات پر عمل کا اہتمام پایا جاتا ہو، یہ صورت حال بھی ہمارے سامنے ہے لیکن میں اس سے ہٹ کر یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ مسلم ممالک کے مسلمانوں کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کیسا ہے؟ کیا دنیا بھر کے ممالک ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں، ایک دوسرے کی مشکلات کو اپنی مشکلات سمجھتے ہیں اور مصیبت کے وقت ایک دوسرے کے کام آتے ہیں؟ یہ بہت بڑا لمحہ فکریہ ہے کہ ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ مسلمان دنیا میں آباد ہیں لیکن مختلف مقامات پر الگ الگ پٹ رہے ہیں، مار کھا رہے ہیں اور مصائب وآلام کا شکار ہیں لیکن ملت کی سطح پر کوئی اجتماعی آواز نہیں ہے اور ایک دوسرے کے کام آنے کا کوئی نظم موجود نہیں ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں ملی سطح پر درپیش چیلنجز میں سے یہ بھی ایک بڑا چیلنج ہے۔

اس سے آگے بڑھیں تو ایک اور دائرہ اور مرحلہ سامنے آتا ہے وہ یہ کہ ہم اس کرہ ارضی

میں کم و بیش چھ ارب انسانوں کے درمیان رہتے ہیں اور ان چھ ارب انسانوں کے درمیان فاصلے کم ہوتے جا رہے ہیں، اس گلوبل سوسائٹی میں ہم مسلمانوں کا رول کیا ہے؟ اسی تناظر میں آپ حضرات بھی خود کو دیکھ لیں جو غیر مسلم اکثریت کے ممالک میں رہتے ہیں اور خاص طور پر مغربی ملکوں میں رہائش پذیر ہیں، میں اس حوالہ سے غیر مسلموں کو تین درجوں میں تقسیم کر کے ان کے بارے میں مسلمانوں کے طرزِ عمل کا ایک جائزہ پیش کرنا چاہوں گا۔

غیر مسلموں کی ایک سطح وہ ہے جو تعداد میں اگرچہ بہت کم ہے لیکن وسائل پر کنٹرول کی وجہ سے بہت طاقت ور ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مختلف محاذوں پر حالتِ جنگ میں ہے، سیاست، معیشت، اقتصادیات، عسکریت، سائنس، ٹیکنالوجی، اور تہذیب و ثقافت، ہر محاذ پر مسلمانوں کو مغلوب کرنے اور مسلسل مغلوب رکھنے کی کوشش کر رہی ہے، اور بہت سے شعبوں میں مسلمانوں کو مکمل مغلوب کر لینے کے بعد اب تہذیب و ثقافت اور عقیدہ و نظریہ کے محاذ پر مسلمانوں کے خلاف برسرِ جنگ ہے، اس کی پوری کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب اور ثقافت و عقیدہ کو مکمل شکست دے کر انہیں مغربی فلسفہ و ثقافت کے سانچے میں ڈھال لیا جائے، اس کے لئے میڈیا، لابنگ اور بریفنگ کے جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ہے، سوال یہ ہے کہ غیر مسلموں کے اس طبقہ کا سامنا کرنے اور ان کی مسلط کردہ جنگ کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم کیا کر رہے ہیں؟ ان افراد اور اداروں کی خدمات سے انکار نہیں ہے جو مختلف مقامات پر اس سلسلہ میں انفرادی طور پر مصروف عمل ہیں لیکن اجتماعی طور پر عالمی سطح پر اور ملی دائرے میں اس چیلنج کا ہم کس طرح سامنا کر رہے ہیں؟ یہ ہمارے لئے چیلنج بھی ہے اور لمحہ فکریہ بھی ہے اور خاص طور پر علمی اداروں اور دینی مراکز کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس صورت حال کو سمجھیں اور اسلام اور مسلمانوں کے عقیدہ و ثقافت کو اس خوفناک یلغار سے بچانے کیلئے کردار ادا کریں۔

غیر مسلموں کا دوسرا دائرہ ان لوگوں کا ہے جو اسلام سے متعارف تو ہیں لیکن کنفیوژن کا

شکار ہیں، وہ اسلام کے دشمن نہیں ہیں، اسلام کو سمجھنا چاہتے ہیں، اس کے قریب آسکتے ہیں لیکن شکوک وشبہات کا شکار ہیں، اسی طرح برطانیہ کے ایک دانش ور جم مارشل نے جو پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہے ہیں ایک دفعہ ایک جلسہ میں کہا تھا کہ ہمارے سامنے اسلام کی تین الگ الگ تصویریں ہیں، ایک تصویر وہ ہے جو ہمارے بڑوں نے ہمارے ذہنوں میں بٹھا رکھی ہے اور نسل درنسل ہمارے ذہنوں میں منتقل ہوتی آرہی ہے، دوسری تصویر وہ ہے جب ہم تاریخ میں اسلام اور تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اسلام کی ایک بالکل مختلف تصویر ہمارے ذہنوں میں بنتی ہے لیکن جب ہم اپنے درمیان رہنے والے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں تو ان دونوں تصویروں سے مختلف ایک الگ تصویر بن جاتی ہے، اسلام کی ان تین الگ الگ تصویروں نے ہمارے ذہنوں میں کنفیوژن قائم کر رکھا ہے اگر مسلمان اس کنفیوژن کو دور کرنے کی کوئی صورت نکال سکیں تو مغرب میں مقیم بہت سے لوگ اسلام کو سمجھنے کے لئے خواہش رکھتے ہیں اور اس کے لئے تیار ہیں، جم مارشل کی یہ بات بالکل درست ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ غیر مسلموں کی ایک بہت بڑی اکثریت اس دائرہ میں ہے جو اسلام کے نام سے متعارف ہے، اس کی کچھ تعلیمات سے بھی واقف ہے اور مسلمانوں کو دیکھ رہی ہے لیکن اسلامی احکام وقوانین کے بارے میں شکوک وشبہات سے دوچار ہے کنفیوژن کا شکار ہے، ان کے اس کنفیوژن کو دور کرنے کیلئے آسمان سے فرشتے نہیں اتریں گے، یہ کام ہمیں کو کرنا ہوگا لیکن ہمارے ہاں اس قسم کا کوئی اہتمام موجود نہیں ہے اور میں اسے بھی مسلمانوں کو درپیش چیلنجز میں سے ایک چیلنج سمجھتا ہوں، دنیا میں آباد غیر مسلموں کا تیسرا دائرہ ان لوگوں کا ہے جن تک اسلام کا نام اور اسلام کی دعوت نہیں پہنچی، ایک بڑی تعداد ایسے غیر مسلموں کی دنیا میں موجود ہے جو اسلام کے نام سے بھی متعارف نہیں اور جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کے بارے میں کوئی واقفیت نہیں رکھتی، ان لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچانا، اور انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات جناب نبی اکرم ﷺ کی شخصیت ونبوت اور

اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقف کرانا ہماری ذمہ داری ہے اور بدقسمتی سے اس حوالہ سے بھی دنیا میں اجتماعی طور پر کوئی نظم و اہتمام موجود نہیں ہے، افراد اور اداروں کی سطح پر کام ہو رہا ہے لیکن ملی طور پر اور اجتماعی سطح پر اس حوالہ سے کوئی فکر نہیں پائی جاتی، یہاں تک تو میں نے بات کی ہے ان تحدیات اور چیلنجز کی جو ہمیں آج کی انسانی سوسائٹی میں دینی حوالہ سے مختلف سطحوں پر درپیش ہیں اور اب آخر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ان سے نمٹنے کے لئے کیا کرنا چاہیے؟

میرے خیال میں ہماری ذمہ داری کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ہم صورت حال سے باخبر ہوں، مطالعہ کریں، معلومات حاصل کریں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، ہم نے بے خبری کو ان مسائل کا حل سمجھ رکھا ہے جو درست نہیں ہے، بے خبری کسی مسئلہ کا حل نہیں ہے، شترمرغ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ صحرا میں طوفان کو دیکھ کر اپنا سر ریت میں چھپا لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں طوفان سے بچ جاؤں گا، ہم بھی حالات سے آنکھیں بند کر کے ان کی سنگینی سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں جو غلط طریقہ ہے، اس لئے ہمیں سب سے پہلے باخبر رہنا ہوگا اس صورت حال کو نظروں کے سامنے رکھنا ہوگا اور حالات کو پوری طرح سمجھنا ہوگا، اس کے بعد دوسرا مرحلہ ہے کہ مختلف سطحوں، دائروں اور شعبوں کے بارے میں معلومات اور واقفیت حاصل کرنے کے بعد ہم جس شعبہ میں اور جس سطح پر کچھ کر سکتے ہوں اس کے لئے ہمیں تیار ہونا چاہیے اور کچھ نہ کچھ ضرور کرتے رہنا چاہیے، اسلام اور مسلمانوں کو درپیش چیلنجز اور تحدیات سے بے خبر رہنا بھی میرے نزدیک جرم ہے، اور لاتعلق رہنا تو اس سے بھی بڑا جرم ہے، اور ایمان کے تقاضوں کے منافی ہے اور دینی ذمہ داریوں سے فرار کے مترادف ہے۔ آپ وہی کچھ کریں جو کر سکتے ہیں اور اتنا ہی کریں جتنا کر سکتے ہیں لیکن کچھ نہ کچھ ضرور کریں، لاتعلق نہ رہیں، بے خبر نہ رہیں اور اپنی ذات کے خول میں بند نہ ہوں اس لئے ہم سے ہر شخص کو حالات اور مسائل و مشکلات کا پوری طرح

ادراک کرتے ہوئے اپنی محنت کا شعبہ اور میدان منتخب کرنا چاہیے اور اپنے ذوق اور ظروف کے دائرے میں جو کچھ بھی کسی بھی سطح پر ہم کر سکتے ہیں اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں اور قبولیت وثمرات سے بھی بہرہ ور فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

امت مسلمہ کے مسائل ومشکلات اور علماء کا کردار

"اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد کے زیر اہتمام "امت مسلمہ اور اس کو درپیش مسائل" کے عنوان پر منعقدہ کانفرنس میں 11 مئی 2011ء کو ظہر تا عصر نشست سے خطاب"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اما بعد!

اسلامی نظریاتی کونسل، اس کے چیئرمین مولانا محمد خان شیرانی اور ان کے رفقاء کا شکر گزار ہوں کہ ایک اہم عنوان پر منعقد ہونے والے ارباب علم و دانش کے اس اجتماع میں شرکت اور اس کی ایک نشست کی صدارت کا اعزاز بخشا، اللہ تعالیٰ ہمارا مل بیٹھنا قبول فرمائیں اور کچھ مقصد کی باتیں کہنے اور سننے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

کانفرنس کا مرکزی عنوان "امت مسلمہ اور اس کو درپیش مسائل" ہے اور اس کے ایک ذیلی عنوان پر مجھے گفتگو کے لئے کہا گیا ہے جو "امت مسلمہ کے مسائل ومشکلات اور علماء کا کردار" سے معنون ہے۔

امت مسلمہ اس وقت عالمی اداروں کی رپورٹوں کے مطابق ڈیڑھ ارب سے زیادہ مسلمانوں پر مشتمل ہے، ایک امریکی تھنک ٹینک کے حوالہ سے شائع ہونے والی اخباری خبروں کے مطابق اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ایک ارب سرسٹھ کروڑ کے لگ بھگ ہے اور کہا جاتا ہے کہ مسلم امہ جو دنیا کی کل آبادی کا پانچواں حصہ سمجھی جاتی تھی اب

چوتھے حصے کی طرف بڑھ رہی ہے اور اس طرح دنیا کی انسانی آبادی کا کم و بیش چوتھا حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے، مسلم ممالک کی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ ہے اور زمین کے وسائل کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں کے پاس ہے، اس تناظر میں اگر مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کا جائزہ لیا جائے تو میرے خیال میں اس کی ایک سرسری سی فہرست یوں بنتی ہے۔

☆ امت مسلمہ کسی سیاسی اور فکری مرکزیت سے محروم ہے، خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد مسلم امہ کے پاس کوئی ایسی مرکزیت موجود نہیں ہے جس کی طرف وہ اپنے سیاسی اور فکری مسائل کی طرف رجوع کر سکے یا وہ مسلمانوں کو دنیا کے کسی حصہ میں ان کے مسائل کے حل میں مدد دے سکے، اسلامی سربراہ کانفرنس تنظیم قائم ہونے کے بعد کسی درجہ میں یہ امید قائم ہوئی تھی کہ شاید وہ ایک بین الاقوامی ادارے کے طور پر یہ خلا پر کر سکے مگر اس کا کردار بھی "نشستند و گفتند و برخاستند" سے آگے نہیں بڑھ سکا، اہل تشیع نے تو ایران کے مذہبی انقلاب کے بعد امام غائب کے نمائندہ کے طور پر "ولایت فقیہ" کا دستوری منصب قائم کر کے اپنے دائرہ میں اس خلاء کو پر کر لیا ہے اور دنیا بھر کے اہل تشیع میں اسے مرکز اور مرجع کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے مگر اہل سنت جو مسلم آبادی کی غالب اکثریت پر مشتمل ہے اس قسم کی مرکزیت سے محروم ہے جس کی وجہ سے سیاسی اور فکری انتشار دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اور یہ میرے نزدیک امت مسلمہ کا دور حاضر میں سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

☆ دنیا کے اقتصادی، معاشی اور تجارتی میدان میں مسلمانوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہے جو ان کا جائز حق ہے اور وہ ان شعبوں میں دوسری قوموں کے تابع بلکہ ان کے دست نگر ہیں۔

☆ سائنس، ٹیکنالوجی اور عسکری میدان میں مسلم امہ بین الاقوامی برادری میں اپنے صحیح مقام سے محروم ہے اور میری طالب علمانہ رائے میں ہم اس وقت قرآن کریم کے ایک صریح حکم "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ" کی خلاف ورزی کے سنگین جرم کی سزا بھگت رہے ہیں، قرآن کریم نے مسلمانوں کو عسکری قوت حاصل کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کا معیار

یہ طے کیا ہے کہ ”تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ“ کہ دشمنوں پر تمہارا رعب ہو یعنی عالمی سطح پر عسکری قوت کا توازن تمہارے ہاتھ میں ہو، مگر ہماری حالت یہ ہے کہ نہ صرف عسکری میدان بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے عمومی ماحول میں بھی ہم بہت پیچھے ہیں اور ہمیں ایک حد سے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا جا رہا، مسلم امہ کو گزشتہ ایک ہزار سال کے دوران عالمی سطح پر تین قیادتیں میسر آئی ہیں۔

اندلس کی مسلم حکومت، ترکی کی خلافت عثمانیہ اور جنوبی ایشیا کی مغل شہنشاہیت ان تینوں میں سے اندلس کی حکومت نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف توجہ دی تھی اور اسی کی فراہم کی ہوئی اساس پر آج مغرب کے سائنسی ترقی کا ڈھانچہ کھڑا ہے مگر اندلس کی اسلامی حکومت کے خاتمہ کے بعد خلافت عثمانیہ اور مغل شہنشاہیت میں سے کسی نے اس طرح توجہ نہیں دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب سائنس، ٹیکنالوجی اور عسکریت میں مغرب نے برتری بلکہ اجارہ داری حاصل کر لی تو ہمارے لئے اس طرف آگے بڑھنے کے راستے مسدود ہوتے چلے گئے اس کا صرف ایک نتیجہ سامنے رکھ لیجئے کہ عرب ممالک میں جب تیل کے چشمے دریافت ہوئے تو ہم مسلمانوں کے پاس تیل کو زمین سے نکالنے کی تکنیکی صلاحیت موجود نہیں تھی، ہم تیل کو صاف کر کے استعمال کے قابل بنانے کی پوزیشن میں نہیں تھے اور نہ ہی دنیا میں اس کی مارکیٹنگ کے وسائل اور صلاحیت ہمیں حاصل تھی، اپنی اس نااہلی کی وجہ سے ان کاموں کے لئے ہمیں مغرب کی تیل کمپنیوں کو بلانا پڑا وہ آئیں انہوں نے کام سنبھالا ان کے پیچھے مغرب کے بینک آئے جنہوں نے سرمایہ سمیٹنا شروع کر دیا اور پھر مغرب کی افواج نے آ کر سارا ماحول کنٹرول کر لیا یہ سب کچھ سائنس، ٹیکنالوجی اور عسکری میدان میں ہماری نااہلی کا نتیجہ ہے جو ہم بھگتتے چلے آرہے ہیں اور موجودہ حالات میں مستقبل قریب میں اس صورت حال میں تبدیلی کا کوئی امکان دکھائی نہیں دے رہا۔

☆ ہمارا ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ اس وقت عالمی سطح پر باہمی معاملات کو چلانے اور

کنٹرول کرنے کا جو نظام "اقوام متحدہ" کے نام سے موجود ہے اور اسی کے نام پر سارے معاملات کو کنٹرول کیا جا رہا ہے، اس میں ہماری حیثیت کیا ہے؟ ہم جنرل اسمبلی میں ہر سال دو چار تقریریں کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے دل کی بھڑاس نکال لی ہے مگر پالیسی سازی اور کنٹرول کی اصل قوت سلامتی کونسل میں ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے اور ویٹو پاور رکھنے والے پانچ ممالک اقوام متحدہ کے نام پر دنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔

☆ عالمی سطح سے ہٹ کر ملکی سطح پر آجائیں تو ہماری صورت حال یہ ہے کہ سرے سے ہمارا کوئی قومی رخ ہی متعین نہیں ہے، ہم نے دستور میں اسلام اور جمہوریت کو قومی پالیسیوں کی اساس قرار دے رکھا ہے، کہ حکومت عوام کے منتخب نمائندوں کی ہوگی مگر وہ قرآن وسنت کے مطابق حکومت کو چلانے کے پابند ہوں گے مگر قومی سطح پر ہم اسلام اور جمہوریت میں سے کسی کے ساتھ مخلص نہیں ہیں اور چھ عشرے گزر جانے کے باوجود آج بھی ہم اس بحث میں الجھے ہوئے ہیں کہ یہ ملک اسلامی ہے یا سیکولر اور اس کی پالیسیوں میں قرآن وسنت کی راہ نمائی کا کوئی حصہ ہونا چاہیے یا نہیں؟ قومی سطح پر ہماری یہ بے رخی اور تذبذب ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور جب تک ہم اس سے نجات حاصل نہیں کریں گے، کسی سمت بھی پیش رفت نہیں کر سکتے۔

☆ ہمارا دوسرا بڑا مسئلہ قومی خود مختاری کا ہے جس سے ہم مسلسل محروم ہوتے جا رہے ہیں، ڈرون حملوں اور ملکی معاملات میں بیرونی مداخلت نے ہماری خود مختاری کو چیلنج کر رکھا ہے مگر ہماری سیاسی قیادتوں کے پاس مذمت کے بیانات کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، ہمارا حال یہ ہے کہ ہماری منتخب پارلیمنٹ قومی خود مختاری کے حوالہ سے ایک متفقہ قرارداد پاس کرتی ہے لیکن ہمارے پاس اس پر عملدرآمد کا حوصلہ نہیں ہے۔

☆ ہمارا ایک بڑا قومی مسئلہ معاشی عدم توازن کا ہے، ایک طرف عیاشی، فضول خرچی اور نمود و نمائش انتہاء کو پہنچ چکی ہے اور دوسری طرف فاقہ اور فقر کے باعث عام آدمی خودکشیاں کر

رہے ہیں، مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے، لوڈ شیڈنگ نے عوام کی زندگی اجیرن کر دی ہے مگر ہمارے حکمرانوں کو معاملات کو سلجھانے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی۔

☆ ہمارا ایک بڑا مسئلہ دہشت گردی ہے، ہم نے دہشت گردی کی کوئی تعریف متعین کرائے بغیر مبینہ دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ میں شرکت اختیار کر رکھی ہے جس نے دہشت گردی، تحریک آزادی اور قومی خودمختاری کے مسائل کو گڈمڈ کر کے رکھ دیا ہے اور اس کی وجہ سے ہمارے ملک کے اندر دہشت گردی اور باہمی قتل وقتال کا بازار گرم ہے، یہ دہشت گردی مذہب کے نام پر بھی ہے لیکن صرف مذہب کے نام پر نہیں ہے کراچی میں ہونے والی دہشت گردی میں مذہب کا کوئی کردار نہیں ہے اور نہ ہی بلوچستان میں ہونے والے قتل وقتال میں مذہب فریق ہے، پھر اس مبینہ دہشت گردی کا صرف ملک کے اندر کے معاملات سے تعلق نہیں ہے بلکہ عالمی قوتیں اور بین الاقوامی ایجنسیاں اس میں پوری قوت کے ساتھ شریک ہیں اور سب سے زیادہ کردار انہیں کا ہے ملک کے اندر ہونے والے اس خوفناک قتل وقتال میں صرف مذہبی فرقہ واریت اور مذہبیت کو ذمہ دار قرار دینا کسی طرح بھی انصاف کی بات نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی ایجنسیاں، لسانیت اور علاقائی قومیتیں اس کا اہم فریق ہیں، لیکن ہم سب عوام کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف مذہبی عناصر کو رگڑتے چلے جا رہے ہیں۔

☆ ہمارا ایک مسئلہ تہذیبی شناخت کے تحفظ کا بھی ہے کہ مغربی تہذیب وثقافت کی یلغار ہماری تہذیبی شناخت کو دھیرے دھیرے ختم کرتی جا رہی ہے اور مغرب کی یہ دھاندلی ہم پر مسلط ہے کہ اقوام متحدہ کا منشور قومی اور علاقائی تقاضوں کے تحفظ کی بات کرتا ہے مگر مغرب اپنی تہذیب وثقافت کو دنیا پر مسلط کرنے کے لئے علاقائی اور قومی ثقافتوں کو بلڈوز کرتا جا رہا ہے، اس نے میڈیا، لابنگ اور تخویف وتحریص کے سارے وسائل اسلامی ثقافت کی اس جنگ میں جھونک رکھے ہیں۔

حضرات محترم!

میں نے اپنے بزرگوں اور اہل دانش کے سامنے امت مسلمہ کو درپیش مسائل کی صرف ایک فہرست پیش کی ہے جو مکمل نہیں ہے البتہ اس سے ایک ہلکا سا عمومی تناظر سامنے آجاتا ہے، اس کے بعد اس سلسلہ میں علماء کے کردار کی طرف آتا ہوں کہ میرے ناقص خیال میں ان کی ذمہ داری کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

☆ وہ پہلے خود ان مسائل کا احساس اور شعور حاصل کریں اس لئے کہ ہمارے علماء کرام اور اہل دانش کی اکثریت کو سرے سے ان مسائل و مشکلات کا احساس اور ادراک تک حاصل نہیں ہے۔

☆ امت مسلمہ میں اس کے مسائل و مشکلات کا شعور بیدار کریں، قرآن وسنت اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کے سامنے ان مسائل کا حل پیش کریں، ان حوالوں سے نئی نسل کے ذہنوں میں پیدا کئے جانے والے شکوک وشبہات کے ازالے کا اہتمام کریں اور مسلم رائے عامہ کو بیدار کرنے کی طرف سنجیدہ توجہ دیں۔

☆ خود کو صرف فکری راہ نمائی تک محدود نہ رکھیں بلکہ مسائل کے حل کے عملی راستوں کی تشکیل اور تنظیمی وتحریکی ماحول پیدا کرنے کی کوشش بھی کریں۔

میں ایک بار پھر اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین مولانا محمد خان شیرانی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے ارباب علم و دانش کی اس محفل میں حاضری، چند احباب کے ارشادات سننے اور کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو قبول فرمائیں اور ہم سب کو اپنی ذمہ داریاں صحیح طریقہ سے سرانجام دینے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

نیم ملا خطرۂ ایمان

"8-9 جنوری 2011ء کو بہاولپور کے دینی اداروں، دارالعلوم مدنیہ، جامعہ نظامیہ، جامعہ عباسیہ اور جامعہ صدیقیہ میں اساتذہ اور طلبہ کے مختلف اجتماعات سے خطاب"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْن

امابعد!

دارالعلوم مدنیہ بہاولپور میں حاضری اور اساتذہ وطلبہ سے ملاقات میرے لئے اس حوالہ سے زیادہ خوشی اور سعادت کی بات ہے کہ اس ادارے کے قیام میں میرے ایک بزرگ دوست حضرت مولانا غلام مصطفی بہاول پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کا بنیادی کردار ہے اور یہ ان کی یادگار اور صدقہ جاریہ ہے انہوں نے حضرت مولانا مفتی عطاء الرحمن صاحب اور دیگر رفقاء کے ساتھ مل کر اس دینی ادارے کی بنیاد رکھی جو آج ملک کے معروف مدارس میں شمار ہوتا ہے اور ان کے فرزندان حضرت مولانا مفتی عطاء الرحمن کی سرپرستی میں اس دینی وعلمی جدوجہد کو مسلسل آگے بڑھا رہے ہیں۔

حضرت مولانا غلام مصطفی بہاولپوری" عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت اور جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے سرگرم راہنماؤں میں سے تھے تحریک ختم نبوت، تحریک نفاذ شریعت، شریعت بل کی جدوجہد اور تحریک نظام مصطفی میں ان کے ساتھ میری طویل

جماعتی و تحریکی رفاقت رہی ہے اور ہم نے حضرت مولانا عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ، حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ کی راہنمائی اور رفاقت میں دینی جدوجہد میں شرکت کا شرف حاصل کیا ہے، فالحمد للہ علی ذلک۔

ایک دینی مدرسہ کے اساتذہ اور طلبہ جمع ہیں اور مجھے ان کی خدمت میں کچھ معروضات پیش کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔

تعمیل حکم میں پہلی بات تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں انسانی سوسائٹی میں اپنے کام کی نوعیت اور اہمیت کے بارے میں سمجھنا چاہیے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ کیا ہے، اسے دنیا کس نظر سے دیکھ رہی ہے، دینی مدارس کی مخالفت کرنے والے ان مدارس کے خلاف کیوں ہیں اور مدارس کے خلاف اہل مغرب کے غصہ و اضطراب کی وجہ کیا ہے؟ ہمارا کام تو واضح ہے کہ ان مدارس میں قرآن وسنت کی تعلیم دی جاتی ہے اور آسمانی تعلیمات کے تحفظ اور فروغ کے ساتھ ساتھ عام انسان کا آسمانی تعلیمات کے ساتھ تعلق قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، یہ مدرسہ نہ صرف ”آسمانی تعلیمات“ وحی الٰہی اور قرآن وسنت کے احکام وقوانین کو پڑھا رہا ہے بلکہ اسلام کے معاشرتی کردار کی بحالی کے لئے بھی محنت کر رہا ہے جبکہ دنیا کی اکثریت مذہب کے معاشرتی کردار سے دست بردار ہو چکی ہے اور عقیدہ، دین اور مذہب کو فرد کا ذاتی اور اختیاری معاملہ قرار دے کر اجتماعی معاملات اور معاشرتی مسائل میں مذہبی راہنمائی کو اس نے مسترد کر رکھا ہے، یہ بات کہ انسانی سوسائٹی کے معاملات اور معاشرہ کے اجتماعی مسائل میں آسمانی تعلیمات کی راہنمائی اور بالا دستی ہونی چاہیے یا نہیں اس میں دنیا کی باقی اقوام ایک طرف ہیں اور اہل اسلام دوسری طرف ہیں۔ مسلمان امت بحمد اللہ تعالیٰ آج بھی اپنے معاشرتی مسائل میں قرآن وسنت کی راہنمائی کو تسلیم کرتی ہے اور اس سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہے۔

ایک مغربی دانش ور نے لکھا تھا کہ باقی دنیا نے حکومت و ریاست اور معاشرت کے معاملات میں خدا، رسول اور کتاب کا حوالہ ختم کر دیا ہے اور سب قومیں اور ممالک آزادانہ مرضی کے ساتھ اپنے معاملات طے کرتے ہیں مگر مسلمانوں نے آج بھی قرآن و سنت کا حوالہ قائم رکھا ہوا ہے، ان سے جس مسئلہ پر بات کی جائے وہ خدا کا حوالہ دیتے ہیں، قرآن کریم کا حوالہ دیتے ہیں اور جناب نبی اکرم ﷺ کے حوالہ سے بات کرتے ہیں، میں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ بات درست ہے، الحمد للہ آج بھی ہمارا سب سے بڑا حوالہ اللہ تعالیٰ، قرآن کریم، جناب نبی کریم ﷺ کے ارشادات ہیں اور یہ حوالہ اس قدر مضبوط و مستحکم ہے کہ اوباما، بش اور ٹونی بلئیر کو بھی مسلمانوں سے جب بات کرنا ہوتی ہے تو قرآن کریم کی کوئی آیت یا جناب نبی اکرم ﷺ کی کوئی حدیث یاد کر کے اس کا حوالہ دینا پڑتا ہے۔

آج جس چیز کو فکری، ثقافتی کشمکش، تہذیبی جنگ اور سولائزیشن وار قرار دیا جا رہا ہے وہ یہی نکتہ ہے اور مغرب اور اس کی ممنوع قوموں کو پریشانی لاحق ہے کہ عام مسلمان دنیا کے کسی بھی حصہ میں اپنے معاملات و مسائل میں خدا اور رسول ﷺ کا حوالہ ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، مسلمان حکمرانوں اور حکمران طبقات کی صورت حال اس سے مختلف ہے مگر عام مسلمانوں کی صورت حال پوری دنیا میں یہی ہے کہ وہ قرآن و سنت پر اور اسلام کے معاشرتی کردار پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے معاملات خدا اور رسول ﷺ کے حوالہ سے ہی طے کرنا چاہتے ہیں۔

آج عالمی صورت حال یہ ہے کہ مغربی استعمار سیاسی، معاشی، سائنسی، تجارتی اور عسکری شعبوں میں ہم پر کتنا ہی حاوی کیوں نہ ہو اور اس نے عالم اسلام کو ان شعبوں میں کتنے ہی مضبوط شکنجے میں کیوں نہ جکڑ رکھا ہو مگر فکری، دینی اور ثقافتی محاذ پر اسے شکست کا سامنا ہے اور وہ دو بلکہ تین صدیوں کی محنت کے باوجود عام مسلمان کا تعلق قرآن و

سنت سے توڑنے میں کامیاب نہیں ہو رہا ہے، اسے اس ناکامی پر سخت پریشانی لاحق ہے اور اب اس کی یہ پریشانی جھنجلاہٹ میں تبدیل ہوتی جارہی ہے جس کا مظاہرہ وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔

مغرب کا تجزیہ ہے کہ اس صورت حال کا سبب یہ دینی مدارس ہیں جو قرآن وسنت کی نہ صرف تعلیم دیتے ہیں بلکہ انہوں نے دینی ماحول بھی قائم رکھا ہوا ہے اور اسلامی تہذیب وثقافت کی روایات ومظاہر کو دنیا کی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا، مغرب ثقافتی محاذ پر اپنی ناکامی کا سب سے بڑا سبب دینی مدارس کو سمجھتا ہے اور اس مقصد کے لئے اپنے تمام تر وسائل اور صلاحیتیں صرف کر رہا ہے کہ کسی طرح ان مدارس کا وجود ختم ہو جائے یا کم از کم ان کے معاشرتی کردار کو غیر موثر بنا دیا جائے مگر اس میں بھی اسے کامیابی حاصل نہیں ہو رہی، یہ اہل مغرب کا مغالطہ ہے اور کبھی کبھی ہم بھی اس مغالطے کا شکار ہو جاتے ہیں کہ دینی مدارس، دین کی حفاظت کر رہے ہیں اور قرآن وسنت کی تعلیمات کو باقی رکھے ہوئے ہیں ظاہری طور پر بات ایسی ہی نظر آرہی ہے مگر یہ بات مغرب کی سمجھ سے بالاتر ہے البتہ ہمیں ضرور ہر وقت اسے پیش نظر رکھنا چاہیے کہ دینی مدارس کی وجہ سے قرآن وسنت کی تعلیمات باقی نہیں بلکہ قرآن وسنت کی وجہ سے دینی مدارس کا وجود قائم ہے، قرآن کریم نے اور جناب نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات نے تو باقی رہنا ہے اور قیامت تک رہنا ہے اس لئے کہ ان کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اٹھا رکھی ہے اور جب قرآن کریم نے باقی رہنا ہے تو دینی مدارس نے بھی بہر حال قائم رہنا ہے کہ وہ اس حفاظت کے اسباب میں سے ہیں۔

محترم اساتذہ اور طلبہ!

آپ حضرات اس ماحول میں قرآن وسنت، فقہ اسلامی اور دیگر علوم کی تعلیم دے رہے ہیں اور حاصل کر رہے ہیں اس لئے یہ رسمی اور عام تعلیم وتدریس نہیں ہے اس کا ایک

خاص ہدف ہے اور منزل ہے وہ یہ کہ آج کے دور میں جب دنیا کی بیشتر اقوام آسمانی تعلیمات سے دست برداری اختیار کر چکی ہے صرف ہم ہیں جو نہ صرف آسمانی تعلیمات کی بات کرتے ہیں اور ان کی بقا و تحفظ کے لئے کوشاں ہیں بلکہ پڑھتے پڑھاتے بھی ہیں، ان پر عملدرآمد کا ماحول باقی رکھے ہوئے ہیں اور انسانی معاشرے میں آسمانی تعلیمات کی واپسی اور بالا دستی کی جدو جہد بھی ہمارے اہداف میں شامل ہے۔

اس لئے میں آپ حضرات کی خدمت میں دو تین باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں انہیں آپ مشورہ سمجھ لیں یا نصیحت قرار دے لیں مگر ان پر توجہ ضرور دیں۔

☆ایک یہ کہ ہمیں قرآن وسنت کی تعلیمات حاصل کرنے اور فقہ اسلامی پڑھنے کے ساتھ ساتھ اپنے ارد گرد کے ماحول اور اس وقت کی عالمی صورت حال کو بھی سمجھنا ہے اسلامی تعلیمات کو جس سوسائٹی میں ہم فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں اس سوسائٹی کی ضروریات، نفسیات، ذہنی سطح اور تقاضوں کو سمجھنا اور ان کا علم حاصل کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے ہم اپنے بزرگوں کا یہ قول نقل ضرور کرتے ہیں کہ

''من لم یعرف اھل زمانہ فھو جاھل''

مگر اس سے سبق حاصل نہیں کرتے اس جملہ کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ جو شخص اپنے زمانے کے لوگوں کو نہیں جانتا وہ جاہل ہے لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ عالم بننے کے لئے صرف کتابی علم کافی نہیں بلکہ سوسائٹی اور زمانے کا علم بھی ضروری ہے جبکہ ہماری صورت حال یہ ہے کہ ہم دنیا کے حالات بلکہ اپنے ملک کے حالات سے واقفیت کے لئے بسا اوقات اخبار کے مطالعہ کو بھی ضروری نہیں سمجھتے اور اسے فضول قرار دیتے ہیں، میں نے بعض مدارس میں دیکھا ہے کہ مدرسہ کی حدود میں اخبار کا داخلہ تک بند ہے ہم نے حالات سے واقف نہ ہونے کو مسائل کا حل سمجھ رکھا ہے یہ بات درست نہیں ہے اور اس سے خرابیاں

پیدا ہوتی ہیں، ہمارے لئے اور بالخصوص اساتذہ کے لئے یہ بہت زیادہ ضروری ہے کہ وہ حالات سے واقفیت حاصل کریں اور دنیا میں روزمرہ رونما ہونے والی تبدیلیوں سے باخبر رہیں تاکہ وہ اپنے طلبہ کو کتابی علم کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ سوسائٹی پر اس کے اطلاق اور حالات کے ساتھ ادا کی تطبیق کی صورتیں بھی بتا سکیں اور انہیں آنے والے حالات میں ان کی ذمہ داریوں کے لئے تیار کر سکیں۔

☆ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارا تعلیمی معیار دن بدن گرتا جا رہا ہے جو انتہائی افسوسناک اور تشویشناک بات ہے میں ایک ذاتی واقعہ اس سلسلہ میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میرے تعلیم و تعلم کے زمانے میں والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ کا معمول تھا کہ سال کے دوران جو کتابیں میں نے پڑھی ہوتی تھیں سالانہ تعطیلات کے دوران ان میں ایک دو کا انتخاب کر کے وہ مجھ سے سنتے تھے اور اس سنانے میں مجھے کتاب خود حل کر کے بیان کرنا ہوتی تھی۔

شرح عقائد میں نے حضرت والد محترمؒ سے ہی پڑھی تھی اور چھٹیوں میں انہیں سنائی بھی تھی، میں نے اپنی سہولت کے لئے حضرت مولانا عبد العزیز فرہارویؒ کی کتاب "النبراس" رکھی ہوتی تھی جو عربی میں شرح عقائد کی بہت اچھی شرح ہے، ایک دن حضرت والد محترمؒ نے میرے پاس وہ کتاب دیکھ لی اور سخت غصہ ہوئے کہ میں "النبراس" دیکھ کر شرح عقائد کی عبارات کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہوں، انہوں نے "النبراس" مجھ سے لے کر ضبط کر لی اور فرمایا کہ نفس کتاب سے مسئلہ حل کرو۔

آپ اندازہ کیجئے کہ ایک وقت وہ تھا کہ طالب علم کے کتاب کے حل کے لئے عربی شرح دیکھنے کو پسند نہیں کیا جاتا تھا مگر آج صورت حال یہ ہے کہ بہت سے اساتذہ اپنی تپائی کے نیچے کتاب کا اردو ترجمہ اور شرح رکھ کر اس کی مدد سے پڑھاتے ہیں، یہ تدریس و تعلیم کے معیار کا انحطاط ہے جو دن بدن بڑھتا جا رہا ہے، اساتذہ کو اس طرف زیادہ توجہ

دینی چاہیے۔

اس سلسلہ میں لطیفہ کی بات یہ ہے کہ ''النبراس'' کی ضبطی کے بعد ایک عرصہ تک والد محترم سے وہ کتاب مانگنے کا حوصلہ نہیں ہوا اور ان کی وفات سے شاید ایک دو سال قبل میں نے ایک دن ہنستے ہنستے کہا کہ حضرت! میری وہ کتاب تو واپس کر دیں تو انہوں نے ایک الماری کی طرف اشارہ کیا کہ وہاں پڑی ہے لے لو اور اس طرح میں نے کم وبیش چالیس سال کے بعد ''النبراس'' دوبارہ حاصل کی۔

پندرہ بیس سال قبل کی بات ہے کہ ایک بار میں نے حضرت والد محترمؒ سے دل لگی کے انداز میں عرض کیا کہ ہمیں آپ پڑھائی کے دوران بہت ڈانٹا کرتے تھے اب سنائیں آپ کے شاگردوں کا کیا حال ہے؟ فرمانے لگے کہ ''سنگیوتم لوگ پھر بھی بہتر تھے کہ عبارت تو پڑھ لیا کرتے تھے'' المیہ یہ ہے کہ یہ انحطاط مسلسل بڑھ رہا ہے اور اس کے سد باب کے لئے مدارس کے جن وفاقوں کو توجہ دینی چاہیے ان کے پاس اس کے لئے فرصت ہی نہیں ہے۔

☆ تیسری بات عزیز طلبہ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ عالم دین بننے جا رہے ہیں اور آپ کا مقصد یہ ہے کہ علم دین حاصل کر کے اس پر عمل کریں گے اور اسے آگے پہنچائیں گے، اس آگے پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ علم آپ کے پاس موجود ہو، آپ ایک چیز لوگوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو وہ خود آپ کے پاس بھی ہونی چاہیے ورنہ تقسیم کیا کریں گے۔

علم آپ کے پاس موجود ہوگا اور اپنے علم پر آپ کا اعتماد ہوگا تو لوگوں تک علم صحیح طریقہ سے پہنچا سکیں گے اور آپ کے پاس خود اگر علم نہیں ہوگا یا ہوگا مگر ادھورا ہوگا تو خرابی پھیلانے کا باعث بنیں گے، ایک عام محاورہ ہے کہ ''نیم حکیم خطرۂ جان اور

نیم مُلا خطرۂ ایمان۔"

حکیم اگر ادھورا ہو اور اناڑی ہو تو وہ لوگوں کی جانوں کے لئے خطرہ ہوتا ہے اور اگر ملا ادھورا اور اناڑی ہو تو وہ لوگوں کے ایمان کے لئے خطرہ بن جاتا ہے اور یہ امر واقعہ ہے اس لئے کہ اس وقت آپ جن فتنوں کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں اور ان کے سدباب کے لئے متفکر رہتے ہیں ان کا اگر تجزیہ کریں گے تو ہر فتنہ کے پیچھے آپ کو کوئی نہ کوئی "نیم ملا" کھڑا نظر آئے گا جو تعلیم و تربیت یا فکری اصلاح کے کسی نہ کسی حوالہ سے ادھورا ہوگا اور مُلا کی بجائے "نیم مُلا" ہوگا، ہمارے دینی مسائل اور معاملات زیادہ تر نیم ملاؤں کے ہاتھوں ہی بگڑے ہیں اس لئے عزیز طلبہ سے میری گزارش ہے کہ وہ "مُلا" بنیں "نیم مُلا" نہ بنیں اور مُلا بننے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تعلیم کی طرف سب سے زیادہ توجہ دیں، سبق پابندی کے ساتھ پڑھیں، ناغے سے گریز کریں، مطالعہ اور تکرار کا اہتمام کریں اور سب سے بڑی بات کہ وہ اپنا وقت ضائع نہ کریں، یہ آٹھ دس سال جو آپ کو پڑھنے کے لئے ملے ہیں ان کو غنیمت سمجھیں اور پڑھائی کے علاوہ اور کاموں کی طرف دھیان نہ دیں اور کاموں کے لئے ساری زندگی پڑی ہے، یہ دور آپ کا تعلم کا دور ہے، سیکھنے کا دور ہے، تربیت کا دور ہے اور تیاری کا دور ہے، ان اوقات کو انہی کاموں میں صرف کریں اور یاد رکھیں کہ اس دوران اگر کوئی کمی رہ گئی تو وہ ساری زندگی اسی طرح رہے گی، نہ ہی اس کمی کو دور کرنے کا پھر موقع ملے گا اور نہ ہی اس کے لئے آپ کے پاس فرصت ہوگی۔

میں اپنا ذاتی تجربہ عرض کرنا چاہتا ہوں میں نے بحمد اللہ تعالیٰ آٹھ دس سال مدرسہ کے ماحول میں گزارے ہیں اس دور میں وفاق کی درجہ بندی ہمارے ہاں نہیں ہوتی تھی اور کتابوں کی ترتیب سے ہی پڑھا جاتا تھا میں کسی جھجک کے بغیر آپ سے عرض کرتا ہوں کہ جن فنون میں دوران تعلیم کمزوری رہ گئی ہے بخدا اپنے چالیس سالہ تدریسی دور میں بھی انہیں ختم نہیں کر سکا نہ مصروفیات میں سے اس کے لئے وقت نکل سکا ہے اور نہ ہی اس کے مواقع

میسر آتے ہیں اس لئے طلبہ سے عرض ہے کہ اس تعلیمی دورانیہ کو پوری توجہ اور ہمت وصبر کے ساتھ تعلیمی محنت میں ہی صرف کریں تا کہ ایک صحیح "مُلّا" بن کر دین وقوم کی صحیح خدمت کر سکیں، اللہ تعالی ہم سب کو اس کی توفیق عطاء فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

دعوت و تبلیغ کا دینی فریضہ

زکریا مسجد رفیق کالونی فیصل آباد میں تبلیغی اجتماع سے خطاب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْن

امابعد!

اللہ رب العزت کا بے پناہ احسان اور فضل ہے کہ اس نے ہم سب کو عشاء کی نماز مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق دی اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ نماز کے بعد ہمیں تھوڑی دیر کے لئے دین کی باتیں کہنے اور سننے کی غرض سے بٹھا دیا، اللہ تعالیٰ ہمارے اس مل بیٹھنے کو قبول فرمائیں اور کچھ مقصد کی باتیں کہنے اور سننے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

دعوت و تبلیغ کا کام:

ہماری یہاں حاضری خیر کے ایک کام میں شرکت اور خیر کا کام کرنے والوں کے ساتھ کچھ وقت گزارنا ہے، دعوت کا یہ عمل ہماری دینی ذمہ داریوں میں سے ہے اور ہماری ملی ضروریات میں سے بھی ہے اس لئے کہ پوری نسل انسانی جو اس وقت ساڑھے چھ ارب کے لگ بھگ انسانوں پر مشتمل ہے اس کے تمام افراد تک اسلام کی دعوت پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے، پوری نسل انسانی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دعوت ہے جبکہ دنیا کے

ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ مسلمان رسول اللہ ﷺ کی امت اجابت ہیں، امت دعوت تک دین کی دعوت پہنچانا امت اجابت کا فریضہ ہے اور امت دعوت کو امت اجابت کے دائرے میں لانے کی محنت کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے، یہ کام آسمان سے فرشتوں نے آکر نہیں کرنا ہم نے ہی کرنا ہے اور ہم اگر اس طرف توجہ نہیں دیں گے تو ہم سے اس ذمہ داری اور اس کی ادائیگی کے بارے میں سوال ہوگا اسی طرح جیسے امت دعوت کو امت اجابت کے دائرے میں لانے کی کوشش کرنا ہماری ذمہ داری ہے ایسے ہی امت اجابت کو دین کی طرف واپس لانے کی محنت بھی ہمارے فرائض میں شامل ہے کیونکہ آج بحیثیت امت مسلمہ ہم دین سے دور ہو چکے ہیں اور دین کے اعمال ہماری عملی زندگی سے نکل چکے ہیں، امت کا دین کی طرف واپس آنا اور دین کے اعمال کا ہماری عملی زندگیوں میں واپس آنا جہاں اپنی نجات وفلاح کے لئے ضروری ہے وہاں نسل انسانی کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے بھی ضروری ہے کیونکہ اسی سے وہ ماحول پیدا ہوگا جو نسل انسانی کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے ناگزیر تقاضے کی حیثیت رکھتا ہے، اسلام کے دور اول میں صدیوں تک جو لوگ مسلمان ہوتے رہے ہیں ان میں زیادہ تر لوگ مسلمانوں کے اعمال اخلاق اور دینی ماحول سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے ہیں۔

ایشیا میں اسلام اولیاء کرامؒ کے ذریعہ پھیلا:

جنوبی ایشیا یعنی پاکستان، بنگلہ دیش، بھارت اور اس پورے خطے میں اسلام کا تعارف اگرچہ مجاہدین اور جرنیلوں کے ذریعہ ہوا ہے لیکن اسلام کی دعوت اور کروڑوں لوگوں کے قبول اسلام کی بڑی وجہ حضرات صوفیاء کرام مثلاً حضرت سید علی ہجویریؒ اور حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ جیسے عظیم بزرگوں کی اس خطہ میں آمد ہے جن کے طرز عمل کردار اور تقویٰ و دیانت سے متاثر ہو کر اس پورے خطے کی آبادی کی ایک بڑی تعداد نے اسلام کا کلمہ پڑھا ہے بلکہ اس سے آگے مشرقی ایشیا کی طرف چلے جائیں تو انڈونیشیا، ملائیشیا اور ان ممالک

میں اسلام کے تعارف اور اس کی دعوت کا بڑا ذریعہ مسلمان تاجر بنے ہیں جو تجارت کے لئے ان علاقوں میں گئے اور ان کے عمل و کردار اور دیانت و امانت کو دیکھ کر مقامی آبادی مسلمان ہوتی چلی گئی۔

اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ پوری نسل انسانی کو اسلام کی دعوت دینا ہمارا فریضہ ہے اور اس کے لئے امت مسلمہ کو دین کی طرف واپس لا کر اس دعوتِ اسلام کا ماحول پیدا کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے، کیونکہ جب ہمارے ہاں دین کا ماحول نہیں ہوگا اور دنیا کے لوگ ہمارے اعمال و کردار سے متاثر نہیں ہوں گے اس وقت تک انہیں اسلام کی مؤثر طور پر دعوت دینا مشکل ہوگا چنانچہ دعوت وتبلیغ کے اس عمل کا بنیادی مقصد میرے نزدیک یہی ہے جو آج دنیا بھر میں پھیلتا جا رہا ہے کہ امت کو دین کی طرف واپس لا کر دعوت اسلام کا وہ ماحول پیدا کیا جائے جو پوری نسل انسانی کے لئے نمونہ اور کشش کا باعث بنے۔

اس تمہیدی گزارش کے بعد میں دو باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں ایک اس مجمع میں شریک عام حضرات کیلئے ہے اور دوسری بات علماء کرام کے حوالہ سے عرض کروں گا۔

سب حضرات کے لئے اجتماعی گزارش تو یہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں بحیثیت انسان اپنا مقصد وجود جاننے کی کوشش کرنی چاہیے اس لئے کہ دنیا میں کوئی چیز بھی بے مقصد نہیں ہوتی ہر چیز کا کوئی بنانے والا ہوتا ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی مقصد اور فنکشن ہوتا ہے، ہم جب بھی کوئی نئی چیز دیکھتے ہیں تو دو تین سوال بے ساختہ طور پر ہمارے ذہنوں میں ابھر آتے ہیں ایک یہ کہ یہ چیز کیا ہے؟ دوسرا یہ کہ یہ کس کام اور مقصد کے لئے ہے؟ اور تیسرا یہ کہ اسے کس نے بنایا ہے؟

یہ میرے سامنے مائیک ہے جس کے ذریعہ میں آپ حضرات سے مخاطب ہوں اسے دیکھ کر میرا ذہن یہ جاننے کی کوشش ضرور کرے گا کہ یہ کس چیز سے بنا ہوا ہے، اس کے

پرزے کتنے ہیں، وہ کس طرح کام کرتے ہیں اور اسے کس مقصد کیلئے بنایا گیا ہے، پھر یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ یہ کس نے بنایا ہے، یہ سارے سوالات فطری ہیں ان کیلئے کسی منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں پڑتی اور یہ خودبخود بے ساختہ طور پر ذہن کی سکرین پر ابھر آتے ہیں۔ یہی سوالات ہر ایک کے ذہن میں ماچس کی ایک چھوٹی سی ڈبیہ کے متعلق بھی آتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر میں ماچس کی ایک تیلی کے بارے میں یہ سب کچھ جاننے کی کوشش کرتا ہوں اور اسے ضروری سمجھتا ہوں تو خود اپنے بارے میں ان سوالات کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کرتا؟ ایک انسانی وجود اور ڈھانچہ اس کائنات کی سب سے پیچیدہ مشینری ہے جو صدیوں سے میڈیکل سائنس کا موضوع ہے اور اسے ہزاروں بار چیر پھاڑ کر کے اس کی ہر چیز کا بار بار تجربہ کیا گیا ہے لیکن ابھی تک کوئی شخص یا طبقہ اس دعویٰ کی پوزیشن میں نہیں ہے کہ اس مشینری کو پوری طرح سمجھ لیا گیا ہے اور اب اس کی مزید کسی تحقیق ،تجزیہ کی ضرورت نہیں ہے۔

ظاہر بات ہے کہ اگر جیب میں لگے ہوئے قلم کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے تو خود میرے وجود کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے اور مجھے اپنے آپ کو اور اپنی زندگی کو بامقصد بنانے کے لئے اپنے مقصدِ وجود سے آگاہی حاصل کرنا ہوگی اس کے بغیر میں ایک بامقصد اور کامیاب انسان کے طور پر زندگی بسر نہیں کرسکوں گا۔

مگر صورت حال یہ ہے کہ ہمارے آج کے تمام علوم وفنون مجھے میرے بارے میں ان سوالات کا جواب نہیں دے رہے مثلاً میڈیکل سائنس یہ تو بحث کرتی ہے کہ انسانی باڈی کیا ہے؟ اس کے اعضاء واجزاء کیا ہیں؟ اس کا نیٹ ورک کیا ہے؟ اور اس کا میکنزم کیا ہے؟ ان سوالات پر میڈیکل سائنس نے بہت کام کیا ہے اور بہت سی مفید معلومات فراہم کی ہیں لیکن یہ سوال کہ کائنات کی یہ سب سے پیچیدہ مشینری کس نے بنائی ہے؟ اور کس مقصد کے لئے بنائی ہے؟ ان دونوں سوالوں کو میڈیکل سائنس سرے سے چھیڑتی ہی نہیں کرتی

بلکہ آج ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھائے جانے والے علوم وفنون میں سے کوئی بھی ان سوالات کو اپنا موضوع اور سبجیکٹ قرار نہیں دیتا۔

ان سوالات کا جواب صرف وحی الٰہی سے ملتا ہے، آسمانی تعلیمات سے ملتا ہے اور قرآن وحدیث سے ملتا ہے اس طرح اپنا مقصد وجود معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس آسمانی تعلیمات اور احکام خداوندی کی طرف رجوع کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے اور دعوت کا یہ پہلو بھی بہت زیادہ اہمیت اور توجہ کا حامل ہے کہ نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ دنیا بھر کے انسانوں کو یہ دعوت دی جائے کہ وہ اگر بحیثیت انسان ایک بامقصد اور کامیاب زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو اپنے پیدا کرنے والے کو پہچانیں، اپنے مقصد تخلیق کو جاننے کی کوشش کریں اور یہ وحی الٰہی اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات سے ہی معلوم ہوگا جس کا محفوظ ترین ذخیرہ آج کی دنیا کے پاس صرف قرآن کریم اور نبی اکرم ﷺ کی حدیث وسنت کی صورت میں موجود ہے۔

علماء کرام سے ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں لیکن اس سے قبل ایک واقعہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں، میرا ذوق اور معمول ہے کہ دنیا کے دوسرے مذاہب کے مذہبی راہ نماؤں سے ملاقات کی کوشش کرتا ہوں اور معروضی حالات ومسائل کے حوالہ سے ان سے گفت وشنید کرتا ہوں غالباً 1988ء کی بات ہے کہ امریکہ کے شہر اٹلانٹا میں عیسائیوں کے بیپٹسٹ فرقہ کے ایک مذہبی پیشوا سے میری بات چیت ہوئی، میرے گکھڑ کے ایک دوست افتخار رانا نے جو وہاں مقیم ہیں اس ملاقات کا اہتمام کیا تھا اور وہی درمیان میں ترجمان بھی تھے۔

میں نے پادری صاحب سے سوال کیا کہ آپ کے اردگرد سوسائٹی میں زنا، عریانی اور سودخوری جیسے جرائم کے حوالہ سے جو فضا موجود ہے اس کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر کیا ہے اور آپ اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ سب کچھ غلط ہو رہا

ہے، بائیبل کے احکام کی خلاف ورزی ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات سے بغاوت ہے، میں نے عرض کیا کہ ایک مذہبی راہ نما کے طور پر آپ اس کے بارے میں کیا کر رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ اتوار کو چرچ میں بائیبل کا درس دیتا ہوں اور اس میں لوگوں کو یہ باتیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں، میں نے گزارش کی کہ آپ کے شہر کی آبادی کتنی ہے؟ فرمایا کہ ایک ملین (دس لاکھ) کے لگ بھگ ہوگی میں نے سوال کیا کہ اتوار کے درس میں کتنے لوگ شریک ہوتے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ ڈیڑھ دو سو کے لگ بھگ ہوتے ہیں، میں نے عرض کیا کہ دس لاکھ کی آبادی میں ہفتہ میں ایک بار ڈیڑھ دو سو افراد کو درس دے کر کیا آپ مطمئن ہیں کہ آپ اپنی ذمہ داری پورے طور پر ادا کر رہے ہیں اور کیا آپ قیامت کے دن حضرت مسیح علیہ السلام کے سامنے پیش ہونے پر انہیں اپنے اس عمل سے مطمئن کر سکیں گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں! اس کے بعد اور بہت سی باتیں ہوئیں جن کا تذکرہ یہاں ضروری نہیں ہے لیکن اس سوال و جواب کے حوالہ سے جو بات میں علماء کرام کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہاں سے واپس ہونے کے بعد میرے ذہن میں سوال ابھرا اور آج بھی جب اس واقعہ کا تذکرہ کرتا ہوں تو یہ سوال ذہن میں خود بخود پیدا ہو جاتا ہے کہ پادری صاحب سے تو میں نے یہ ساری باتیں پوچھ لیں لیکن اگر یہی سوالات مجھ سے کئے جائیں تو میرا جواب کیا ہوگا؟ اور کیا میں اپنے ارد گرد سوسائٹی کے عمومی ماحول کو دیکھ کر اپنی کارکردگی پر اپنے ضمیر کو مطمئن پاتا ہوں؟ اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اور جناب نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں پیشی پر ان سوالات کا جواب دے پاؤں گا؟

مجھے اور سب علماء کرام کو اس بات کی فکر کرنی چاہیے، ہمارے ارد گرد جو کچھ ہو رہا ہے اور ہم اپنے محدود دائروں میں جو کچھ کر رہے ہیں اس کا موازنہ کرنا ہم میں سے ہر شخص کی ذمہ داری ہے اور ہمیں اس سے غفلت نہیں برتنی چاہیے۔

اس کے ساتھ ایک بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نجات اور کامیابی دنیا کے ہر مسلمان بلکہ ہر انسان کا مقصد ہے اور ہر شخص اپنے عقیدہ اور سوچ کے مطابق اس کے لئے کوشاں رہتا ہے، اس حوالہ سے دو پہلو ہماری خصوصی توجہ کے مستحق ہیں ایک یہ کہ کامیابی کہتے کس کو ہیں؟ اور دوسرا یہ کہ دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور عذاب و سزا سے بچنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کامیابی اور نجات کا مطلب جنت میں جانا ہے اور جو شخص جنت میں چلا جائے گا وہ کامیاب ہے اس کے ساتھ یہ بات بھی شامل کر لیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر اس مسلمان اور کلمہ گو کے ساتھ جنت کا وعدہ کیا ہے جو شرک سے بچ کر رہے گا بلکہ جناب نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس شخص نے زندگی میں ایک بار بھی کلمہ پڑھا ہے وہ بالآخر جنت میں ضرور جائے گا، اس سے عام ذہن یہ بنتا ہے کہ جنت میں تو بالآخر جانا ہی ہے اس لئے زیادہ مشقت اور محنت کی چنداں ضرورت نہیں ہے، اس مغالطے کو دور کر ہی لیا جائے تو بہتر ہے اس لئے کہ قرآن کریم نے جنت میں داخلہ کو نہیں بلکہ دوزخ سے بچنے کو کامیابی قرار دیا ہے "فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ" (سورۃ آل عمران آیت نمبر 185) جسے آگ سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ کامیاب ہوا۔

اس لئے اصل کامیابی یہ ہے کہ آدمی دوزخ میں جانے سے بچے اور دوزخ میں جائے بغیر سیدھا جنت میں جائے (اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسی طرح لے جائے، آمین) دوزخ میں جا کر اور ہزاروں لاکھوں سال سزا بھگت کر جنت میں گیا تو کیا گیا مسلم شریف کی ایک روایت کے مطابق دوزخ سے ہو کر جنت میں جانے والوں کا تعارف جنت میں بھی دوزخ کے حوالہ سے ہوگا اور انہیں "جہنمیین" کے نام سے پکارا جائے گا اس لئے فوز و فلاح کا یہ قرآنی تصور عام کرنے کی ضرورت ہے کہ اصل کامیابی یہ ہے کہ آدمی دوزخ میں جانے سے محفوظ رہے اور سیدھا جنت میں جائے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ جرائم اور اعمال شر پر گرفت اور سزا و عذاب کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے اللہ پاک جرائم کی سزا دنیا میں بھی دیتے ہیں اور آخرت میں بھی دیتے ہیں مگر دنیا کی سزا اور آخرت کی سزا کے ضابطے مختلف ہیں، انسان کا ذاتی طور پر نیک ہونا اور جرائم سے بچنا آخرت کی سزا سے بچنے کے لئے تو کافی ہے لیکن دنیا کی سزا اور عذاب سے بچنے کے لئے ذاتی نیکی کافی نہیں ہے بلکہ اپنے اردگرد نیکی کا ماحول قائم رکھنا اور سوسائٹی کے دوسرے لوگوں کو گناہ سے روکنے کی کوشش کرنا بھی ضروری ہے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو کیونکہ جب معاشرے میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی عام ہو جائے گی اور کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہوگا تو خدا کا عذاب پھر سب پر یکساں نازل ہوگا، ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے سوال کیا کہ یارسول اللہ کیا اس عمومی عذاب میں نیک اور صالح لوگ بھی ہلاک ہوں گے؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہاں دنیا کے عذاب میں وہ بھی شریک ہوں گے، البتہ آخرت میں سب لوگ اپنے اپنے ایمان اور اعمال پر اٹھائے جائیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ذاتی نیکی اور اعمال آخرت میں تو انسان کی نجات کے لئے کافی ہیں لیکن دنیاوی عذاب سے بچنے کے لئے ان کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کرتے رہنا بھی ضروری ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی مثال یوں سمجھ لیجئے جیسے انسان کے جسم میں قوت مدافعت ہے جو بیماریوں کو روکتی رہتی ہے اگر قوت مدافعت قائم ہے تو انسان بڑی سے بڑی بیماری کا مقابلہ کر لیتا ہے اور قوت مدافعت کمزور پڑ جائے تو معمولی سی بیماری کے سامنے بھی بے بس ہو جاتا ہے، یا یوں سمجھ لیجئے کہ ہر ملک میں ماحولیات کا ایک محکمہ ہوتا ہے کہ جس کے افراد ہوا، پانی زمین، وغیرہ سونگھتے رہتے ہیں اور بتاتے رہتے ہیں کہ کون کون سی بیماریوں کا خطرہ ہے کیونکہ اس خطرے کو دور کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیے؟ اگر خدانخواستہ

کسی شہر میں ماحولیات کے ماہرین ہڑتال کر دیں یا اپنا کام چھوڑ دیں تو چار چھ ماہ کے بعد اس شہر کے لوگوں کا کیا حشر ہوگا؟

اور اگر ان کی غفلت سے کوئی وبا پھوٹ پڑی تو جہاں عام شہری اس کا شکار ہوں گے وہاں وہ ماحولیات والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہیں گے اور ان کی بے پروائی سے پھیلنے والی بیماری ان کے گھروں کو بھی لپیٹ میں لے لے گی۔

بزرگانِ محترم!

دعوت و تبلیغ کے اس عمل و محنت کے ماحول میں دو تین دن گزارنے کی نیت سے یہاں حاضری ہوئی ہے اور اسی کارِ خیر کی اہمیت کے بارے میں کچھ گزارشات آپ حضرات کی خدمت میں پیش کی ہیں، ان میں جو باتیں صحیح ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ ان پر عمل کی ہم سب کو توفیق دیں اور اگر کوئی بات غلط ہوگئی ہے تو اصلاح کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

تدریسی عمل میں استاد کا کردار

> "انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد میں 28 ستمبر 2011ء کو "عمل تدریس میں استاد کا کردار"
> کے موضوع پر ایک علمی مجلس میں گفتگو"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

سب سے پہلے تو آئی پی ایس کا شکریہ ادا کروں گا کہ آج کی اس تقریب میں حاضری کا اور کچھ سننے سنانے کا موقع فراہم کیا۔ اللہ تعالیٰ ہماری حاضری قبول فرمائے، مقصد کی باتیں کہنے اور سننے کی توفیق عطا فرمائے، دین اور حق کی جو بات سمجھ میں آئے اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ اس کے بعد آئی پی ایس کو دو باتوں پر مبارک باد پیش کرنا چاہوں گا۔ ایک تو کام کے تسلسل پر جو ہمارے ہاں عام طور پر نہیں ہوتا، بالخصوص فکری کاموں میں۔ ہمارا جو دائرہ ہے، اس میں فکر سازی اور ذہن سازی کے کام کی حیثیت ثانوی بھی نہیں بلکہ ثالثی درجے میں کہیں ہوتی ہے۔ حالانکہ جو کام فکری ادارے یا تھنک ٹینکس کرتے ہیں، یہ بنیادی کام ہے اور اسی پر قوموں کے مستقبل کے پروگرام استوار ہوتے ہیں۔ یہ تسلسل قابل مبارک باد ہے۔ یہ ایک عرصہ سے لگے ہوئے ہیں اور آگے بڑھ رہے ہیں اور مجھے بھی ایک عرصہ سے ان کے ہاں حاضری کا موقع ملتا رہتا ہے۔ دوسرا اس نئی جگہ پر آنے کی مبارک باد دینا چاہوں گا، اللہ تعالیٰ نے ایک اچھی اور کشادہ جگہ عطا

فرمائی ہے جہاں کام زیادہ وسعت اور زیادہ تنوع کے ساتھ ہوسکتا ہے۔

مجھ سے کہا یہ گیا ہے کہ اپنے تدریسی تجربات، مشاہدات اور تاثرات پیش کروں۔ پہلے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ مجھے بھی ایک چھوٹا سا مدرس ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور میرا تدریسی تجربہ تقریباً 45 سال پر محیط ہے، الحمد للہ۔ چوں کہ میں نے ایک تدریسی گھرانے میں ہوش سنبھالا تھا، اس لیے معلمی میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ میں نے جس گھرانے میں ہوش سنبھالا، میری والدہ صاحبہ خود استانی اور معلمہ تھیں۔ قرآن کریم پڑھاتی تھیں، ترجمہ، حفظ، تفسیر اور اس زمانے میں بہشتی زیور بھی پڑھاتی تھیں اور یہ بھی تحدیث نعمت کے طور پر عرض کروں گا کہ سابق صدر جناب رفیق تارڑ صاحب میری والدہ اور والد محترمؒ کے شاگرد ہیں۔ تدریسی ماحول مجھے گھر سے، ماں کی گود سے ملا ہے۔ والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہی کیا! وہ تو برصغیر کی سطح کے بڑے مدرسین میں سے ہیں۔ ان کا اپنا تدریسی دورانیہ کوئی ساٹھ سال سے زائد رہا ہے، انھوں نے ساٹھ سال دینی علوم کی تدریس کی ہے۔ میرے لیے مشکل بات اس لیے نہیں تھی کہ ماحول ہی وہ تھا، تربیت ہی وہ تھی، ذوق ہی وہ تھا، ہر وقت ارد گرد پڑھنے پڑھانے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔

میں نے تدریسی زندگی کا آغاز طالب علمی کے زمانے ہی میں کر دیا تھا، شاید موقوف علیہ سے بھی پہلے۔ اس زمانے میں درجات کی تقسیم یہ ثالثہ، رابعہ وغیرہ کے عنوان سے نہیں ہوتی تھی۔ موقوف علیہ ہوتا تھا، کافیہ کا سال ہوتا تھا، جامی کا سال ہوتا تھا، اس حوالے سے ہم متعارف ہوتے تھے۔ شاید موقوف علیہ سے بھی پہلے کا سال تھا کہ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے دو تین طلبہ نے مجھ سے کہا کہ آپ ہمیں "مالا بدمنہ" پڑھائیں۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، پڑھا دوں گا۔ تو سب سے پہلی کتاب جو میں نے پڑھائی، وہ ہے "مالا بدمنہ"۔ تین طلبہ تھے اور اسے ہم نے باقاعدہ کلاس کی صورت میں چلایا۔ یہ میری تدریسی زندگی کا آغاز تھا۔ میری

تدریسی زندگی 1970ء میں باقاعدہ شروع ہوئی ہے۔ 1970ء سے 1990ء تک بیس سال میں نے مدرسہ انوارالعلوم گوجرانوالہ میں پڑھایا جو کہ مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے ساتھ گوجرانوالہ کا سب سے قدیمی مدرسہ ہے۔ یہ 1926ء میں قائم ہوا تھا اور میرے والد محترم اور چچا محترم حضرت صوفی صاحب دونوں نے بنیادی تعلیم وہیں حاصل کی۔ یہاں بیس سال مجھے تدریس کا موقع ملا لیکن وہ تدریس ایسی تھی کہ میں ایک طرف تو جمعیۃ علماء اسلام کے سرگرم ترین حضرات میں سے تھا، میری صبح کہیں ہوتی تھی، دوپہر کہیں، شام کہیں اور رات کہیں ہوتی تھی۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ سب سے زیادہ متحرک تھا، لیکن متحرک ترین لوگوں میں سے تھا، الحمد للہ۔ ملک کے بیشتر حصوں میں میرا آنا جانا ہوتا تھا۔ جماعتی سرگرمیاں، سیاسی، تنظیمی سرگرمیاں، معرکہ آرائی، تحریکیں، گرفتاریاں سب کچھ ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ تحریکی اور سیاسی سرگرمیوں کے لحاظ سے یہ میرا کلائمیکس کا دور تھا، یعنی 1970ء سے 1990ء تک۔

اس حوالے سے میں دو تین باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ میرے والد بھی تھے، شیخ بھی تھے، استاد بھی تھے، مربی بھی تھے، سب کچھ وہی تھے۔ ان کے ساتھ حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ میرے چچا تھے، استاد تھے، مربی تھے۔ اس دور میں اتنی متنوع اور وسیع سیاسی سرگرمیاں ہوتی تھیں۔ میرا ذوق شروع ہی سے یہ ہے کہ میں تقریباً تمام مکاتب فکر سے رابطہ رکھتا تھا اور رابطہ رکھتا ہوں، اس درجے کا کہ اگر کبھی ضرورت پڑے تو ہم اکٹھے چل سکیں۔ یہ رابطہ میرا طالب علمی کے زمانے میں تھا کہ کسی دینی تحریک میں ہمیں اکٹھا چلنا پڑے تو حجاب نہ ہو کہ وہ کون ہے، میں کون ہوں؟ اسے آپ میرا ذوق کہہ لیجیے، چالیس پینتالیس سال سے یہ میرا معمول ہے۔

نوجوانوں کی سرپرستی اور رہنمائی:

مجھے یہ خدشہ ہوتا تھا کہ میرے والد محترم جس ماحول کے بزرگ ہیں، شاید میری یہ وسیع سرگرمیاں ان کے لیے قابل قبول نہ ہوں۔ لیکن انہوں نے جماعتی، اتحادی، تحریکی یا

سیاسی سرگرمیوں کے حوالے سے کبھی کچھ نہیں کہا۔ ہاں، البتہ دو باتوں کی مجھ پر ہمیشہ پابندی رکھی اور ان باتوں پر وہ ڈانٹتے بھی تھے۔ ایک انہیں اس بات کی فکر ہوتی تھی کہ اس نے قرآن کریم حفظ کیا ہوا ہے، رمضان میں سنا رہا ہے یا نہیں سنا رہا؟ ماہ رجب میں ہی مجھ سے پوچھنا شروع کر دیتے تھے کہ کہاں سنا رہے ہو، کیا تیاری کر رہے ہو، کتنی منزل پڑھتے ہو؟ رمضان میں بلا کر پوچھتے تھے کہ کتنے پارے ہو گئے، کتنی غلطیاں روز آتی ہیں، سناتے کس کو ہو، دور کس سے کرتے ہو؟ دوسرا ان کا اصرار ہوتا تھا کہ تم جو مرضی کرو، لیکن دو چار کتابیں لازمی پڑھانی ہیں۔ سچی بات ہے کہ پہلے دس سال میں نے مجبوری سے پڑھایا۔ ڈر ہوتا تھا کہ والد صاحب ڈانٹیں گے، پوچھیں گے۔ رمضان کے بعد شوال میں ہی بلا لیا کرتے تھے اور پوچھتے تھے کیا پڑھا رہے ہو، کتنے سبق ہیں، کیا مطالعہ کرتے ہو؟ وہ تو پرانے مدرس تھے، اس لیے سبق کے بارے میں پوچھتے تھے کہ فلاں جگہ کیسے حل کی تھی، فلاں موقع طلبہ کو کیسے سمجھایا تھا؟ الحمد للہ مجھے یہ نگرانی حاصل رہی ہے۔

ذوق پیدا کرنا:

پہلے دس سال تک میں تقریباً یہ سمجھتا رہا کہ میں مجبوراً پڑھا رہا ہوں، لیکن آہستہ آہستہ ذوق بنتا گیا اور الحمد للہ آج یہ ذوق ہے کہ اگر دو چار سبق نہ پڑھاؤں تو دن گزرتا نہیں ہے۔ یہ ان کی مہربانی تھی۔ پہلے پہلے غصہ آتا تھا کہ میں سیاسی لیڈر رہوں، اخبارات میں میرے مضامین چھپتے ہیں اور میرے بیانات آتے ہیں، جبکہ والد صاحب مجھ پر سختی کرتے ہیں کہ تم نے اصول الشاشی ضرور پڑھانی ہے، نور الانوار ضرور پڑھانی ہے اور ہدایہ ضرور پڑھانی ہے۔ میں اپنے مدرس دوستوں سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ والد صاحب کا جبر کہہ لیجیے یا کچھ اور کہ آہستہ آہستہ اپنا ذوق بن گیا کہ میں نے ایک عرصہ اس طرح گزارا کہ دوسری سرگرمیوں کے باوجود تدریس ضرور کی۔ البتہ میں نے ایک سہولت یہ لے رکھی تھی کہ سبق اپنی مرضی کے لیتا تھا، تین یا چار، اور اپنی مرضی کے وقت پر پڑھاتا تھا۔ اپنی سرگرمیوں کے ساتھ مجھے

اسباق کو ایڈجسٹ کرنا ہوتا تھا۔ بیس سال تک میرا یہ معمول رہا ہے کہ جامع مسجد میں فجر کی نماز پڑھاتا تھا (اب بھی پڑھاتا ہوں، درس دیتا ہوں) اور پھر مصلے پر تین چار سبق پڑھاتا تھا اور نماز کے ڈیڑھ گھنٹے دو گھنٹے کے بعد فارغ ہو جاتا تھا۔ پھر میں آزاد ہوتا تھا کہ کبھی مردان جارہا ہوں تو کبھی پشاور۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ساری رات سفر کر کے سحری کے وقت واپس آتا تھا، نماز سے ایک گھنٹہ پہلے مطالعہ کرتا تھا، نماز کے بعد پڑھاتا تھا۔ پھر اگر سونا ہے تو سو گیا، ورنہ بس پر جا کر سوار ہو گیا اور وہیں سو گیا۔ یہ میرا تقریباً بیس سال تک معمول رہا، اس زمانے میں میری نیند اکثر بس میں ہی پوری ہوتی تھی۔

یہاں ایک لطیفے کی بات یاد آ گئی۔ ایک دن حضرت والد صاحب پوچھتے ہیں کہ خدا کے بندے! تم سوتے کہاں ہو؟ آج اخبار میں پڑھتے ہیں کہ کوئٹہ بیٹھا ہوا ہے، کل پڑھتے ہیں کراچی میں ہے، پرسوں پشاور میں ہے، ترسوں میر پور میں ہے، اور سبق بھی پڑھاتے ہو، آخر سوتے کدھر ہو؟ میں نے کہا جی بس سو جاتا ہوں۔ اس زمانے میں میری حالت یہ تھی کہ تین چار گھنٹے بس میں سونا میرے لیے کوئی مشکل بات نہیں تھی، اب بس میں نیند نہیں آتی۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ والد صاحب کے ساتھ گوجرانوالہ سے ایک بارات پر جانا پڑ گیا۔ والد صاحب کے بہت قریبی تعلق والے دوست تھے اور انہوں نے مجبور کیا کہ آپ بیٹے کی بارات پر چلیں۔ چنیوٹ سے آگے لالیاں جانا تھا۔ بڑی ویگن تھی۔ ویگن میں باپ بیٹا دونوں کو ایک ساتھ سیٹ مل گئی۔ میں جب گوجرانوالہ سے نکلا تو مجھے اتنا یاد ہے کہ قلعہ دیدار سنگھ شاید گزرا تھا، اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں کہاں کہاں سے گزرے۔ تقریباً تین گھنٹے کے بعد جب چنیوٹ پہنچے تو ظہر کی نماز کا وقت تھا۔ والد صاحب نے مجھے کندھے سے پکڑ کر کہا کہ "اٹھو! نماز پڑھو۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ کہاں سوتے ہو۔" تو بیس سال میرا یہ معمول تھا اور میرا اختیار ہوتا تھا کہ میں اپنی مرضی کے اسباق لوں گا اور دوسرا یہ کہ وقت میری مرضی کا ہوگا کہ کچھ بھی ہو، صبح کی نماز کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے میں، میں نے سبق پڑھا کر فارغ ہو جانا

ہے، اور الحمد للہ میں نے اس کو نبھایا ہے۔

میرا زیادہ تر تدریسی ذوق تھا فقہ، اصول فقہ، صرف اور ادب کا۔ میرے زیادہ تر اسباق جن کتابوں میں سے ہوتے تھے، ان میں نور الانوار، اصول الشاشی، حسامی، ہدایہ، کنز اور صرف کی کتابیں شامل تھیں اور (عربی ادب کی کتاب) حماسہ تو میری پکی کتاب تھی۔ الحمد للہ آج بھی میرا ذوق یہ ہے کہ والد صاحب کی تربیت اور سختی کی وجہ سے میری دیگر سرگرمیوں کے باوجود پچھلے پورے سال میں میری صرف تین چھٹیاں تھیں، حالانکہ اٹھارہ چھٹیوں کی مدرسے کی طرف سے اجازت ہے۔ مدرسے کے قواعد وضوابط میں ہے کہ اٹھارہ اتفاقی چھٹیاں استاد کا بنیادی حق ہے۔ پچھلے سال میں نے صرف تین استعمال کیں اور اس سال اللہ کرے وہ بھی نہ ہوں۔ تو والد صاحب کا سبق یہ ہوتا تھا کہ بھئی، ناغہ نہیں کرنا۔ وہ تو چھٹی کو گناہِ کبیرہ سے بھی آگے کی کوئی شے سمجھتے تھے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ والد صاحب کی چھٹی ہو۔ سوائے سخت بیماری کے کوئی چھٹی نہیں ہوتی تھی۔ ایک تو میں نے مشاہدات اور تجربات میں حضرت والد صاحب سے سیکھا اور پھر اپنا ذوق بن گیا ہے کہ چھٹی نہ ہو، تن آسانی نہ ہو۔ یہ میری کوشش ہوتی ہے اور میں الحمد للہ کامیاب بھی ہوتا ہوں اس کوشش میں۔ میرا خیال ہے کہ کوشش اور ارادہ ہو تو ہر کام ہو جاتا ہے، جب ارادہ ڈھیلا پڑ جائے تو پھر کچھ بھی نہیں ہوتا۔

یہ تھا میرا تدریسی زندگی کا بیس سال کا معمول۔ پھر اس کے بعد کچھ مسائل اس نوعیت کے پیدا ہو گئے کہ تدریسی عمل میں 1990ء سے 1998ء تک آٹھ سال کا ناغہ پڑ گیا۔ پھر 1998ء میں حضرت صوفی صاحبؒ (چچا محترم) نے فرمایا کہ مدرسہ نصرۃ العلوم میں ایک دو سبق پڑھا دیا کرو تو میں نے وہاں موطا امام مالک اور سنن نسائی پڑھانا شروع کی۔ اس طرح 14 سال مجھے نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں دورۂ حدیث کے اسباق پڑھاتے ہوئے ہو گئے ہیں۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی معذوری کے بعد سے ترجمہ قرآن کریم،

بخاری شریف، طحاوی شریف اور حجۃ اللہ البالغہ کے اسباق میرے پاس ہوتے تھے۔

سبق کے لیے خصوصی تیاری:

اس دوران جو باتیں میں نے محسوس کی ہیں، وہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ والد محترم کو میں نے دیکھا کہ انہوں نے بخاری شریف میرے خیال سے چالیس بار سے زیادہ مرتبہ پڑھائی ہوگی، لیکن اس کے باوجود آخری دور میں بھی ان کو دیکھا ہے کہ رات کو مطالعہ ضرور کرتے تھے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم دو چار مرتبہ پڑھا کر ایک کتاب سے مطمئن ہوجاتے ہیں کہ یار پڑھائی ہوئی ہے، کوئی مسئلہ نہیں، پڑھالیں گے۔ صبح دیکھی جائے گی، کیا ہوتا ہے۔ لیکن والد محترم مطالعہ لازمی کیا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ قرآن کریم کا ترجمہ اور بخاری شریف کا حاشیہ دیکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو مطالعے کی کیا ضرورت ہے؟ کہنے لگے کہ میں اپنا تجربہ بتاتا ہوں کہ جتنی دفعہ دیکھا ہے، کوئی نیا نکتہ سامنے آیا ہے، کوئی نہ کوئی نئی بات ذہن میں آئی ہے۔ الحمد للہ میرا ذوق بھی یہی ہے کہ حتی الوسع ان روایات کو نبھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں عرض کر رہا تھا کہ ایک تو وہ سبق کے ناغے کو گناہ سمجھتے تھے، دوسری بات مطالعے کے بغیر سبق پڑھانے کو بھی وہ تقریباً گناہ ہی سمجھتے تھے۔ اس معاملہ میں جتنا اہتمام میں نے ان کا دیکھا ہے، حیران کن ہے۔

تیسری بات جو ہم نے ان میں دیکھی، وہ ہے وقت کی پابندی۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ چھ بجے کے بجائے چھ بج کر ایک منٹ پر آئیں۔ پانچ بج کر انسٹھ منٹ ہوسکتے ہیں لیکن، چھ بج کر ایک منٹ نہیں ہوسکتا۔ بارہا میں نے تجربہ کیا ہے۔ ہمارے علاقے میں دو آدمیوں کے بارے میں یہ محاورہ مشہور تھا کہ ان کو دیکھ کر لوگ گھڑیاں درست کرتے ہیں۔ ایک مولانا ظفر علی خانؒ جو کہ وزیرآباد کے تھے، ان کی وقت کی پابندی ضرب المثل تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ مولانا ظفر علی خان کی سرگرمیاں دیکھ کر ہم گھڑی درست کرتے ہیں اور کہتے تھے کہ گھڑی غلط ہوسکتی ہے لیکن ظفر علی خان غلط نہیں ہوسکتے۔ اور دوسرے ہیں والد مرحوم۔ جو

وقت کہا ہے، اسی وقت پر پہنچنا ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ خود وقت سے آگے پیچھے ہو جائیں یا کسی اور کو ہونے دیں۔

امانت اور دیانت کی مثال:

میں ان کے تجربات اور اپنے مشاہدات و تاثرات عرض کر رہا ہوں۔ والد صاحب کا ایک معمول اور بھی تھا جو میں اپنے اساتذہ بھائیوں سے ذکر کرنا چاہوں گا۔ پرانے بزرگوں کی جو بات ہم نے دیکھی کہ کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ مدرسے کی کوئی چیز مدرسے کے کام کے علاوہ کہیں اور استعمال ہو سکے۔ تقریباً ربع صدی تک ان کا معمول رہا ہے کہ گکھڑ سے گوجرانوالہ ٹرین یا بس پر آتے تھے۔ ایک میل چلنا، پھر گاڑی میں بیٹھنا، پھر گاڑی سے اتر کر آگے ایک میل پیدل چلنا، تقریباً تیس سال یہ معمول رہا۔ آخری عمر میں مدرسہ والوں نے فیصلہ کیا کہ گاڑی لے لیتے ہیں جو گھر سے لے آیا کرے اور شام کو گھر چھوڑ آیا کرے۔ گکھڑ سے گوجرانوالہ جاتے وقت گاڑی میں جگہ ہوتی تو ہم بھی ساتھ بیٹھ جاتے تھے۔ گاڑی جی ٹی روڈ پر گوندلانوالہ چوک سے گھنٹہ گھر کی طرف مڑ جاتی تھی، جبکہ میرا جی ٹی روڈ پر اس سے اگلا سٹاپ شیرانوالہ باغ ہوتا تھا، چنانچہ وہ مجھے چوک پر ہی اتار دیتے کہ یہاں اتر جاؤ۔ یہ آپ کے ابا کی نہیں، مدرسے کی گاڑی ہے۔ اہلیہ اور بچے ساتھ ہوتے، تب بھی اتار دیتے تھے کہ یہاں سے رکشے میں بیٹھ کر جائیں۔

تدریس میں سادگی اور ترتیب:

ایک بات اور میں نے دیکھی والد صاحب کے طریق تدریس میں۔ والد صاحب سے زیادہ فقہی مباحث کون کرتا ہوگا، اعتقادی مباحث، فقہی مباحث اور شوافع، مالکیہ، حنابلہ اور حنفیہ کی اختلافی بحثیں ان سے زیادہ کون کرتا ہوگا، لیکن ایسا وہ صرف ایک کتاب میں کرتے تھے۔ ساری بحثیں صرف ترمذی میں کرتے اور بخاری شریف اتنی سادہ پڑھاتے تھے کہ

آپ اس سے زیادہ سادگی کا تصور نہیں کر سکتے۔ ترجمۃ الباب، ایک آدھ مسئلہ اور اگر کوئی متعلقہ بات ہو تو کہہ دیتے تھے، ورنہ آگے بڑھ جاتے اور کہتے تھے کہ حدیث کو حدیث کے طور پر پڑھو، بطور خاص بخاری شریف کو، مباحث کسی اور کتاب میں کر لیں۔

ان کا ایک دورانیہ طے ہوتا تھا، پورے سال کا ایک توازن ہوتا تھا، ایک ترتیب اور متعین مقدار کے حساب سے چلتے تھے۔ اور الحمد للہ میرا ذوق بھی کچھ تھوڑا بہت یہی ہے۔ میں تو ویسے بھی جھگڑے والا (یعنی فقہی اختلافی مسائل میں پڑنے والا) آدمی نہیں ہوں، تطبیق و توفیق کی دنیا کا آدمی ہوں، لیکن پھر بھی اختلافی بحثیں ضرورت کے مطابق کرتا ہوں۔ چونکہ بخاری شریف اور طحاوی دونوں میرے پاس ہوتی ہیں، اس لیے جب سال کے شروع میں اسباق کا آغاز ہوتا ہے تو میں طلبہ سے ایک بات کہہ دیا کرتا ہوں کہ جھگڑے سارے طحاوی میں کریں گے اور تسلی سے کریں گے۔ بخاری میں میری جانب سے آپ کو صرف تین باتیں ملیں گی: نفس حدیث، ترجمۃ الباب سے تعلق اور آج کا کوئی مسئلہ اس سے متعلق ہے تو وہ۔ بس اس سے زیادہ آپ کو بخاری میں کچھ نہیں ملے گا۔ یہ بات میں پہلے دن سے ہی بتا دیتا ہوں کہ میری کوشش یہ ہوگی کہ آپ نفس حدیث سمجھ جائیں اور حالات حاضرہ پر اس کی تطبیق سمجھ لیں۔

وقت کی منصوبہ بندی:

ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ ابتدا میں تو سارا وقت لگ جاتا ہے چند ابواب پر، پھر باقی کتاب سے ایسے گزرتے ہیں جیسے گزر رہی گئے ہیں۔ طلبہ کو اکثر ابواب کا نفس مضمون بھی سمجھ میں نہیں آتا اور اب اکثر جگہوں پر یہ عادت سی بن گئی ہے۔ ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ پہلی سہ ماہی تک استاد بھی سمجھتا ہے اور شاگرد بھی، دوسری سہ ماہی میں استاد سمجھتا ہے لیکن شاگرد نہیں سمجھتا، اور ششماہی کے بعد نہ استاد سمجھتا ہے اور نہ شاگرد۔ یعنی نہ استاد کو پتہ ہوتا کہ میں کیا پڑھا رہا ہوں اور نہ شاگرد کو پتہ ہوتا ہے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ والد صاحب اس پر

ناراض ہوتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ غیر ضروری بحث میں نہ پڑیں، نصاب کی کتاب پوری پڑھائیں اور اچھے طریقے سے پڑھائیں۔ بحثیں دوسری کتابوں میں کرلیں، یہاں نفس حدیث پڑھادیں اور اگر کوئی متعلقہ بات ہے تو وہ کردیں۔

دین کا جامع تصور:

ایک طالب علمانہ بات میں کہنا چاہوں گا کہ بخاری شریف کا جو مکمل نام ہے یعنی

''الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و سننہ وایامہ''

اس نام کے پہلے لفظ یعنی ''الجامع'' کا ترجمہ جو ہمارے متقدمین کرتے آئے ہیں، وہ درست ہے کہ یہ تمام علوم کی جامع کتاب ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہی لکھا ہے، لیکن ایک طالب علمانہ ترجمہ میں بھی کیا کرتا ہوں۔ الجامع کا ترجمہ آج کے حوالے سے یہ ہے کہ ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام جامع مذہب ہے، مکمل نظام حیات اور دستورِ زندگی ہے، زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی شعبوں میں رہنمائی کرتا ہے۔

میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ان کو آنکھوں سے دیکھنا ہو تو بخاری شریف کی فہرست پڑھ لیں۔ ایک نظر ڈالنے سے اسلام کی جامعیت آپ کے سامنے آجائے گی۔ ایک دفعہ نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ زندگی کا کون سا مسئلہ ایسا ہے جسے ٹچ نہیں کیا گیا، جس کے بارے میں حدیث یا قرآنی آیت نہ دی ہو۔ معاشرے کی عملی زندگی سے تعلق رکھنے والا کون سا مسئلہ ہے جو اس میں نہیں ہے۔ میں اس ''الجامع'' کا یہ ترجمہ کیا کرتا ہوں کہ اسلام کی جامعیت کا اظہار بخاری شریف میں ہے۔ طلبہ کو بخاری اس انداز سے پڑھانی چاہیے کہ طلبہ کے سامنے کم از کم اسلام کے اجتماعی نظام کا ایک تصور اور خاکہ آجائے اور انہیں معلوم ہو جائے کہ اسلام میں کیا کچھ ہے۔ معاملات اور زندگی کے متعلقہ شعبوں کے ابواب تو ہمارے سامنے سے ایسے ہی گزر جاتے ہیں، حالانکہ میری طالب علمانہ رائے کے مطابق آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم قرآن کریم اور احادیث نبویہ ﷺ کو آج کے عالمی تناظر اور عالمی ماحول

میں ایک سسٹم اور نظام زندگی کے طور پر طلبہ کو پڑھائیں تا کہ آنے والا دور جو کہ فکری لحاظ سے پریشان کن ہے، اس دور میں ہمارے طلبہ اسلام کی صحیح نمائندگی کر سکیں۔

لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو:

ایک اور تجربہ آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں جس کے لیے ایک واقعہ عرض کروں گا جس میں سوچنے کا پہلو ہے۔ ہمارے زمانے میں تحریری امتحان نہیں ہوا کرتا تھا، زبانی امتحان ہوتا تھا۔ 1970ء میں ہمارا بخاری شریف کا امتحان ہو رہا تھا۔ ہمارے ایک بزرگ ہوتے تھے حضرت مولانا بشیر احمد پسروریؒ، بڑے عالم دین تھے، وہ امتحان لینے آئے۔ چودہ طلبہ کی کلاس تھی۔ ان کی ایک بات بہت پسند آئی۔ ہمیں بٹھایا اور کہا کہ فلاں صفحہ کھولیں اور یہ عبارت پڑھیں۔ بلوچستان کے مولانا شمس الدین شہید آپ کے ذہن میں ہوں گے، وہ میرے دورے کے ساتھی تھے۔ انہوں نے ایک حدیث کی عبارت پڑھی۔ پھر مولانا پسروریؒ نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے اس کے مباحث نہیں پوچھوں گا کہ اس میں مسئلہ کیا بیان ہوا ہے اور یہ کہ شوافع وحنابلہ اس مسئلہ پر کیا رائے رکھتے ہیں، اس لیے کہ یہ سب تم نے رٹا ہوا ہے۔ میرا سوال تم سے یہ ہے کہ یہ حدیث آپ کو پنجاب کے دور دراز گاؤں میں ان پڑھ لوگوں کے سامنے بیان کرنی ہے، کیسے کرو گے، ان کو یہ حدیث کیسے سمجھاؤ گے؟ طلبہ میں مجھ سے سینئر لوگ موجود تھے، لیکن وہاں میرا داؤ لگ گیا۔ میں نے کہا، حضرت میں یہ کروں گا۔ پھر میں نے ٹھیٹھ پنجابی میں اس حدیث پر سات منٹ تقریر کی اور اعلیٰ نمبروں کا مستحق ٹھہرا، حالانکہ کلاس میں مجھ سے زیادہ لائق حضرات موجود تھے۔

یعنی یہ بھی ضروریات میں سے ہے کہ دیہاتی اور ان پڑھ لوگوں کے سامنے ان کے لہجے اور ضرورت کے مطابق قرآن وحدیث پہنچانے کا فن آتا ہو، کیونکہ درس گاہ میں کیے جانے والے مباحث میں اور عوام کے سامنے قرآن وحدیث پیش کرنے میں بہت فرق ہے۔ اس پر بھی مجھے ایک لطیفہ کی بات یاد آگئی۔ میرے بزرگ پھوپھی زاد بھائی

تھے، فوت ہو گئے ہیں، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، آمین۔ میں چھوٹا طالب علم تھا، وہ ذرا سینئر تھے۔ وہ کہیں جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دن وہ مجھے ساتھ لے گئے اور جمعہ پڑھانے کے بعد مجھ سے کہتے ہیں کہ میں نے کیسی تقریر کی ہے؟ میں نے کہا، بیڑا غرق کر دیا ہے۔ کہتے ہیں میں ساری رات تقریر رٹتا رہا ہوں اور تم یہ کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا کہ آپ نے یہ کیا ہے کہ کل مولانا قاضی محمد اسلمؒ سے ملا حسن کا جو سبق پڑھا تھا، وہ آج جمعہ کے خطبہ میں دہرا دیا ہے کہ یہ لا بشرط شئی ہے اور یہ بشرط شئی ہے، بشرط لا شئی ہے۔ یہ قضیہ شرطیہ ہے، اور یہ قضیہ سالبہ ہے۔ ان غریبوں کو کیا پتہ کہ قضیہ شرطیہ کیا ہوتا ہے اور بشرط شئی کیا ہوتا ہے؟

ہماری ذمہ داری ہے کہ طلبہ میں یہ ذوق پیدا کریں کہ وہ عام لوگوں سے بھی بات کر سکیں۔ اس کو فریکوینسی سیٹ کرنا کہتے ہیں۔ ہماری آپس کی فریکوینسی تو سیٹ ہوتی ہے، لیکن پبلک کے ساتھ ہماری فریکونسی سیٹ نہیں ہوتی۔ میں اپنا چالیس پینتالیس سال کا تجربہ آپ سے ذکر کرتا ہوں کہ ہم عام لوگوں کے ذہن کے مطابق بات نہیں کرتے جس کی وجہ سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی نمازیوں کے ساتھ، متعلقین کے ساتھ جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان میں سے پچانوے فیصد ایسے ہیں جو فریکوینسی سیٹ نہ ہونے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ ہم کسی اور لہجے میں بات کر رہے ہوتے ہیں اور وہ کسی اور لہجے میں کر رہا ہوتا ہے، جبکہ بات دونوں ٹھیک کر رہے ہوتے ہیں، لیکن ہم باہمی اتفاق نہیں کر پاتے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ بھی استاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شاگردوں اور تلامذہ میں اس بات کا ذوق پیدا کریں کہ وہ عام آدمی سے ان کے لہجے میں بات کر سکیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے الفوز الکبیر میں یہ بحث کی ہے کہ عام انسان سے بات کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے عام انداز استعمال کیا ہے اور عام آدمی کی نفسیات کے مطابق بات کی ہے۔ مکھیوں، مچھروں اور مکڑی کی مثالوں سے بات کی ہے، یعنی عام آدمی کی ذہنی سطح کا لحاظ کر کے بات کی ہے۔ ہمیں بھی عام آدمی کے لیول پر آنا سیکھنا چاہیے اور اپنے شاگردوں کو سکھانا

چاہیے۔ آج کے حالات میں یہ بہت زیادہ ضروری ہے، آج کی صورتحال کیا ہے، میں بطور ایک امام اور مدرس کے بات کر رہا ہوں کہ اس بات کی تبدیلی ہمیں محسوس کرنی چاہیے جو ہم نہیں کر رہے۔

حالات زمانہ سے آگاہی:

آج سے پچاس سال پہلے لوگوں کے لیے دین کی معلومات کا ذریعہ صرف ہم ہوتے تھے۔ جو معلومات ہم نے دے دیں اور جو فیصلہ ہم نے کر دیا، وہی اس فرد کی معلومات اور فیصلہ ہے۔ اب عام آدمی کے پاس ہمارے علاوہ بھی معلومات حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہیں۔ غلط ہیں یا صحیح، میں اس بحث میں نہیں پڑتا۔ جو نوجوان رات کو انٹرنیٹ پر بیٹھتا ہے، وہ صرف ہم پر انحصار نہیں کرتا کہ مولوی صاحب نے کیا بتایا ہے، بلکہ وہ تلاش کرتا ہے کہ متعلقہ آیتیں اور حدیثیں کون کون سی ہیں۔ آج اور آج سے چالیس پچاس سال پہلے کے عام آدمی میں جو فرق ہے، اسے نظر انداز نہ کیجیے۔ پہلے عام آدمی کے پاس دین کی معلومات کے لیے واحد ذریعہ ہم تھے، اب صورت حال یہ ہے کہ اس کے پاس ہمارے علاوہ بھی معلومات حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہیں، اخبارات ہیں، میگزین ہیں، ٹی وی چینل ہیں، انٹرنیٹ ہے۔ تو جب وہ ہم سے بات کرتا ہے تو وہ صرف ہماری معلومات پر بنیاد رکھ کر بات نہیں کرتا بلکہ وسیع معلومات کی بنیاد پر سوال کرتا ہے، اس لیے جب ہم اسے محدود دائرے میں رہ کر جواب دیتے ہیں تو اسے وہ جواب مطمئن نہیں کر پاتا۔

یہ تبدیلی ہمیں محسوس کرنی چاہیے۔ رات کو اس نے چینل دیکھا، پروگرام میں کسی دانشور نے کوئی بات کر دی تو اس نے آ کر مجھ سے پوچھنا ہے کہ مولوی صاحب، فلاں نے یہ بات کہی تھی۔ اس پر میرا رویہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو میں ڈانٹ دیتا ہوں کہ فضول پروگرام مت دیکھا کرو۔ اب وہ میرے کہنے سے تو باز نہیں آئے گا، دوسری رات وہ دو پروگرام مزید دیکھے گا اور پھر مجھ سے کوئی مسئلہ پوچھنے آ جائے گا۔ اب جبکہ میرے پاس اس حوالے سے معلومات مکمل نہیں تو

میں یہ کہنا توہین سمجھتا ہوں کہ بیٹا، کل میں تیاری کر کے بتاؤں گا۔ میں اسے ادھورا سا جواب دوں گا اور ساتھ ڈانٹ دوں گا، بہر صورت وہ کنفیوژ ہوگا۔ اس کا نتیجہ جو نکلے گا، وہ میرے نزدیک آج کے دور کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور وہ یہ کہ مولوی کا علمی مقام اور اس کی دینی ثقاہت سوسائٹی میں مجروح ہوگی اور ہو رہی ہے۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کو تو دین کا کچھ پتہ نہیں ہے اور یہی حال عام معلومات کا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بطور خطیب یا مدرس ہمیں اپنا جنرل نالج اور عمومی مطالعہ اس قدر بڑھانا ہوگا کہ ہم تمام متعلقہ معلومات کا احاطہ کر کے بات کو صحیح تناظر میں پہچان سکیں۔ ہمیں اس قابل ہونا چاہیے کہ کلاس میں طلبہ کو بتا سکیں کہ یہ صورت حال آج یوں ہے، کل یوں تھی، حالات میں یا مسئلہ میں یہ تبدیلی واقع ہوئی ہے تاکہ انہیں یہ معلوم کرنے کے لیے کسی اور کے پاس نہ جانا پڑے۔ طالب علم کو وہ بتائیں جو اس کی ضرورت ہے، لیکن خود اپنے مطالعے میں وسعت اور تنوع پیدا کرنا ہماری ذمہ داری ہے، ورنہ ہم نہ طالب علم کو مطمئن کر پائیں گے اور نہ بطور خطیب اپنے سننے والے کو۔ اور اگر ہم مطمئن نہ کر پائے تو ہماری ثقاہت مجروح ہوگی اور اگر یہ مجروح ہوگی تو دین کو نقصان ہوگا۔

نئی نسل کی تیاری:

اور آخر میں ایک بات کہہ کر اپنی بات ختم کروں گا۔ میں جب اپنی برادری (اساتذہ) سے بات کرتا ہوں تو دیوان حماسہ کا ایک شعر ضرور سنایا کرتا ہوں۔ دیوان حماسہ میں ایک شاعر کا ذکر ہے کہ وہ جوان ہوا، قبیلے والوں نے کھلایا پلایا، لیکن لڑنا نہیں سکھایا۔ دشمن داری تھی، لڑائی ہوئی تو مار کھائی۔ اس پر اب وہ قبیلے والوں کو کوس رہا ہے۔ کہتا ہے۔

فهلا أعدونی لمثلی تفاقدوا
إذ الخصم أبزی مائل الرأس أنکب
وهلا أعدونی لمثلی تفاقدوا
وفی الأرض مبثوث شجاع وعقرب

اپنے قبیلے کو کوس رہا ہے کہ جب ان کو پتہ تھا کہ میری دشمن داری بڑے متکبر آدمی سے ہے تو انہوں نے مجھے تربیت کیوں نہیں دی؟ جب انہیں پتہ تھا کہ زمین پر بچھو اور سانپ بکھرے پڑے ہیں تو مجھے بتایا کیوں نہیں، ان سے نمٹنے کا طریقہ کیوں نہیں سکھایا؟

اس میں اساتذہ کے لیے پیغام ہے کہ آج دنیا میں نظریاتی، ثقافتی، علمی اور فکری لحاظ سے شکوک وشبہات کا جو جنگل آباد ہے اور فکری انتشار، تہذیبی خلفشار اور ثقافتی یلغار کا جو دائرہ پھیل رہا ہے، اس سے اپنے طالب علم کو آگاہ کرنا، اس کو مستقبل کے خطرات سے نمٹنے کے لیے تیار کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ اگر میں بحیثیت استاد آج کے علمی ماحول اور اس کے خطرات کو محسوس نہیں کروں گا اور اپنے طلبہ کو مدرسہ سے باہر جانے کے بعد جو صورت حال پیش آئے گی، اس سے آگاہ نہیں کروں گا تو وہ پھر میرے بارے میں یہی شعر دہرائے گا اور اسی لہجے میں مجھے کوسے گا۔

بس یہی میرا پیغام ہے اپنے لیے بھی، آپ کے لیے بھی۔ دنیا کے حالات کو محسوس کریں، علمی، فکری، ایمانی اور تہذیبی دنیا میں مستقبل کے خطرات کو محسوس کریں اور اپنے طلبہ کو اپنے نصاب کے دائرے میں ان سے آگاہ کریں۔ استاد سب کچھ کر لیتا ہے، استاد کے لیے کتاب نہیں بلکہ اس کا ذوق اہم ہے۔ کوئی بھی کتاب ہو، استاد کا فہم اصل اہمیت رکھتا ہے۔ اس بات کو سامنے رکھیں کہ آج ہماری ذمہ داری کیا ہے اور ہمارے زیر تعلیم جو پود ہے، اس کو مستقبل میں کیا صورت حال پیش آنے والی ہے، اس کے لیے میں نے انہیں کیسے تیار کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اسلام اور مغربی نظام تعلیم میں فرق

"دار العلوم اسلامیہ، کامران بلاک، لاہور میں تعلیم کے موضوع پر منعقدہ سیمینار سے خطاب"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْن

امابعد!

حضرت مولانا قاری احمد میاں صاحب تھانوی دامت برکاتہم کا شکر گزار ہوں اور دار العلوم الاسلامیہ کی انتظامیہ کا کہ آج کی اس تقریب میں آپ حضرات کے ساتھ ملاقات اور کچھ کہنے سننے کا موقع فراہم کیا۔ مختلف موضوعات پر مجھ سے پہلے کافی ساتھیوں نے بات کی ہے اور بات کریں گے جبکہ ڈاکٹر محمود غازی صاحب تفصیلی گفتگو فرمائیں گے۔

مجھے یہ موضوع گفتگو کے لئے دیا گیا ہے کہ "اسلام اور مغرب کے نظام تعلیم میں فرق" میں ایک بات کی پہلے وضاحت کر دوں کہ کوئی بھاری بھرکم مقالہ پیش نہیں کر سکوں گا اور نہ ہی بھاری بھرکم تحقیق کا اہل ہوں اور نہ آپ مجھے اس کا اہل سمجھیں۔ میں تو صرف رننگ کمنٹری (Running Commentry) کا آدمی ہوں۔ پریکٹیکل مسائل پر کمنٹری کرتا ہوں کہ یہ مسئلہ ہے اور یہ صورتِ حال ہے۔ میرا طرز رننگ کمنٹری کا ہے۔ آج تعلیم کے میدان میں اسلام اور مغرب کے درمیان میں ایک تو ہے نظام کی کشمکش۔ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ تعلیم کے مقاصد کیا ہیں۔ تعلیم میں کیا ہونا چاہیے کیا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک مستقل کشمکش ہے۔ ہم سے ان کے تقاضے کیا ہیں۔ ہم ان کے کون سے تقاضوں سے مطابقت کر رہے

ہیں۔ اور کس سے نہیں کر رہے ہیں۔ یہ الگ موضوع ہے۔ میں ایک سرسری سا عمومی منظر کہ اسلامی نظام تعلیم میں اور مغرب کے تعلیمی نظام میں جو عمومی فرق ہے، اس طرز کی دو چار باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

اسلامی نظام تعلیم اور مغرب کے نظامِ تعلیم میں فرق:

اسلام کے نظام تعلیم اور مغرب کے نظام تعلیم میں فرق کے حوالے سے ایک مغالطے کا پہلے مرحلے پہ ازالہ ضروری ہے۔ اسلامی نظام تعلیم سے مراد مسلم ممالک کا نظام تعلیم نہیں بلکہ اسلامی نظام تعلیم سے مراد ہمارا دینی نظام تعلیم ہے جس کو ہم اسلامی طرز کے طور پر چلا رہے ہیں۔ اس کو سامنے رکھ کر میں تین چار گزارشات پیش کروں گا۔ تعلیم کی اور تعلیم کے نصاب و نظام کی بنیاد ہوتی ہے عقیدہ پر، کسی بھی قوم کا تعلیمی سسٹم اس کے عقیدے پر ہوتا ہے۔ ہماری بنیاد بھی ہمارے عقیدے پر ہے کیونکہ اصل عقیدہ ہے اور عقیدے کے جو تقاضے ہیں، اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ عقیدے میں بنیادی بات جس کا سمجھنا ہمارے لیے ضروری ہے کہ مغرب اور ہمارے نظام تعلیم کا بنیادی فرق، وہ عقیدے کا فرق ہے۔

مغرب کی سوچ کا دائرہ:

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ کائنات کیا ہے اور انسان کیا ہے۔ مغرب کی سوچ کیا ہے اور ہماری سوچ کیا ہے۔ یہ کائنات کیا ہے؟ انسان کیا ہے؟ ہم انسان ہیں اس حوالے سے سوچیں۔ مغرب کے پورے نظام تعلیم کی بنیاد اس انسان کے حوالے سے اور کائنات کے حوالے سے اب تک جو ہے، اس کا دائرہ ایک سوال کے گرد گھومتا ہے۔ یہ کائنات کیا ہے؟ یہ انسان کیا ہے؟ سائنسی تحقیقات ان کا ارتقا جو کچھ ہو رہا ہے، کائنات میں ادھر ادھر جا کر ہم پتہ چلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ چاند پر کیا ہے، مریخ پر کیا ہے، خلا میں کیا ہے؟ پوری سائنس کا موضوع یہ ہے اور اس میں سے بھی میڈکل سائنس انسان کے وجود

پر بحث کرتی ہے اور اس کا موضوع انسانی جسم ہے کہ یہ کیا ہے؟ یہ معلوم کرنے کی کوشش کہ کائنات کیا ہے اور انسان کیا ہے؟ مغرب کے جتنے بھی سائنسی علوم ہیں، ان سب کا فوکس ایک سوال پر ہے۔

مثلاً میڈکل سائنس ہے۔ سر سے لے کر پاؤں تک انسانی ڈھانچہ سے بحث کرتی ہے۔ سر کے بال بھی، ہڈیاں بھی، ناک، کان، جو کچھ بھی انسان میں ہے۔ یہ پانچ ساڑھے پانچ فٹ کے وجود میں اور دو اڑھائی من کی لاش میں جو کچھ بھی ہے، میڈکل سائنس اس سے بحث کرتی ہے۔ اس میں ہے کیا؟ اس کا نیٹ ورک کیا ہے؟ اس کا میکنزم کیا ہے؟ اس کی صحت اور سکون کا مدار کیا ہے؟ کیسے صحیح چلتا ہے اور کیسے خراب ہوتا ہے۔ یہ موضوع ہے میڈیکل سائنس کا۔ سائنس ہزاروں سال سے لگی ہوئی ہے اور یہ بات میں درمیان میں عرض کرنا چاہوں گا کہ ابھی تک میڈیکل سائنس انسان کے اس وجود کے بارے میں کسی حتمی فیصلے تک نہیں پہنچی اور نہ ہی پہنچنے کا امکان ہے اور پتہ نہیں انسان کے اس وجود کے اندر اللہ تعالیٰ نے کیا کیا چھپا رکھا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اگر اس کو قرآن مجید کی اس آیت کریمہ کے حوالے سے دیکھیں ''وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا'' تو یہ کائنات کے حوالے سے تو ہے ہی، ہمارے اس وجود کے بارے میں بھی ہے۔ ہم ابھی تک اپنے وجود کے اندر کی چیزوں کو شمار نہیں کر سکے۔ کوئی نہ کوئی چیز ہر پانچ یا دس سال بعد سامنے آجاتی ہے۔ لیکن میں اس طرف نہیں جا رہا۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ میڈیکل سائنس انسانی وجود سے بحث کرتی ہے اور اس کا سوال یہ ہے کہ انسان کیا ہے اور کیسے کام کرتا ہے؟ عمومی سائنس کائنات پر غور کرتی ہے اور مشاہدات کرتی ہے کہ یہ کیا ہے اور کیسے ورک کرتی ہے؟ لیکن یہ کیوں ہے؟ یہ سائنس کے موضوع سے خارج ہے۔ سورج میں کیا ہے اور کیسے کام کر رہا ہے اور سورج کیوں ہے اور کائنات کیوں ہے؟ یہ کس نے بنائی ہے، کیوں بنائی ہے؟ انسان کیوں ہے؟ یہ کیوں کا سوال سائنس کے دائرہ کار سے باہر ہے۔

کیوں پر بحث کرتا ہے مذہب۔ کیوں پر بحث کرتی ہے وحی۔ "کیوں" پر بحث کرتا ہے قرآن مجید۔ "کیوں" پر بحث کرتی ہیں احادیث نبویہ۔ ہمیں کیا سے انکار نہیں ہے۔ میں نے سائنس دانوں سے بار بار کہا کہ ہمیں کیا سے انکار نہیں، ہمیں کیوں سے واسطہ ہے۔ انسان کیوں ہے اور کائنات کیوں ہے۔ اللہ تعالیٰ بار بار قرآن پاک میں فرماتے ہیں "مَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا، مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ" ہمارا ایک مقصد ہے، ہمارا ایک پروگرام ہے۔ قرآن پاک ہمیں بتاتا ہے کہ کائنات بنانے والی ایک ذات ہے۔ اس کا ایک مقصد ہے۔ اس نے مقصد دیا ہے، اس نے لمٹ بھی بتائی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ عارضی ہے اور اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ ہوگا۔ میں اشارۃً عرض کروں گا۔ مثلاً انسان کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا اور پہلے دن پہلے ہی جوڑے سے ایک بات صاف کہہ دی۔ آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو زمین پر اتارا اور ایک بات بڑی واضح کہہ دی۔ "وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلٰى حِيْنٍ" ایک وقت کے لیے زمین پر جا رہے ہو، مستقر بھی ہے متاع بھی ہے، لیکن ایک وقت تک ہے، مستقل قیام گاہ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہی کہ "اِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" "وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ" اس دنیا میں جتنا عرصہ رہو گے، تو ڈائریکشنز میری طرف سے آئیں گی۔ ہدایت میں دوں گا، بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔ اس ہدایت کی پیروی کرو گے تو واپس گھر آؤ گے، ورنہ دوسرے گھر (جہنم) میں جاؤ گے۔ انسان کا ایک مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک مقصد دیا ہے۔

مغرب کے نزدیک نہ کائنات کا مقصد ہے نہ انسان کا:

تو پہلی بنیادی بات یہ ہے کہ مغرب کے نزدیک نہ کائنات کا کوئی مقصد ہے اور نہ ہی انسان کا کوئی مقصد ہے۔ چونکہ وہ بھی ایک حادثے کا نتیجہ ہے اور یہ بھی ایک حادثے

کا نتیجہ ہے اور مغرب کے نزدیک کائنات کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ ہی کوئی پروگرام ہے، بس وقت گزارنا ہے، مجبوری ہے۔ جب وقت گزارنا ہے تو اچھے طریقے سے گزار لیں۔ اس لیے ان کی تعلیم کی بنیاد بھی اسی دائرہ پر ہے۔ ہمارے ہاں کائنات کا ایک مقصد ہے، انسان کا بھی ایک مقصد ہے، اس لیے ہماری تعلیم اس رخ پر ہوگی کہ ہم ان مقاصد کی تکمیل میں کیا کر سکتے ہیں۔

مغرب کے نزدیک علم کا ماخذ اور ہمارے نزدیک ماخذ اور ہے:

دوسری بات تعلیم اور علم سے متعلق ہے کہ علم کا ماخذ کیا ہے، علم کا سرچشمہ کیا ہے؟ اس میں بھی جھگڑا ہے ہمارا۔ مغرب کے نزدیک علم کا ماخذ انسانی محسوسات، مشاہدات اور تجربات ہیں۔ مغرب کے نزدیک جو چیز انسان کے محسوسات، تجربات اور مشاہدات کے دائرے میں ہے، وہ علم ہے۔ ہمارے نزدیک علم کا ماخذ یہ نہیں ہے۔ علم کا ماخذ اللہ تعالیٰ کی وحی ہے۔ ہمارے نزدیک علم کا ماخذ خارجی اور مغرب کے نزدیک داخلی ہے، جو کچھ تجربات اور مشاہدات سے حاصل کیا گیا، وہ علم ہے۔ ہمارے نزدیک جو پہلا سبق تھا، وہ بھی اسی پر مبنی ہے۔ ''وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا'' سب سے پہلے انسان کو سب سے پہلی تعلیم اللہ نے یہ دی ہے۔ میں صرف اس نکتہ پر بات کر رہا ہوں کہ ہماری تعلیم کا آغاز اپنے مشاہدات اور محسوسات پر مبنی نہیں ہے، بلکہ تعلیم دینے والے کی تعلیم پر ہے۔ یہ دوسرا بنیادی فرق ہے مغرب کے فلسفہ تعلیم اور ہمارے فلسفہ تعلیم میں۔ ہمارے ہاں علم کا اصل سرچشمہ وحی خداوندی ہے۔ ہمارا جو سب سے پہلا سبق ہے، وہ بھی یہی ہے کہ ''اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ○ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ ○'' ہمارا پہلا سبق یہی کہتا ہے کہ یہ تعلیم اوپر سے آتی ہے۔ یہ داخلی مشاہدات، تجربات اور کیفیات کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ یہ معاون ہیں۔ اصل تعلیم اوپر سے آتی ہے۔ یہ ہمارے نظام تعلیم اور مغرب کے نظام تعلیم میں دوسرا فرق ہے جو میں عرض کرنا چاہوں گا۔

مغرب کا موجودہ نظام تعلیم اور انقلاب فرانس سے پہلے کا نظام بالکل جدا:

تیسری بات یہ کہ مغرب کا جو موجودہ نظام تعلیم ہے اور انقلاب فرانس سے پہلے مغرب کا جو نظام تعلیم تھا، بالکل ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں۔ یہ فرق کیوں آیا ہے؟ مغرب اس مقام پر کیسے پہنچا ہے؟ یہ ایک مستقل موضوع اور گفتگو ہے، لیکن میں اشارہ کر رہا ہوں۔ مغرب کے موجودہ نظام تعلیم سے پہلے یعنی انقلاب فرانس سے پہلے جسے تقریباً دو سو سال ہو گئے ہیں، 1790ء کے لگ بھگ کا معاملہ ہے۔

پرانے نظام تعلیم کی ایک جھلک:

میں یہ بات اس لیے چھیڑ رہا ہوں کہ میں نے مغرب کے پرانے نظام تعلیم کی ایک جھلک اپنی آنکھوں سے آج اس دور میں دیکھی ہے۔ مغرب کا نظام تعلیم بھی یہی تھا۔ ہمارا تو دائرہ وسیع ہے۔ ان کا اتنا محدود تھا کہ واقعتاً اس کے خلاف بغاوت ہونی چاہیے تھی۔ امریکہ کا ایک علاقہ ہے آمشوں کا۔ یہ پورا علاقہ ایک خطہ ہے جو آج بھی پرانے ماحول میں پرانی تعلیم کے ساتھ پرانے سسٹم اور ثقافت کے ساتھ موجود ہے۔ وہ لوگ نہ بجلی استعمال کرتے ہیں، نہ گاڑی استعمال کرتے ہیں، نہ ان کے ہاں کوئی جدید اسکول ہیں، نہ زراعت کے لیے کوئی جدید مشین استعمال کرتے ہیں۔ ہل کے ساتھ کھیتی باڑی کرتے ہیں، کنوئیں سے ہینڈ پمپ کے ساتھ پانی نکالتے ہیں اور اپنے گوبر کے گھریلو پلانٹ بنائے ہوئے ہیں جس سے بلب روشن کرتے ہیں۔ آمشوں کا پورا علاقہ ہے جسے گزشتہ سال مجھے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہاں تانگے چلتے ہیں، گھوڑا گاڑیاں چلتی ہیں۔ دوست مجھے یہ پرانا سسٹم دکھانے لے گئے۔ وہ لوگ کوئی بات قبول نہیں کرتے، بالکل ڈٹے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں نہ بجلی لیں گے، نہ ٹیلی فون لیں گے، نہ گاڑی استعمال کریں گے۔ اس ماحول میں تقریباً تین اچھے خاصے گاؤں تو میں نے وہاں دیکھے ہیں۔

ایک صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا آپ کا تعلیمی سسٹم کیا ہے۔ انہوں نے کہا بس پرائمری تعلیم ہے جس میں ہم بائبل پڑھاتے ہیں اور لکھنا پڑھنا سکھاتے ہیں۔ اس کے بعد لڑکی کے لیے تو تعلیم بند ہے۔ لڑکا اگر میٹرک کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔ اس میں بھی زیادہ تعلیم مذہبی ہے۔ جدید سائنسی علوم ہم نہیں پڑھاتے۔ یہ آج کے امریکہ میں آمشوں کا علاقہ ہے۔ اس میں پرانی رسومات ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ نے ہمیں دکھلانے کے لیے اسے محفوظ رکھا ہے۔ میں تفصیلات میں جائے بغیر عرض کرنا چاہوں گا کہ مغرب کے پرانے نظام تعلیم اور موجودہ نظام تعلیم میں اتنا تفاوت کیوں ہے؟

یہ فرق کیوں ہے؟

ہمیں اس کے اسباب پر غور کرنا چاہیے۔ یہ بغاوت کیوں ہوئی؟ بغاوت اس لیے ہوئی ہے کہ مغرب میں انقلاب فرانس سے پہلے بادشاہی نظام تھا، جاگیردارانہ سسٹم تھا اور پاپائے روم بھی مظالم کے حوالے سے بادشاہ کا ساتھی تھا، جاگیردار تھا۔ وہاں فتوے لگے ہیں۔ سائنسی انکشافات پر ارتداد کے فتوے لگے اور موت کی سزائیں بھی دی گئی ہیں۔ آکسفورڈ میں آج بھی وہ جگہیں موجود ہیں جہاں پادری صاحب بیٹھتے تھے۔ سامنے سائنس دان پیش ہوتا تو پوچھا جاتا کہ تو کہتا کیا ہے؟ سائنس دان کہتا کہ زمین گھومتی ہے تو کہتا کہ گھما لو۔ پندرہ منٹ میں وہ گھما دیا جاتا۔ وہ مظاہر آج بھی موجود ہیں جہاں نشان لگائے ہوئے ہیں کہ یہاں عدالت لگتی تھی، اتنے لوگ مارے گئے ہیں۔ گلیلیو کو جو سزا دی گئی تھی، اس کے تقریباً تین سو سال بعد پاپائے روم نے معافی مانگی ہے۔ وہ بادشاہ، پادری اور جاگیردار کی جو تکون تھی، اس تکون کے خلاف بغاوت ہوئی ہے اور اس بغاوت میں جہاں بادشاہ اور جاگیردار صاحب گئے، وہاں پوپ صاحب بھی چلے گئے۔

فرق کی ایک وجہ مذہب کا غلط استعمال تھا:

میں اساتذہ کرام سے عرض کروں گا کہ مغرب کی مذہبی بیزاری کے اسباب ضرور پڑھیں۔ آج آپ اگر مغرب کے کسی دانشور سے مذہب کی بات کرتے ہیں تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ کیا وہ دور واپس آ رہا ہے؟ یہ بلاوجہ نہیں ہے۔ ان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے کہ وہ دور دوبارہ واپس آ رہا ہے۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ یہ مذہب کا غلط استعمال تھا۔ مجھ سے ایک صاحب نے بات کی کہ مولوی صاحب، تمہاری بھی یہی صورتحال ہے۔ میں نے کہا، نہیں۔ غلط مشابہت مت دو۔ میں نے کہا کہ تین فرق ہیں۔ تمہارے ہاں پاپائے روم شخصی اتھارٹی ہے۔ پاپائے روم کہہ دیں یا امام معصوم کہہ دیں۔ ہمارے ہاں پیغمبر کے بعد کوئی شخصی اتھارٹی نہیں ہے۔ ہم تو جس امام کی تقلید کرتے ہیں، اس کے بارے میں بھی کہتے ہیں یخطیٔ ویصیب۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو سب سے پہلے خلیفہ بنے، انہوں نے پہلے خطبے میں ہی کہہ دیا کہ میں صحیح بھی کر سکتا ہوں، غلطی بھی کر سکتا ہوں۔ صحیح کروں تو ساتھ دو، غلطی کروں تو ٹوک دو۔ میں نے کہا کہ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں کوئی شخصی اتھارٹی نہیں ہے، سوائے پیغمبر کے۔

دوسری وجہ مغرب کا مذہب سائنس مخالف تھا، ہمارا نہیں:

دوسری بات یہ ہے کہ ہم سائنس کے مخالف نہیں ہیں۔ مغرب کا مذہب سائنس کے مخالف تھا۔ سائنسی انکشافات پر سائنسی تحقیقات پر ہم تو سائنس کے شکر گزار ہیں کہ ہماری ہر بات کی تائید کرتی چلی جا رہی ہے۔ ہمارا اختلاف سائنس سے نہیں بلکہ فلسفے سے ہے۔ جو ہم نے کہا تھا، سائنس کہہ رہی ہے کہ یہ بھی ٹھیک ہے اور یہ بھی ٹھیک ہے اور جو رہ گئی ہیں، ان کی تائید کرے گی۔ مغرب کا مذہبی رہنما سائنس کے مقابلے میں کھڑا ہو گیا تھا۔ سائنس کو خدا دشمنی قرار دیا تھا۔ ہم تو مخالفت نہیں کر رہے۔ ہم تو سائنس کی تائید کر رہے ہیں کہ اور آگے بڑھو، کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری جو باتیں لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں، سائنس خود سمجھا لے گی۔

سائنس ہماری تائید کرتی ہے:

ہمارے ہاں ایک مشہور بحث ہے وزن اعمال کی جس پر پوری تقریر ہوتی ہے کہ اعراض تلتے ہیں یا نہیں تلتے؟ سائنس نے اعراض کو تول کر ہماری بات کی تائید کر دی ہے۔ یہ میں نے ایک چھوٹی سی مثال دی ہے۔

تیسرا فرق مغرب کا ''سسٹم'' بادشاہ اور جاگیردار کے ساتھ تھا ہمارے ہاں نہیں:

تیسرا فرق مغرب کے اس مذہبی جمود اور ہم میں یہ ہے کہ مغرب کے پوپ اور پاپائے روم کا جو سسٹم تھا، وہ بادشاہ اور جاگیردار کا ساتھی تھا اور ہمارے ہاں مولوی ہمیشہ عوام کے ساتھ رہا ہے۔ مولوی بحیثیت طبقہ کے عوام کے ساتھ رہا ہے، عوام کے دکھ درد کا ساتھی رہا ہے۔ ہم نے شروع سے لے کر اب تک عوام کی بات کی ہے، عوام کے لیے جیلیں کاٹی ہیں اور عوام کے لیے تحریکیں چلائی ہیں۔ ہمارے علما اور صوفیا کے طبقے نے بادشاہ اور عوام کی جنگ میں، ظالم اور مظلوم کی جنگ میں ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دیا ہے۔ اگر دیکھنا ہو تو مولانا ابو الحسن علی ندویؒ المعروف حضرت مولانا علی میاں کی ''تاریخ دعوت وعزیمت'' دیکھیں، پوری تفصیل سامنے آجائے گی۔

تو یہ بات میں نے عرض کی کہ مغرب کے نظام میں جو بغاوت ہوئی ہے، وہ اس وجہ سے ہوئی ہے لیکن آج وہ مذہب کے بالکل باغی ہیں۔ مغرب کے ہاں آسمانی تعلیمات کا، وحی کا، بائبل کا، انبیائے کرام کا تعلیم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ درمیان میں ایک بات یاد آگئی۔ خاکوں کا جو مسئلہ چلا تھا، اس خاکے کے چھاپنے والے صحافی نے اپنی تائید میں ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ اس میں ایک بات اس نے کہی کہ ہم تو اپنے معاملات میں خدا، بائبل اور عیسیٰ کا کہیں حوالہ نہیں دیتے اور مسلمانوں نے اب تک یہ تینوں حوالے سر پر مسلط کیے ہوئے ہیں۔ یہ بات درست ہے۔ مسلمان جتنا بھی گیا گزرا ہے، لیکن اس کے حوالے یہی

ہیں۔ مسلمانوں کے حوالے آج بھی خدا، رسول اور قرآن ہیں اور یہ تینوں حوالے آج بھی قائم ہیں اور اتنی مضبوطی سے قائم ہیں کہ میں اکثر یہ بات عرض کیا کرتا ہوں کہ بش کو بھی اگر ہم سے بات کرنی پڑتی ہے تو کوئی نہ کوئی حدیث تلاش کرنی پڑتی ہے۔ اوباما بھی جب ہمارے اجتماع میں آتا ہے تو اسے بھی کوئی نہ کوئی آیت تلاش کرنا پڑتی ہے کہ تمہارے قرآن میں یہ بات ہے۔ یہ بھی ایک فرق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بھی ایک فرق ہے کہ ہم نے تینوں حوالے چھوڑ دیے اور مسلمانوں نے ابھی تک سر پر مسلط رکھے ہوئے ہیں اور اس کا جواب میں نے بھی لکھا لیکن اس کا اپنا میدان ہے، ہمارا اپنا میدان ہے۔ میں نے کہا کہ بھئی! بات یہ ہے کہ ہم پر رعب کیا جماتے ہو۔ تمہارے پاس تھا کیا جو تم نے چھوڑا؟ بائبل کہاں ہے؟

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

ایک بہت بڑا فرق:

کہاں ہے انجیل اور زبور؟ کہاں ہے تورات؟ دنیا کا کوئی یہودی تورات کے کسی نسخے پر ہاتھ رکھ کر یہ کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتا کہ یہ وہی تورات ہے جو موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔ دنیا کا کوئی عیسائی انجیل پر ہاتھ رکھ کر یہ کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتا کہ یہ وہی نسخہ ہے جو عیسیٰؑ پر نازل ہوا تھا لیکن دنیا کا ہر مسلمان قرآن کے کسی بھی نسخے پر ہاتھ رکھ کر پورے اعتماد سے یہ کہے گا کہ یہ وہی قرآن مجید ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔

بہرحال میں نے یہ عرض کیا کہ مغرب کے نظام تعلیم اور ہمارے نظام تعلیم میں ایک فرق یہ ہے کہ مغرب کے نظام تعلیم اور فلسفے کی بنیاد انسانی مشاہدات، احساسات اور تجربات پر ہے، اور ہماری اصل بنیاد کس پر ہے؟

”وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ، وَعَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ“

تیسری بات بڑا عجیب سا مسئلہ ہے کہ ہمارے نظام تعلیم میں ایک اور بات بھی شامل ہے۔

غیبی مخلوق سے تعلق:

ہمارے نزدیک ہم جس دنیا میں رہتے ہیں، اس میں اور بھی مخلوقات ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتیں۔ ابھی دو ہفتے ہوئے، ایک برطانوی سائنسدان کا ایک اخباری بیان روزنامہ ایکسپریس نے چھاپا۔ اس نے کہا کہ کچھ غیبی مخلوقات ہمارے ارد گرد محسوس کی گئی ہیں۔ میں انسانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ اگر کسی سے کوئی رابطہ کرے تو اسے معلومات نہ دے۔ کہیں وہ ہمارے سسٹم سے واقف نہ ہو جائیں اور ہمیں نقصان نہ پہنچائیں۔ معلومات لے کر وہ ہمارے سسٹم میں مداخلت کریں گے۔ ہمارا سسٹم کہیں جام نہ کر دیں، خراب ہو جائے گا۔ یہ برطانوی سائنسدان کا بیان ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں تو غیبی مخلوق سے تعلق ولادت سے پہلے ہی ہو جاتا ہے۔ جب ماں کے پیٹ میں روح کا کنکشن ملتا ہے تو اس سے پہلے ایک فائل بنتی ہے۔ وہ فائل غیبی مخلوقات ہی بناتی ہیں۔ ما عملہ، ما رزقہ، ما اجلہ، شقی ام سعید؟ پہلے فائل بنتی ہے، پھر کنکشن ملتا ہے۔ ہمارا غیبی مخلوقات سے تعلق پہلے ہوتا ہے اور دنیا میں بعد میں آتے ہیں۔ ہماری فائل ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے، ہم نے ان کو کیا معلومات دینی ہیں! یہ ساری بات طے ہو جاتی ہیں کہ اس کا عمل کیا ہوگا، اس کا رزق کتنا ہوگا اور اس کی عمر کتنی ہوگی۔ یہ کس کیٹگری میں ہوگا، شقی ہوگا یا سعید ہوگا۔ کیا کرے گا۔ یہ ساری فائل پہلے بن جاتی ہے۔ ایک غیبی مخلوق کا نمائندہ ہمارے ساتھ مقرر ہوتا ہے اور ساری فائل مکمل کر کے پھر کہا جاتا ہے کہ ٹھیک ہے، کنکشن دے دو اور پھر وہ ساتھ ساتھ ہی رہتا ہے۔

انسان کے ساتھ کتنے فرشتے رہتے ہیں؟

کتنے فرشتے رہتے ہیں ہمارے ساتھ؟ مختلف احادیث کی روشنی میں ایک دن بیٹھ کر میں سوچ رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ایک انسان کے ساتھ کم از کم سات آٹھ تو ہوں گے۔ دو کراماً کاتبین ہیں، ایک وہ فائل والا، کچھ محافظین ہیں اور وہ بھی ہیں جو نیک مجلس ہو تو اوپر سے گھیرے میں لے لیتے ہیں۔ پر بچھانے والے الگ ہیں اور گھیرا ڈالنے والے

الگ۔ اور آنے جانے والے، صبح اور عصر کی نماز میں حاضری لینے والے الگ ہیں۔ ہماری تو بہت محدود تعداد ہے۔ سارا کنٹرول غیبی مخلوق کے ہاتھ میں ہے، ہمارا تو سارا نظام ان کے ہاتھ میں ہے۔

یہ بات بھی میں عرض کرنا چاہوں گا کہ مغرب کے نزدیک ساری تعلیم کا دائرہ کار ایک فرد اور سوسائٹی کی حیثیت سے انسان تک محدود ہے، لیکن ہمارے ہاں دوسری مخلوقات کے ساتھ روابط بھی ہماری تعلیم کا حصہ ہیں۔ شیطان سے معاملات کیا ہیں؟ فرشتوں سے معاملات کیا ہیں؟ قرآن مجید بھرا پڑا ہے کہ شیاطین سے ہمارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ ہمارا دائرہ تعلیم صرف اپنی سوسائٹی تک محدود نہیں، دوسری سوسائٹیاں بھی شامل ہیں۔ فرشتوں کی سوسائٹی بھی شامل ہیں، جنوں کی سوسائٹی بھی شامل ہے۔

دینی تعلیم کیوں ضروری ہے؟

ایک بات اور اسی ضمن میں یہ ہے جس کے متعلق عام طور پر سوال بھی ہوتا ہے کہ دینی مدارس جو تعلیم دیتے ہیں اور پڑھاتے ہیں، اس کا فیوچر اور انسانی سوسائٹی سے کیا تعلق ہے، سوسائٹی کے پریکٹیکل معاملات سے کیا تعلق ہے؟ زندگی کے معاملات سے کیا تعلق ہے؟ یہ ایک عام سا سوال ہے تعلیم یافتہ لوگوں میں، ایسا سوال ہے کہ ذہن بھی اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ پریکٹیکل اور عملی زندگی سے اس کا کیا تعلق ہے۔ ایک جگہ سوال ہوا تو میں نے کہا کہ بات سنو، زندگی کس کا نام ہے؟ زندگی یہی 50 سال کا نام ہے یا اس سے آگے بھی زندگی ہے؟ مغرب کے نزدیک زندگی اسی کا نام ہے۔ مغرب کے نزدیک زندگی اس دنیا کے 70,60,50 سال کا نام ہے، اس کے بعد زندگی کا کوئی مرحلہ نہیں ہے۔ وہی جو مشرکین مکہ کہتے تھے کہ: ءَاِذَا کُنَّا عِظَاماً وَّرُفَاتاًءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ، ءَاِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ؟ کون نکالے گا؟ کیا ہو گا؟ لیکن ہمارے نزدیک تو یہ زندگی کا بہت چھوٹا مرحلہ ہے، اتنا چھوٹا مرحلہ کہ اللہ تعالیٰ خود کہتے ہیں کہ کل تم خود کھڑے ہو گے اور کہو گے ”کَاَنَّھُمْ یَوْمَ یَرَوْنَھَا لَمْ یَلْبَثُوْا اِلاَّ

عَشِيَّةً أَوْ ضُحٰهَا'' خود تم فیصلہ نہیں کر سکو گے کہ تم دن کا پہلا پہر رہ کر آئے ہو یا دوسرا۔

ہماری تعلیم اور مغرب کی تعلیم کا مقصد:

ہماری تعلیم اور مقاصد میں صرف دنیا کی زندگی نہیں ہے، قبر کی زندگی بھی ہے، حشر کی زندگی بھی ہے اور اس سے آگے کی غیر محدود زندگی بھی ہے۔ مغرب کے تعلیمی مقاصد میں یہ ہے کہ فرد اور سوسائٹی کی حیثیت سے یہ دنیا کے جو چند دن ملے ہیں، یہ کیسے گزارنے ہیں اور کیسے باعزت چلے جانا ہے۔ ہمارے نزدیک صرف دنیا کی زندگی مقصد نہیں ہے، اس کے ساتھ ساتھ قبر، حشر، جنت اور اس سے اگلے مراحل بھی ہمارے نظام تعلیم کے مقاصد میں سے ہیں بلکہ وہ اصل ہے اور یہ اس کی فرع ہے۔ یہ چھوٹا سا عرصہ ہے، اصل تو وہ ہے۔ تو مغرب بات کرتا ہے دنیا کی زندگی کے حوالے سے اور ہمارا نظام قبر، حشر، جنت، دوزخ اور تمام معاملات میں عمومی تناظر سے بات کر کے انسانی نجات اور فلاح کے حوالے سے بحث کرتا ہے۔ یہ مغرب اور ہمارے تعلیمی فلسفے اور تعلیمی مقاصد میں تین واضح فرق ہیں جو ظاہر اور واضح نظر آ رہے ہیں۔

ایک بات اور عرض کروں گا۔ مغرب کے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان سوسائٹی میں اپنی حیثیت پہچانے اور سوسائٹی کی بہتری کے لیے کام کرے۔ اپنے آپ کو پہچانے، سوسائٹی کو پہچانے اور جو اس کی ضروریات ہیں، ان کو پورا کرے۔ ہمارے ہاں تعلیم کے مقاصد میں سب سے پہلے تو معرفت خداوندی ہے کہ ہمارا بنانے والا کون ہے۔ تعلیم کا مقصد ہے خدا کی پہچان اور پھر اپنی پہچان کہ ہم کون ہیں۔ پھر اس کے بعد سوسائٹی کیا ہے اور اس کے مقاصد اور اس کے کیا فوائد ہیں۔ معرفت خدا اور معرفت نفس ہماری تعلیم کا اصل بنیادی مقصد ہے اور مغرب میں اس کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ خدا ہے، تب بھی ٹھیک ہے۔ خدا نہیں ہے، تب بھی ٹھیک ہے۔ خدا پر کوئی ایمان رکھتا ہے، تب بھی ٹھیک ہے۔ نہیں رکھتا، تب بھی ٹھیک ہے۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ نظام تعلیم کی بنیاد ہوتی ہے عقیدے

پر۔ مغرب کے عقیدے میں دنیا ہی سب کچھ ہے۔ خدا کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ غیب کی مخلوق کا ہونا نہ ہونا کوئی ضروری نہیں ہے۔ انسان اور سوسائٹی اس کا دائرہ ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ ساری باتیں تعلیم کے فلسفے اور تعلیم کے دائرے میں شامل ہیں۔

مغربی نظام تعلیم کے نتائج:

اس کے بعد میں اس طرف آنا چاہوں گا کہ مغرب اور مغربی دنیا نے ہمیں جو نظام تعلیم دیا ہے، اس کے ثمرات اور نتائج کیا ہیں۔ دنیا کو اس کے نتائج کیا بھگتنے پڑ رہے ہیں اور اس کا حل کیا ہے؟ ہمارا نظام تعلیم اس میں کیا رول ادا کر سکتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے آپ کو یاد ہوگا یہاں پروٹسٹنٹ مسیحی فرقے کے سربراہ آرچ بشپ ڈاکٹر روون ولیمز اسلام آباد آئے تھے اور مکالمہ ہوا تھا۔ بین المذاہب مکالمہ اس کا موضوع تھا۔

مکالمہ میں شرکت کے لئے میرے تحفظات

1) اس موضوع کے متعلق ایک بات ہے جو میں عرض کرنا چاہوں گا۔ مجھ سے بالواسطہ پوچھا گیا کہ اسلام آباد کے مذاکرے کے لیے بلایا جائے تو آپ آئیں گے؟ میں نے کہا کہ میرے دو تحفظات ہیں۔ اگر وہ دور ہو جائیں تو میں آؤں گا۔ پہلی بات یہ ہے کہ مکالمہ میں ایک طرف ہیں پروٹسٹنٹ فرقہ کے مذہبی پیشوا جو پوری دنیا کے پروٹسٹنٹ فرقے کی نمائندگی کر رہے ہیں اور دوسری طرف سے اس وقت کے وزیر اعظم پاکستان جناب شوکت عزیز ہیں۔ یہ کس کی نمائندگی کر رہے ہیں؟ یہ اہل سنت کی نمائندگی کر رہے ہیں؟ خوارج کی کر رہے ہیں؟ معتزلہ کی کر رہے ہیں؟ شیعہ کی کر رہے ہیں؟ کس کی کر رہے ہیں؟ مکالمہ اصل فریقوں میں ہونا چاہیے۔ مکالمہ ہو تو آرچ بشپ اور شیخ الازہر یا امام کعبہ یا دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کے درمیان ہو یا پاکستان کے دارالعلوم کراچی کے بڑے عالم ہوں یا کم از کم ہمارے تبلیغی بزرگ حاجی عبدالوہاب صاحب کے درمیان ہو۔

اہل مذہب کی نمائندگی یہ لوگ کرتے ہیں۔ایک ادارے کی یہ کرتے ہیں اور ایک ادارے کی وہ کرتے ہیں۔

2) میرا دوسرا تحفظ یہ ہے کہ ایجنڈا ایک طرفہ ہے۔ یہ ون وے ایجنڈا ہے۔مغرب ہم سے مکالمہ کرنا چاہ رہا ہے اس ایجنڈے پر کہ مذہب کا غلط استعمال ہو رہا ہے۔مغرب کو مصیبت پڑی ہوئی ہے کہ مذہب کے نام پر اس کے بقول دہشت گردی ہو رہی ہے۔ یہ ہو رہا ہے، وہ ہو رہا ہے، سب کچھ مذہب کے نام پر ہو رہا ہے۔مذہب کے نام پر لوگ تلوار اٹھائے ہوئے ہیں اور مار رہے ہیں۔مغرب کی پریشانی یہ ہے۔اس وقت وہ ہم سے یہی بات کر رہا ہے کہ مذہب کا غلط استعمال روکو، مذہب کا غلط استعمال ہو رہا ہے۔ ہم بیٹھ کر بات کرنے کے لیے تیار ہیں، مگر مغرب کا ایجنڈا یہ ون وے ہے۔ہمارے پرانے مناظروں میں جب مناظرین مناظرہ کرتے تھے تو ایک اصول تھا کہ ایک موضوع آپ کا اور ایک میرا۔ دو مناظر آپس میں طے کرتے تھے کہ ایک موضوع ادھر کا اور ایک موضوع ادھر کا۔ یہ دونوں اپنے موضوع کو طے کر لیتے تھے۔میں نے کہا کہ ہم دنیا کے کسی بھی فورم پر اس مسئلے پر کہ مذہب کا غلط استعمال کہاں ہو رہا ہے، بڑے کھلے دل سے بات کرنے کو تیار ہیں، لیکن اس میں ہمارا بھی موضوع ہونا چاہیے کہ مذہب کے سوسائٹی سے لاتعلقی کے نتائج دنیا کو کیا بھگتنا پڑ رہے ہیں۔ ہم تمہارے موضوع پر بات کرتے ہیں کہ مذہب کا کہاں غلط استعمال ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے، کیسے ہو رہا ہے اور اس کو کنٹرول کرنے کے ذرائع کیا ہیں۔آپ ہمارا موضوع شامل کریں کہ مذہب کے سوسائٹی سے لاتعلقی کے ثمرات دنیا کو کیا بھگتنا پڑ رہے ہیں اور کیا نقصانات دنیا نے اٹھائے ہیں۔ یہ موضوع آپ شامل کر لیں۔ ایک موضوع پر آپ بات کریں گے اور ایک موضوع پر ہم بات کریں گے۔بیٹھ کر مکالمہ کر لیتے ہیں۔

مغرب نے مذہب اور وحی کو جو ترک کیا ہے آج مغرب اس پر پریشان ہے، مغرب

کا دانشور آج خود اس بات پر پریشان ہے کہ ہم نے جو اس وجدانیات (وحی) کو چھوڑ دیا ہے۔ وجدانیات (وحی) کو چھوڑ کر ہم نے فائدہ اٹھایا ہے یا نقصان پہنچایا ہے اس کے اندر مغرب کے دانشوروں کی بحث جاری ہے۔ اس پر دو تین تازہ شواہد پیش کرتا ہوں۔

پادری سے ملاقات:

یہ ایک لمبی بحث ہے۔ ایک مکالمہ عرض کروں گا کہ مذہب کو ترک کرنے اور وجدانیات (وحی) سے دستبردار ہونے سے تعلیم سے اور علم سے مذہب کو الگ کرنے کے نقصانات کیا ہوئے ہیں۔ برطانیہ میں ایک شہر ہے نوٹنگھم۔ وہاں میں اکثر جاتا رہتا ہوں۔ وہاں ہمارا مدرسہ ہے جامعہ الہدیٰ۔ میری بھانجی بھی وہاں پڑھاتی رہی ہے۔ ایک دن میں نے اس کے پرنسپل مولانا رضاء الحق صاحب سے کہا کہ میری کسی اچھے پادری سے ملاقات کروائیں۔ میری ایک عادت ہے کہ جہاں جاتا ہوں، وہاں کے مذہبی رہنماؤں سے کچھ نہ کچھ گپ شپ کرتا ہوں۔ عیسائی ہوں، ہندو ہوں، یہودی ہوں، سکھ ہوں، کوئی بھی ہوں، یہ میرا موضوع ہے۔ میں نے کہا کہ کوئی سمجھ دار پادری ہو تو اس سے میری ملاقات کراؤ۔ انہوں نے ایک پادری صاحب سے وقت لے لیا کہ ہمارے مولوی صاحب آئے ہوئے ہیں، آپ سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ انگریزی مجھے نہیں آتی۔ نہ لکھ سکتا ہوں، نہ پڑھ سکتا ہوں، نہ بول سکتا ہوں۔ ترجمان سے کام چلاتا ہوں۔ ایک نومسلم بزرگ ہیں برطانیہ میں، حاجی عبد الرحمن، بہت اچھی اردو جانتے ہیں۔ انھیں ہم نے ترجمان بنالیا۔ پادری صاحب سے ملاقات ہوئی، میں نے ان سے ایک سوال کیا۔ میں نے کہا یہ فرمائیے کہ آپ کی سوسائٹی زنا، عریانی اور سود، ان تین حوالوں سے جس مقام پر پہنچی ہوئی ہے، اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ بحیثیت مذہبی راہنما کے یا پادری کے، زنا، سود اور عریانی کے حوالے سے آپ کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یہ مذہب سے بغاوت ہے، بائبل سے بغاوت ہے اور غلط ہو رہا ہے جو کچھ ہو رہا ہے۔ میں نے دوسرا سوال کیا کہ اس کو

کوئی بریک لگ سکتی ہے؟ یہ جو سوسائٹی دوڑی چلی جارہی ہے اس طرف، اس کو کہیں بریک لگائی جاسکتی ہے؟ اس نے کہا، نہیں کوئی بریک نہیں۔ تیسرا سوال میں نے یہ کیا کہ اس کا حل کیا ہے؟ بحیثیت مذہبی راہنما آپ کے نزدیک اس کا کیا حل ہے؟ انگریزی میں جو الفاظ ہوں گے، وہ پتہ نہیں کیا ہیں، لیکن ان کے الفاظ کا ترجمہ جو حاجی عبدالرحمن صاحب نے کیا، وہ آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ اس مسئلے کا حل ہمارے پاس نہیں ہے، ہم تو آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اس لیے کہ اس سے سوسائٹی کو بچانے اور اس عذاب سے نجات حاصل کرنے کے لیے جس نور کی ضرورت ہے، وہ ہمیں آپ لوگوں کی آنکھوں میں نظر آرہا ہے۔

مغرب نظام تعلیم سے وحی کو نکال کر پریشان ہے:

میں عرض کررہا ہوں کہ مغرب نے اپنے نظام تعلیم اور تعلیم کے دائرے سے وحی کو اور آسمانی تعلیمات کو نکالا جس کے اثرات مغرب پر یہ ہیں کہ مغرب کے دانشور خود پریشان ہیں۔ مغرب کے کسی سنجیدہ دانشور سے بات کر کے دیکھیے۔ وہ پریشان ہیں۔ میں حوالہ دینا چاہوں گا شہزادہ چارلس کا جو برطانوی شہزادہ ہے۔ بادشاہ بننا تو اس غریب کے مقدر میں نہیں ہے۔ اس نے آج سے کوئی بارہ سال پہلے آکسفورڈ میں کچھ لیکچر دیے تھے جو بہت مشہور ہوئے۔ یہ لیکچر بی بی سی نے بھی نشر کیے اور کتابی شکل میں بھی شاید موجود ہوں۔ ایک لیکچر کا اردو ترجمہ ہم نے بھی الشریعہ میں چھاپا۔ اس وقت مغربی دنیا میں وجدانیات کا سب سے بڑا مبلغ چارلس ہے۔ وجدانیات سے مراد وحی ہے۔ ہماری اصطلاح وحی ہے اور ان کی اپنی اصطلاح ہے۔ ذرا ہلکی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تاکہ لوگ ڈر نہ جائیں۔

اس نے کہا کہ ہم نے وجدانیات سے انحراف کر کے انسانی سوسائٹی کو تباہی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی آپشن نہیں ہے کہ ہم وجدانیات کی طرف واپس جائیں۔ یہ اس مقالے کا خلاصہ ہے۔ اور آج کی تازہ بات بھی عرض کردوں۔ اسی تناظر میں

آج کا نوائے وقت اخبار پڑھیں۔ نیویارک میں ایک تین روزہ کانفرنس چل رہی ہے۔ اس میں شہزادہ چارلس نے کہا ہے کہ اگر ہم دنیا کو ماحولیات کے حوالے سے ایک بڑی تباہی سے محفوظ کرنا چاہتے ہیں تو قرآن پاک پر عمل کیے بغیر کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ دنیا کو اگر بڑی تباہی سے بچانا ہے تو قرآن مجید کے احکام وقوانین پر عمل کرنا ہوگا، ماحولیات کے حوالے سے، کیونکہ یہ بات ماحولیات کے حوالے سے ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر روون ولیمز کا حوالہ:

ایک حوالہ اور دینا چاہوں گا کہ مغرب نے اپنی زندگی سے، عقیدے سے، تعلیم سے جو مذہب اور وحی اور وجدانیات کو خارج کیا، اس کے ثمرات مغرب فیملی سسٹم کی تباہی کی صورت میں بھی بھگت رہا ہے۔ یہی ڈاکٹر روون ولیمز جو پاکستان تشریف لائے تھے، پروٹسٹنٹ فرقے کے عالمی سربراہ، انہوں نے لندن میں ایک لیکچر میں یہ کہا کہ برطانیہ میں جو مسلمان رہتے ہیں، ان کا حق ہے کہ ان کے نکاح، وراثت، طلاق اور مالیات کے تنازعات کے فیصلے ان کی شریعت کے مطابق ہوں۔ ان کا حق ہے کہ حلال حرام کے مسائل، نکاح، طلاق اور وراثت کے مسائل ان کی شریعت کے مطابق حل ہوں اور اس کے لیے یہاں ان کو شرعی عدالتیں فراہم کی جائیں۔ یہ آج سے تین سال پہلے انھوں نے کہا تھا کہ برطانیہ کے عدالتی سسٹم کو اپنے اندر یہ گنجائش پیدا کرنی چاہیے کہ مسلمانوں کی شرعی عدالتیں یہ فیصلے کریں۔ اس وقت برطانیہ کے وزیر اعظم گورڈن براؤن تھے۔ اس پر خاصا طوفان کھڑا ہوا۔ وزیر اعظم کے ترجمان نے کہا کہ ہم یہ نہیں کر سکتے، مسلمانوں کے عائلی قوانین جو ہیں، وہ انسانی حقوق کے منافی ہیں۔ اس پر پادریوں کی کونسل میں ڈاکٹر روون ولیمز کو بلایا گیا کہ وہ اپنی پوزیشن واضح کریں۔ پادریوں کی کونسل میں کھڑے ہو کر اس نے کہا کہ میں اپنی پوزیشن پر قائم ہوں۔ انھوں نے کہا کہ میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ مسلمانوں کے فیملی لاز انسانی حقوق کے منافی ہیں۔ وہ ہمارے سسٹم کے خلاف ہیں اور دنیا کے سارے ملکوں

کے لیے ہمارے سسٹم کا پابند ہونا ضروری بھی نہیں۔ایک خاص جملہ جس کی طرف میں توجہ دلا رہا ہوں، یہ کہ انھوں نے کہا کہ اس وقت دنیا میں جتنے بھی خاندانی قوانین ہیں، ان میں سے سب سے بہتر اسلام کے قوانین ہیں۔

ہیلری کلنٹن کا حوالہ:

ایک اور واقعہ ریکارڈ پر ہے۔ہمارے پاکستان کا قصہ ہے۔ہیلری کلنٹن اس وقت وزیر خارجہ ہیں اور کسی زمانے میں خاتون اول ہوا کرتی تھیں۔اس زمانے میں کلنٹن صاحب صدر تھے۔اس وقت وہ خاتون اول کی حیثیت سے اسلام آباد آئی تھیں اور انھوں نے اسلام آباد میں بچیوں کے اسکول کا وزٹ کیا اور ایف اے اور بی اے کی ایک طالبہ سے پوچھا کہ تمہیں اسکول میں کیا الجھن ہے اور کیا مسائل درپیش ہیں؟اس بچی نے جواب دیا کہ ہم پڑھتی تو ہیں لیکن اچھے اسٹینڈرڈ کی لائبریریاں اور لیبارٹریاں میسر نہیں جس کی وجہ سے ہم ریسرچ اور تحقیق نہیں کرسکتیں۔وسائل درکار ہیں۔اس لڑکی نے ہیلری کلنٹن سے پوچھا کہ آپ کے ہاں کالج کی لڑکی کا مسئلہ کیا ہے؟انھوں نے کہا کہ ہمارے ہاں کالج میں لڑکی کا مسئلہ یہ ہے کہ کالج پہنچتے پہنچتے گود میں بچہ ہوتا ہے۔اس کو پتہ نہیں کہ بچے کو پالنا کس نے ہے۔بچے کو پالے یا پڑھے،کیا کرے۔پھر انھوں نے کہا کہ یہاں مسلمانوں کا اور ایشیائی لوگوں کا خاندانی نظام دیکھ کر مجھے رشک آتا ہے۔ایک لڑکی کے گرد محافظوں کا حصار ہے۔بھائی ہے،باپ ہے،چچا ہے،ماموں ہے،یہ سارے اس کے محافظ ہیں۔مجھے یہ دیکھ کر رشک آتا ہے کہ بچی کس طرح حفاظت میں آگے بڑھتی ہے۔

اوپر کی سطح کے سکالرون کا معیار:

تو میں نے عرض کیا ہے کہ مغرب کے تعلیمی مقاصد اور دائرہ کار میں اور ہمارے مقاصد اور دائرہ کار میں کیا فرق ہے۔اثرات اور ثمرات کے اعتبار سے بھی دیکھ لیں۔مغرب کے

نظام تعلیم کے اثرات کیا ہیں اور ہمارے نظام تعلیم کے اثرات کیا ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھ لیں کہ آج جو مغرب کی اعلیٰ دانش گاہوں میں واپسی کی باتیں سوچی جا رہی ہیں، اس کا منظر کیا ہے۔ اوپر کی سطح کے اسکالروں کا معیار، امریکہ کی ایک بڑی یونیورسٹی ہارورڈ یونیورسٹی میں شعبہ قانون کے سربراہ ہیں ڈاکٹر فلڈمین جن کا خاص موضوع شریعت اسلامی ہے۔ میں آپ سے عرض کروں کہ یہ اوپر کے جو اسکالر ہیں، ان کی تحقیق کا معیار کیا ہے۔ ان کا لیول دیکھیں ذرا۔ ہمارے لیے اچھی باتیں سننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ گزشتہ سال میں ہارورڈ یونیورسٹی گیا تو وہاں ایک مسئلہ زیر بحث تھا کہ ملائشیا کے خلاباز اوپر خلا میں جا رہے تھے تو انہوں نے کہا کہ وہاں تو کشش ثقل نہیں ہے، نہ سجدہ ہو سکتا ہے نہ رکوع ہو سکتا ہے، نہ وضو ہو سکتا ہے تو کیا کریں؟ انٹرنیٹ پہ سوال ڈالا گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ اس سوال کا سب سے پہلا جواب ہارورڈ یونیورسٹی کے یہودی پروفیسر نے البحر الرائق کے حوالے سے دیا کہ تمہاری فقہ کی رو سے معذور کی جو نماز ہے، وہی تمہاری نماز ہے۔ ہارورڈ میں ایک مسجد میں، میں نے درس دیا تو مجھ سے مولوی صاحب پوچھنے لگے کہ یہ جواب جو اس نے دیا ہے، ٹھیک ہے؟ میں نے کہا کہ ٹھیک کہا ہے اس نے کہ جو معذور کی نماز تمہارے فقہا نے لکھی ہے، وہی ہے کہ جس حال میں جیسے پڑھ سکو، پڑھو۔

تو میں ڈاکٹر فلڈمین کی بات کر رہا تھا کہ وہ شریعت پر کام کر رہا ہے۔ نیویارک ٹائمز کا مستقل کالم نگار ہے۔ Why Sharia? کے نام سے اس نے ایک سیریز لکھی اور تین یا چار قسطوں میں اس کا وہ مضمون چھپا۔ اس میں شریعت اسلامی کی افادیت اور اس کے ثمرات پہ اس نے بحث کی ہے۔ بس ایک بات نقل کرتا ہوں۔ اس نے کہا کہ مغربی دنیا جو شریعت اسلامی کے نفاذ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے اور مخالفت کر رہی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شریعت کے احکام اور قوانین میں کوئی کمزوری ہے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ شریعت کو روک کر یہ اپنے قوانین کی کمزوری پر پردہ ڈالنا چاہ رہے ہیں، کیونکہ شریعت

جس دن اصل شکل میں آ گئی، پھر ان کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔

میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ مغرب کے نظامِ تعلیم اور اسلامی نظامِ تعلیم کی بنیاد، اس کی فلاسفی، اس کے دائرہ کار، اس کے مقاصد اور اس کے نتائج اور ثمرات میں کیا فرق ہے۔ یہ فرق میں نے دلائل اور تحقیقاتی حوالوں کے بجائے مشاہدات کی بنیاد پر عرض کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ تبصرے کے انداز میں جو معروضی حقائق ہیں، جو معروضی صورت حال ہے، اس کے حوالے سے میں نے چند باتیں عرض کی ہیں۔ اسی کو آگے بڑھاتے ہوئے چند باتیں اور عرض کرنا چاہوں گا۔

مغرب کے پاس کیا ہے اور ہمارے پاس کیا ہے؟

اس فرق کو اس حوالے سے بھی دیکھ لیجیے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی ایک کتاب میں اس مسئلے پر بحث کی ہے کہ دنیا میں تاثر یہ ہے کہ مغرب ہی ہمیں سب کچھ دیتا ہے۔ ہم مغرب کو کچھ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اور اس نے مرعوبیت پیدا کر رکھی ہے۔ دنیا کے اسباب، ظاہری ترقی، دولت پیسہ، ظاہری وسائل مغرب کے پاس ہیں۔ یہ اس کا اپنا ہے یا ہمارے اسباب پر قبضہ کیا ہوا ہے، یہ بحث علیحدہ ہے۔ یہ علم کے حوالے سے بھی ہے، سائنس کے حوالے سے بھی ہے، تیل کے حوالے سے بھی ہے، پیسے کے حوالے سے بھی ہے لیکن یہ بحث علیحدہ ہے۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ اس وقت ظاہری منظر یہ ہے کہ جو کچھ لے رہے ہیں، ہم ہی مغرب سے لے رہے ہیں۔ مغرب کو کچھ نہیں دے رہے۔ مغرب یہ سمجھتا ہے سب کچھ میں ہی دے رہا ہوں، مشرق کچھ نہیں دے رہا۔ اندر کی بات ہم جانتے ہیں یا وہ جانتا ہے کہ اندر سے کیا دے رہا ہے اور کیا لے رہا ہے۔ لیکن ظاہری منظر یہ ہے کہ سائنسی ترقی کے حوالے سے، مشاہدات کے حوالے سے، تجربات کے حوالے سے وہی ہمیں سب کچھ دے رہا ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے فرمایا کہ ہم مرعوبیت کا شکار کیوں ہوئے ہیں۔ ایک چیز مغرب ہمیں دے رہا ہے، وہ ہمارے پاس نہیں۔ ایک چیز

ہمارے پاس بھی ہے جو ہم مغرب کو دے سکتے ہیں اور مغرب کے پاس نہیں ہے اور مغرب جس کی تلاش میں ہے۔ ہمیں ظاہری اسباب مغرب سے مل رہے ہیں اور اس لیے مغرب ہم پر چڑھائی بھی کر رہا ہے کہ میرا کھاتے ہو اور میرے خلاف ہی باتیں کر رہے ہو، لیکن ایک چیز ایسی بھی ہے جس کی مغرب کو تلاش ہے اور ہم مغرب کو دے سکتے ہیں اور وافر مقدار میں ہے، اگر ہماری اس طرف توجہ ہو جائے۔ مولانا نے فرمایا کہ ظاہری اسباب مغرب کے پاس ہیں، لیکن روحانیت کا سکون، ذہن کا سکون، وجدانیات ہمارے پاس ہیں، مغرب کے پاس نہیں ہیں اور مغرب اس کی تلاش میں ہے۔ مغرب آج روحانی سکون اور ذہنی سکون کی تلاش میں ہے۔ مغرب آج ماہرین نفسیات کے پاس اور نشے کے پاس ذہنی سکون تلاش کر رہا ہے۔ آج مغرب کو جو تھوڑا بہت سکون مل رہا ہے تو یا ماہر نفسیات ان کو تھوڑی بہت ورزشیں کراتے ہیں یا پھر منشیات یا بے ہنگم تفریح یعنی مادر پدر آزاد تفریح۔ سکون کے حقیقی اسباب ہمارے پاس ہیں۔ وہ قرآن پاک ہے، اللہ کا ذکر ہے، روحانیات ہیں، وجدانیات ہیں۔ وہ ہمارے پاس ہیں، مغرب کے پاس نہیں اور مغرب کو اس کی تلاش ہے۔ حضرت مولانا علی میاںؒ کا ارشاد یہ تھا کہ جس طرح مغرب منظم طریقے سے ظاہری اسباب ہمیں دے کر ہم پر رعب جما رہا ہے، اگر ہم کسی حکمت عملی اور منظم طریقے سے اپنی دولت ان کے سپرد کرنے کا کوئی راستہ نکال لیں تو پھر ہماری یہ مرعوبیت کا دائرہ ختم ہو گا اور ہم یہ کہیں گے کہ ہم مغرب کو بہتر چیز دے رہے ہیں۔ جو کچھ وہ ہمیں دے رہا ہے، ہم اس کو اس سے بہتر دے رہے ہیں۔

یہ ارشاد تو تھا مولانا علی میاںؒ کا۔ اس پر بطور شہادت کے ایک نومسلم کی بات عرض کر رہا ہوں۔

مغرب سے بات کرنے کے لئے لہجہ اور انداز کیا ہونا چاہیے؟

دورِ حاضر کے نامور نومسلموں میں سے ایک نامور مسلم یحییٰ برٹ ہے جس کا باپ جان

برٹ بی بی سی کا ڈائریکٹر جنرل رہا ہے۔ ابھی پچھلے سال ریٹائر ہوا ہے۔ اس کی ماں برطانیہ کے معروف اخبار ''ڈیلی انڈی پنڈنٹ'' کی چیف ایڈیٹر رہی ہے اور یہ اس اعلیٰ انگریز خاندان کا فرد ہے۔ مسلمان ہوا، مسلمان ہونے کے بعد باقاعدہ اسلام کو پڑھا۔ اس وقت آکسفورڈ میں بیٹھا ہے اور اسلام اور اسلامیات پر ریسرچ کر رہا ہے۔ کوئی آٹھ سال پہلے کی بات ہے، لندن میں ہمارے ''ورلڈ اسلامک فورم'' نے اسے استقبالیہ دیا۔ میں بھی اس وقت وہاں تھا۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ تم نسلاً ایک انگریز ہو، ایک بڑے خاندان کے آدمی ہو، برطانیہ کے شہری ہو، مسلمان ہوئے ہو، تم یہاں دعوت اسلام کے لیے ہماری کیا مدد کرو گے، ہماری کیا راہنمائی کرو گے؟ یحییٰ برٹ کو ہم نے کہا۔ اس نے پونے گھنٹہ کا لیکچر دیا۔ اس نے کہا کہ دیکھو، مغرب کے پاس کون سی چیز نہیں ہے اور کس چیز کی تلاش میں ہے۔ وہ مہیا کر دو۔ بہت سے لوگ مہیا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مختلف زاویوں سے، لیکن بات بن نہیں رہی۔ مغرب کو چاہیے وجدانیات جس کا خلا ہے۔ مغرب کو چاہیے روحانیت، اس کا خلا ہے۔ مغرب کو چاہیے دل کا اطمینان اور ذہن کا سکون، اس کا مغرب متلاشی ہے۔ بہت سے مصنوعی حلقے ادھر ادھر سے آ رہے ہیں، ہندو جوگی بھی جا رہے ہیں، ہمارے بعض متصوفین بھی جا رہے ہیں، لیکن بات بن نہیں رہی۔

اس نے کہا کہ میں نے مطالعہ کیا ہے۔ اگر مغرب کو روحانیات سمجھانی ہے اور اسلام کی دعوت دینی ہے تو دو آدمیوں کی سٹڈی کرو اور ان کے لہجے میں مغرب سے بات کرو۔ مغرب آپ کی بات سننے کو تیار ہے۔ اس نے کہا کہ دو آدمی ہیں جن کی زبان میں مغرب سے بات کی جا سکتی ہے اور مغرب کو بات سمجھائی جا سکتی ہے۔ ایک شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور دوسرے حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ۔ ان دو آدمیوں کے لہجے سے مغرب کو بات سمجھائی جا سکتی ہے اور ان کے لہجے کو اور اسلوب کو مغرب سمجھے گا۔ اس میں معقولات بھی ہیں، روحانیات بھی ہیں۔ اس نے کہا کہ صرف روحانیات بھی نہیں چلیں گی اور صرف

معقولات بھی نہیں چلیں گی۔ اس نے کہا کہ بطور نمونے کے دو شخصیات کا ذکر کر رہا ہوں۔ ان دو آدمیوں کا لہجہ تم اختیار کرو، مغرب تمہاری بات سنے گا۔

میں نے یہ بات اس حوالے سے کی کہ ہمارے ہاں خلا ٹیکنالوجی، سائنس اور ظاہری سسٹم کا ہے اور مغرب کے ہاں خلا روحانیات اور وجدانیات کا ہے۔ دونوں جگہ یہ دیکھ لیا جائے کہ یہ کرپٹ نظام تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اس وقت جو خلا ہمارے ہاں ہے اور جو ان کے ہاں ہے، یہ دونوں تعلیمی نظاموں کے ثمرات ہیں۔ ان ثمرات کو کیسے اڈجسٹ کرنا ہے، کیسے سمیٹنا ہے، یہ آپ پر بات چھوڑتا ہوں۔ میں نے صرف معروضی صورت حال عرض کی ہے۔ اس پر ایک گواہی کا اور اضافہ کروں گا۔ ہمارے پاکستان کے مشہور دانشور ہیں پروفیسر خورشید احمد، جماعت اسلامی کے سینٹر ہیں، زیادہ تر ان کا کام علمی و فکری ہے، یہاں بھی اور مغرب میں بھی۔ برطانیہ میں ان کا ادارہ ہے اسلامک فاؤنڈیشن۔ بڑا وسیع کام کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی سیمینارز کرتے ہیں اور لوگوں کو بلاتے ہیں۔ ایک سیمینار میں، میں وہاں تھا۔ مجھے بھی دعوت دی گئی، میں بھی چلا گیا۔ اس وقت ''جم مارشل'' بطور مہمان خصوصی آئے جو کہ برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔

اسلام کی مختلف تصاویر:

جم مارشل نے تقریر کی اور اس کا ترجمہ اس ادارے کی طرف سے چھپا، اس کا ایک جملہ عرض کرنا چاہ رہا ہوں۔ جم مارشل نے اپنے تاثرات مسلمانوں کے اجتماع میں بیان کیے۔ اسے سارے مولوی ہی مولوی نظر آرہے تھے۔ اس نے لمبی بات کی کہ اسلام کیا ہے، اسلام کو میں کیسے سمجھتا ہوں وغیرہ۔ اس کے دو تین جملے ذکر کرنا چاہوں گا۔ اس نے کہا کہ ہم مغرب کے لوگ اسلام کی سٹڈی کرتے ہیں اور اسلام کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس سامنے رکاوٹ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ مغرب آپ کی بات سننے کو، ماننے کو اور قبول کرنے کو تیار ہے، مگر ہمارے سامنے مسلمان اور اسلام کی الگ الگ پکچرز ہیں۔ ہمارے سامنے

اسلام کی ایک پکچر وہ ہے جو ہمیں ہمارے بڑوں نے بتائی ہے اور جو صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ مسلمان یہ ہوتا ہے، یہ ہوتا ہے، لیکن ہم آزاد خیال لوگ ہیں اور خود سٹڈی کرتے ہیں۔ اسپین میں مسلمان تھے، انہوں نے کیا کیا؟ مسلمانوں کا ماضی کیا ہے؟ ہم پر ان کے اثرات کیا ہیں؟ خلفاء کی تاریخ کیا ہے؟ جب ہم خود سٹڈی کرتے ہیں تو ایک بالکل مختلف تصویر بنتی ہے اس سے جو ہمارے بڑوں نے بتایا تھا۔ اس نے کہا کہ تیسرے نمبر پر ایک مسئلہ یہ ہے کہ جب ہم آج کل کے اردگرد کے مسلمانوں کی طرف دیکھتے ہیں تو ایک اور الگ تیسری تصویر بنتی ہے۔ نہ یہ وہ ہے اور نہ وہ یہ ہے۔ اس نے کہا کہ جب ہم دیکھتے ہیں آپ لوگوں کے اخلاقیات اور طرز عمل کو تو ایک الگ تصویر بن جاتی ہے اور ہم یہ سمجھ نہیں پاتے کہ کون سی تصویر اصل ہے۔ یہ خلا آپ پر کریں اور یہ کنفیوژن آپ دور کریں، اسلام کی بات سننے کے لیے ہم تیار ہیں۔

دو چینی پروفیسروں سے ملاقات:

یہ بھی میں اس پس منظر میں عرض کر رہا ہوں کہ مغرب کے نظام تعلیم اور ہمارے نظام تعلیم کے جو اثرات ہیں سوسائٹیوں پر، آج کے معروضی حالات میں جو فرق موجود ہے جو نظر آ رہا ہے، اس فرق کی بنیاد پر ہماری آج کی صورت حال کیا ہے۔ میں اس پر تھوڑا سا اضافہ اور کروں گا کہ دنیا میں اس کے حوالے سے کیا ہو رہا ہے۔ ابھی اسی سال رمضان میں دو پروفیسر آ گئے بیجنگ یونیورسٹی سے۔ ایک عربی کا پروفیسر ہے اور ایک اردو کا پروفیسر ہے۔ دونوں چینی ہیں۔ اسلام آباد میں آئی پی ایس کے نام سے پروفیسر خورشید صاحب کا ادارہ ہے اور خالد رحمن صاحب اس کے ڈائریکٹر جنرل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ دو پروفیسر آئے ہوئے ہیں اور مدارس کے نظام پر سروے کر رہے ہیں۔ رمضان ہے، کوئی بڑا عالم قابو میں نہیں آ رہا۔ آپ کا نام ذہن میں آیا، اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے پاس بھیج دوں؟ میں نے کہا کہ بھیج دو۔ مہمان ہیں دوپہر کا کھانا ہی کھلانا ہے، کھلا دوں گا۔ وہ کہنے

لگے کہ ڈر ہے کہ یہ نہ ہو جائے، وہ نہ ہو جائے۔ میں نے کہا کہ کھلا دوں گا، آپ بھیج دیں میرے پاس۔ وہ آئے میرے پاس اور دو گھنٹے میرے ساتھ گفتگو کی۔ بس دو باتوں کا خلاصہ عرض کر دیتا ہوں۔

پروفیسروں سے ہونے والی گفتگو:

آج میں بتا رہا ہوں کہ نظام تعلیم کے حوالے سے دنیا کی معروضی صورت حال کیا ہے؟ کہنے لگے، ان کے بقول چین میں چھ کروڑ مسلمان ہیں اور چینی مسلمانوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم دس کروڑ ہیں۔ چھ کروڑ ہی سہی، چھ کروڑ کوئی معمولی چیز تو نہیں ہوتی۔ کہنے لگے اب ہم وہاں تھوڑی سی مذہبی آزادی دے رہے ہیں۔ مسجدیں چل رہی ہیں۔ مدرسے بن رہے ہیں۔ ہم ان کے مذہبی نظام تعلیم میں کچھ سپورٹ بھی کرنا چاہتے ہیں، لیکن پاکستانی مدرسوں کو دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔ یہ ہے اصل مسئلہ۔ وہ بھی چاہتے ہیں کہ ہمیں چھوٹے چھوٹے مذہبی مدرسے بنانے کی اجازت دے دی جائے اور ہم بھی چاہتے ہیں کہ بنانے دیں، لیکن ڈر لگ رہا ہے، کہاں سے؟ پاکستان کے مدارس دیکھتے ہیں تو ڈر لگتا ہے کہ مدارس کے بعد کچھ اور نہ ہو جائے۔ اس وجہ سے ہم سروے کرنے آئے ہیں کہ آپ کیا پڑھاتے ہیں؟ کیوں پڑھاتے ہیں؟ نظام تعلیم کیا ہے؟ نصاب تعلیم کیا ہے؟ آپ کے مقاصد کیا ہیں؟ یہ لمبی دو تین گھنٹے کی گفتگو ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ ہمیں مشورہ دیں کہ ہم کیا کریں کہ پاکستانی مدارس کے ماحول سے بھی بچیں اور اپنے ملک کے مسلمانوں کو مذہبی تعلیم کا حق بھی دیں۔ یہ سوال تھا ان کا۔ میں نے کہا کہ بالکل میں مشورہ دوں گا۔ میں نے کہا کہ میرا پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ طلبا کو تو کہیں پڑھنے کے لیے نہ بھیجیں۔ آپ اساتذہ کو اور انہیں بھی پاکستان نہ بھیجیں، بلکہ انڈیا بھیجیں۔ دارالعلوم دیوبند سے بات کر لیں۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے بات کر لیں۔ وہاں کسی تعلیمی ادارے سے آپ بات کر لیں۔ اساتذہ کو دو سال کی ٹریننگ دلوائیں اور وہاں اپنے چھوٹے چھوٹے مدارس قائم کریں۔ انہوں نے کہا کہ یہ اچھی تجویز

(Good idea) ہے۔ میں نے کہا کہ اگر مان لیا تو دس سال بعد پتہ چلے گا کہ یہ کیا ہے۔ میں نے کہا چھوڑو پاکستان کو، یہاں تمھیں لال مسجد نظر آتی ہے اور پتہ نہیں کیا کیا نظر آتا ہے۔ انڈیا بھیج دو، دارالعلوم دیوبند یا ندوہ والوں سے بات کرلو اور دو تین ہزار اساتذہ کو دو دو سال کا کورس کروالو اور ان اساتذہ کی بنیاد پر چھوٹے چھوٹے مکاتب قائم کرلو تا کہ ماحول بھی اپنا ہو، کلچر بھی اپنا ہو اور سارا کچھ اپنا ہو۔

دنیا میں نظام تعلیم کے متعلق کیا سوچا جا رہا ہے؟

یہ واقعہ میں نے اس لیے عرض کیا کہ دنیا میں اس وقت نظام تعلیم کے حوالے سے کس لیول پر سوچا جا رہا ہے۔ مجھے ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ امریکہ میں ہر سال جاتا ہوں۔ دو سال پہلے کی بات ہے، واشنگٹن میں ورجینیا میں ہمارا قیام ہوتا ہے۔ وہاں دارالہدیٰ کے نام سے ہمارا ایک دینی ادارہ ہے، اس کے ساتھ میرا تعلق ہے۔ وہاں کچھ لوگ پاکستانی اور انڈینز کا ایک گروپ آیا۔ انہوں نے کہا کہ یہاں ہم اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک بات پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ آپ سے مشورے کے لیے آئے ہیں، آپ ہمیں مشورہ دیں۔ دنیا مذہب کی طرف واپس جا رہی ہے۔ یہ بات طے ہے، اس وقت جو صورتحال ہے۔ ہمارے ہاں بھی صورتحال یہی ہے۔ مذہب کی طرف رجحان کا آج سے بیس سال پہلے جو لیول تھا، آج اس سے کہیں زیادہ ہے؟ دائرہ بھی وسیع ہے، رجحان بھی زیادہ ہے۔ پہلے دین خاص طبقے کے لوگوں نے پڑھا ہے۔ اب ہر طبقہ دین پڑھنے آ رہا ہے۔ یہ مغرب میں بھی ہو رہا ہے اور ان کو بھی احساس ہو رہا ہے کہ مذہب کی طرف واپس آنا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہمیں یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ اگلے بیس تیس سال میں سوسائٹی کی اکثریت کا رجحان مذہب کی واپسی کی طرف ہوگا۔ تیزی سے لوگ اور سوسائٹی مذہب کی طرف آ رہی ہے، لیکن ہمیں جو بات پریشان کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ مذہب سوسائٹی کے معاملات میں دخل تو نہیں دے گا۔ میں نے جو آدمی بات کر رہا تھا، اس کو آہستہ سے پنجابی میں کہا: ”جے

مذہب ہو یا تاں کرے گا"۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس معاملے میں آپ کے ساتھ ایک طویل نشست چاہتے ہیں۔ اس وقت میں نے کہیں جانا تھا، میرے پاس وقت نہیں تھا۔ انہوں کہا کہ اس خطرے کا کیا سد باب ہے؟

یہ میں نے دو چار واقعات آپ کے سامنے اپنے مشاہدے کے عرض کر دیے یہ بات بتانے کے لیے کہ مغرب نے اپنی تعلیم سے، عقیدے سے، تربیت سے جو مذہب کو اور آسمانی تعلیمات اور وحی کو خارج کر دیا تھا، اب اس کا وقت تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ مغرب کے سامنے دوسری پریشانی یہ ہے، میں ساتھ ہی ایک بات عرض کرنا چاہوں گا، مغرب کی اعلیٰ دانش گاہوں میں اس بات پر سنجیدگی سے بات ہو رہی ہے کہ مذہب کی طرف اب واپسی ہوگی۔ وہ رومانس جو تھا 200 سال کا انقلاب فرانس کا، وہ رومانس کمزور پڑ گیا ہے۔ مذہب کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ وجدانیات کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ یہ اگلا مسئلہ ہے کہ ان کو مذہب کی صحیح تعلیم کہاں سے ملے گی اور کون دے گا۔ وہاں کے مذہبی حلقوں کے لیے پریشانی یہ ہے کہ ان کو مذہب کی صحیح تعلیم کون دے گا اور کہاں سے ملے گی۔ مذہب کی طرف واپس جانا چاہتے ہیں۔ مذہب کی بات وہی کر سکے گا جس کا مذہب اوریجنل ہوگا۔ وہی مذہب کی بات کر سکتا ہے۔ اوریجنل مذہب کس کے پاس ہے؟ مذہب کیا ہے؟ آسمانی تعلیمات اور ان کی پیغمبرانہ تشریح۔ یہ مذہب ہے۔ یہ نہ یہودیوں کے پاس اوریجنل ہے، نہ عیسائیوں کے پاس ہے نہ کسی اور کے پاس ہے۔ خطرے کی بات ان کے سامنے یہ ہے کہ مذہب کی طرف اگر واپسی ہوئی تو جس دکان پر یہ سودا ملتا ہے، لوگ جائیں گے اسی دوکان پر اور اس دوکان کے نمائندے دنیا کے ہر کونے میں پہنچ چکے ہیں۔ ملازمت کے نام سے گئے ہیں، تجارت کے نام سے گئے ہیں یا مزدوری کے نام سے گئے ہیں۔ ہر علاقے میں مسجدیں موجود ہیں۔ ہر علاقے میں قرآن موجود ہے اور پڑھا جا رہا ہے۔ اس کی تعلیم ہو رہی ہے۔

امریکہ مین مدارس عربیہ:

متعلقہ بات تو نہیں ہے، لیکن میں یہ بات عرض کرنا چاہوں گا کہ میں نے گزشتہ دو سال میں امریکہ میں جو خالص دینی مدارس دیکھے ہیں، گیارہ بارہ مدارس، کوئی بھی دس ایکڑ سے کم میں نہیں ہے۔ دس ایکڑ، بارہ ایکڑ، پندرہ ایکڑ کے بڑے بڑے مدرسے بنائے گئے ہیں اور یہ اسلام کا اعجاز بھی ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں بنوں کے، کسی زمانے میں جے ٹی آئی کے سیکرٹری جنرل ہوا کرتے تھے۔ وہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ پر پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے وہاں چلے گئے۔ کوئی تیس سال پہلے کی بات ہے۔ ایک مسجد میں ان کو امامت مل گئی۔ اس زمانے میں نیشنلٹی آسان تھی، انھیں نیشنلٹی مل گئی۔ اتفاق یہ ہوا کہ تین چار سال بعد اسے مسجد والوں نے نکال دیا۔ مسجدوں کے حوالے سے میرا تبصرہ یہ ہوتا ہے کہ کمیٹی مضبوط ہو تو مولوی غریب کا کوئی حال نہیں اور اگر مولوی تگڑا ہو تو کمیٹی غریب کا کوئی حال نہیں۔ اب اس نے سوچا کہ نیشنلٹی ملی ہوئی ہے، کیسے پاکستان واپس چلا جاؤں۔ انہوں نے قریب ہی کرایے پر ایک مکان لیا اور حفظ کی کلاس شروع کر دی۔ اب رمضان میں، میں ان کے مدرسے میں گیا ہوں۔ دس ایکڑ کا مدرسہ ہے اور چار منزلہ بلڈنگ ہے اور حاضری کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی مسجد کے ہال میں نمازیوں کی تعداد نہیں سماتی۔ مدرسے کے ہال میں تراویح پڑھاتے ہیں۔ وہ ہال بڑا ہے۔ دو دن میں نے بھی وہاں تراویح پڑھی ہے۔ ان کا چھ سال کا بچہ حافظ ہے۔ اگر دو چار جگہ سے وہ قرآن نہ سناتا تو میں بھی یقین نہ کرتا۔ چھ سال کا بچہ حافظ ہے۔ امریکہ میں مجھے لگتا ہے کہ اللہ کا کوئی نظام ہے، کوئی خاص پروگرام لگتا ہے۔

یہ مشاہدہ میں عرض کر رہا ہوں۔ ابھی ایک دوست نے 23 ایکڑ جگہ نیویارک میں خریدی ہے مدرسے کے لیے۔ ابھی شروع نہیں کیا، اجازت لے رہا ہے۔ دس ایکڑ، پندرہ ایکڑ، بیس ایکڑ کے کئی مدرسے ہیں۔ دس گیارہ کو تو میں جانتا ہوں۔ وہ بن رہے ہیں۔ وہاں کا ماحول بالکل

مختلف ہے۔ پتہ نہیں بات سے بات کیوں یاد آجاتی ہے۔ پچھلے سال میں نیویارک میں تھا۔ شعبان میرا وہیں گزرتا ہے، چھٹیاں وہیں گزارتا ہوں۔ وہاں ایک شریعہ بورڈ ہے، انڈیا کے ایک مولانا صاحب ہیں مفتی نوال الرحمن چیئرمین شریعہ بورڈ۔ مسلمانوں کو نکاح وطلاق وراثت، حرام اور حلال کے مسائل میں یہ دستوری حق حاصل ہے کہ وہ اپنی عدالتیں بنا سکتے ہیں اور اپنے مقدمات اور محدود معاملات نکاح، طلاق، حلال، حرام کے مالی معاملات اپنی شریعت کے مطابق حل کر سکتے ہیں۔ ان کو حق حاصل ہے کہ شرعی عدالتیں بنائیں اور بنی ہوئی بھی ہیں۔ نیویارک میں اور شکاگو میں شریعہ بورڈ کے نام سے کام کر رہی ہیں۔ عدالتیں بیٹھتی ہیں، مقدمات سنتی ہیں اور فیصلے کرتی ہیں اور امریکہ کی لوکل عدالتیں ان کے فیصلے کو تسلیم کرتی ہیں، امریکہ کا عدالتی نظام ان کے فیصلوں کا احترام کرتا ہے اور تسلیم کرتا ہے۔ سپریم کورٹ تک میں اس کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا کہ یہ مذہبی معاملہ ہے اور مذہبی عدالت کا فیصلہ ہے۔

پچھلے سال نیویارک میں شریعہ بورڈ کی سالانہ میٹنگ تھی۔ اتفاق سے میں بھی وہاں موجود تھا۔ مجھ کو بھی بلا لیا گیا۔ وہاں سال کی ایک رپورٹ پیش کی گئی۔ رپورٹ میں انہوں نے بتایا کہ شکاگو میں ایک کیس تھا۔ دو مسلمانوں کا کاروبار ختم ہوا، اثاثوں کی تقسیم کا جھگڑا تھا۔ ایک مقامی عدالت میں سات سال سے کیس چل رہا تھا لیکن فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ انہوں نے وہ کیس تجرباتی طور پر ہمارے پاس بھیجا کہ یہ مسلمانوں کا کیس ہے، آپ فیصلہ کر دیجیے۔ ہم نے تین چار پیشیاں لگا کر گیارہ دن میں فیصلہ ان کے حوالے کر دیا۔ مسجد میں بیٹھے، نہ ادھر سے کوئی ڈالر لگا، نہ ادھر سے کوئی ڈالر لگا۔ فیصلہ کیا اور لوکل کورٹ کو رپورٹ بھیجی۔ دونوں فریق مطمئن ہیں، کوئی اپیل نہیں کرے گا۔ ان کا شکریے کا خط آیا کہ جو مقدمہ سات سال سے ہم حل نہیں کر سکے تھے، وہ آپ نے حل کر دیا۔ اگر اس قسم کا آئندہ کوئی پیچیدہ کیس ہو تو کیا آپ کے پاس بھیج دیں؟ یہ رپورٹ وہاں پیش کی گئی۔ بعد میں ایک نوجوان جو وہاں کے سسٹم سے بہت متاثر تھا، کہنے لگے دیکھا، مولوی صاحب امریکہ میں خوش ہو؟

میں نے کہا، خوش ہوں۔ اس نے پوچھا امریکہ کیا کر رہا ہے؟ میں نے کہا، بہت کچھ کر رہا ہے۔ بس ایک چھوٹی سی شکایت ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ مسلمان مسجدیں بنا رہے ہیں اور شرعی بورڈ قائم ہے۔ بس صرف ایک درخواست ہے کہ وہ کام جو میں شکاگو میں کر سکتا ہوں، وہ مجھے لاہور میں کیوں نہیں کرنے دیتے؟ جو کام میں نیویارک میں، واشنگٹن میں کر سکتا ہوں، وہ کام مجھے منگورہ میں کیوں نہیں کرنے دیتے؟

خیر میں عرض کر رہا ہوں کہ یہ تو میں نے صورتحال پر رننگ کمنٹری کی ہے۔ اس وقت صورتحال کیا ہے، اس میں نظام تعلیم کا کتنا حصہ ہے، آپ تناسب طے کر لیں۔ میں نے ایک رواں تبصرہ کیا ہے۔ اب میں گفتگو کے آخر میں دو نکات کی طرف آؤں گا، اس کی بات کر کے بات کو سمیٹوں گا۔ ایک تو اس حوالے سے کہ مغرب میں اس وقت جو ذہنی طور پر، فکری طور پر تبدیلی نظر آنے لگی ہے، سارے مغرب کو ایک نظر سے مت دیکھیں۔ مغرب کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جو آپ کے انتظار میں ہے۔ آپ ان سے بات کریں، صحیح لہجے میں ان کو ان کے لہجہ میں بات سمجھائیں، اس کے لیے ہم توقعات باندھے بیٹھے ہیں حکومت سے۔ ہماری حکومتیں کچھ نہیں ہیں۔ وہاں کے ماحول کو سمجھنا، وہاں کے سسٹم سے واقف ہونا، وہاں کی ذہنی سطح کو چیک کرنا اور اس کے مطابق ان کے لہجے میں اور زبان میں ان سے بات کرنا۔ یہاں ایک بات میں ضمناً عرض کر دوں۔ ہم نے زبان کی تبدیلی صرف زبان کی تبدیلی سمجھ رکھی ہے۔ وہ بات جو ہم اردو میں لکھتے ہیں، اسے انگریزی میں لکھ دیں تو کام بن جائے گا۔ یہ بات غلط ہے۔ لغت الگ چیز ہے، اسلوب، لہجہ اور نفسیات الگ چیز ہے۔ ہمارا جو انگلش کا لٹریچر وہاں جاتا ہے، اس میں بھی وہی کتابی ترجمہ ہے، وہ کام نہیں کرتا۔ ہماری نفسیات اور ہے، ان کی نفسیات اور ہے۔ مخاطب کی نفسیات پر بات کرنا، یہ گفتگو کا تقاضا بھی ہے اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہے۔ میں ایک حوالہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔

مکہ کے سردار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

تھا کہ میرے دائیں ہاتھ میں چاند اور بائیں ہاتھ پر سورج رکھ دیا جائے تو بھی میں اپنی دعوت سے دستبردار نہیں ہوں گا۔ لمبا واقعہ ہے جس میں انہوں نے پوچھا تھا کہ آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ کی دعوت کیا ہے؟ اس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جملہ ارشاد فرمایا تھا۔ میں ایک کلمہ پیش کر رہا ہوں۔ اگر تم مان لو گے تو عربوں میں تمہاری بادشاہت ہو گی اور عجم بھی تمہارے تابع ہوں گے۔ اس جملے کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہ اسلام کے مقاصد میں ہے؟ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی نفسیات کے مطابق بات کر رہے ہیں۔ چودھری لوگ چودھراہٹ ہی کی زبان سمجھیں گے۔ سردار لوگوں کو سرداری ہی چاہیے۔ سرداری یہیں ملے گی۔ جس سرداری کو تم چھوڑنا نہیں چاہتے، وہ سرداری بھی یہیں ملے گی۔ یہ اسلام کے مقاصد میں سے تو نہیں ہے، فوائد وثمرات سے میں انکار نہیں کر رہا۔ مغرب میں مغرب کی زبان میں، مغرب کی نفسیات کے مطابق، مغرب کے ذہنی لیول کے مطابق دین کی بات کرنا اور صرف دعوت نہیں بلکہ اسلام کی تعلیمات کو پہنچانا اور سمجھانا یہ بہر حال ہماری ذمہ داری ہے۔ ہم اگر نہیں کریں گے تو اور کسی نے نہیں کرنا۔ حکومت نے تو بالکل نہیں کرنا۔ علما اور ادارے متوجہ ہوں، بہر حال یہ ہمارے فرائض میں سے ہے۔

اساتذہ کی ذمہ داری:

دوسری بات جو میری گفتگو کی آخری بات ہے۔ میں بھی ایک چھوٹا موٹا استاد ہوں اور اپنی برادری میں بیٹھا ہوں، اپنی برادری میں بیٹھ کر اگر کوئی بے تکلفی کی بات کرے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ہم جن طلبا کو پڑھاتے ہیں، جب یہ ہم سے پڑھ کر جزیرے سے باہر جاتے ہیں، جزیرے سے چھلانگ لگاتے ہیں سمندر میں تو ان غریبوں کا پتہ نہیں کیا حشر ہوتا ہے۔ یہ جزیرے ہیں چھوٹے چھوٹے، ان جزیروں میں ہم بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہاں سے نکل کر جب سوسائٹی کے سمندر میں چھلانگ لگاتے ہیں تو ان کو کچھ پتہ نہیں کہ وہاں کون کون سے جانور ہیں، کس کس سائز کے ہیں اور کس کس ہتھیار سے مسلح ہیں۔ ہم یہاں سے سند پکڑا کر پھینک دیتے

ہیں۔وہ بیچارے کیا کرتے ہیں؟ جس سوسائٹی کے سمندر میں ہم ان کو پھینک رہے ہیں، وہ بڑا خوفناک سمندر ہے۔اس سمندر کی گہرائی سے،اس کے ماحول سے اور اس کے طرح طرح کے جانوروں سے واقف کرانا یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ وہاں جاؤ گے تو ادھر اس مگرمچھ سے واسطہ پڑے گا،فلاں سے پڑے گا،فلاں سے پڑے گا اور یہ ہم نہیں کر رہے ہیں۔ہم رسمی تعلیم دے رہے ہیں۔روحانی تربیت،اخلاقی تربیت،فکری تربیت تینوں خانے خالی ہیں۔رسمی تعلیم دے رہے ہیں۔کوئی ادارہ یا کچھ افراد اپنے ذاتی ذوق سے کر رہے ہوں گے،لیکن مجموعی طور پر ہمارا تعلیمی نظام ان چیزوں کی تربیت سے خالی ہے۔مجموعی طور پر بات کر رہا ہوں۔کچھ استثنا بھی ہیں۔مجھے کبھی کبھی ڈر لگتا ہے۔میں دیوان حماسہ کا شعر پڑھا کرتا ہوں۔شعر کی کہانی یوں لکھتے ہیں کہ ایک نوجوان کو قبیلے والوں نے پال پوس کر بڑا کر لیا،کھلایا پلایا،خوب تگڑا ہوگیا۔لیکن اس کا دشمن بھی تھا،اسے لڑائی جھگڑا نہیں سکھایا۔وہ جوان ہوا،مخالفین کا سامنا کرنا پڑا، مار پڑی اور پٹ گیا۔گھر واپس آ کر قبیلے والوں کو کوس رہا ہے:

فهلا اعدونی لمثلی تفاقدوا
وفی الارض مبثوث شجاع وعقرب

اساتذہ ہیں،ترجمے کی ضرورت نہیں۔کہتا ہے،جب میرے قبیلے والوں کو پتہ تھا، خدا کرے یہ ایک دوسرے کو گم پائیں،ساتھ بددعا بھی دے رہا ہے،ان کو پتا تھا کہ زمین میں سانپ اور بچھو بھی ہیں۔انہوں نے پہلے بتایا کیوں نہیں،تیار کیوں نہیں کیا؟ جب ان کو معلوم تھا کہ میرا مقابلہ ایک ٹیڑھی گردن والے متکبر آدمی سے ہونے والا ہے تو انہوں نے مجھے مدمقابل کے لیے تیار کیوں نہیں کیا؟ آج ہماری صورتحال یہ ہے،بات کو سمیٹتے ہوئے ایک مسئلے کی طرف میں توجہ دلاؤں گا کہ ہمارے معاشرے میں سب سے بڑا فتنہ کیا ہے۔ سب سے بڑا فتنہ تشکیک ہے۔تشکیک کی تکنیک کیا ہے؟ ایک دانشور آئے گا۔چینل پر بڑی اچھی گفتگو کرے گا۔بڑی معلومات دے گا۔لوگ کہیں گے بڑی اچھی تقریر کرتا ہے۔ہم بھی

کہیں گے اچھی تقریر کرتا ہے۔ تقریر کرتے کرتے درمیان میں ایک شک کا بیج ڈال دے گا کسی معمولی سے مسئلے میں، کوئی بڑا مسئلہ بھی نہیں ہوگا۔ کوئی چھوٹا سا شک کا بیج ڈال کر چلا جائے گا۔ جب کسی نوجوان کے ذہن میں شک کا بیج بیٹھ گیا تو وہ صفائی کے لیے کس کے پاس جاتا ہے؟ صبح نماز کے بعد مولوی صاحب کو پکڑ لے گا۔ رات کو اس نے دو گھنٹے کا بیان سنا ہے۔ اس میں وہ شک آگیا تو اس نے آکر مولوی صاحب کو پکڑنا ہے کہ مولوی صاحب، یہ کیا مسئلہ ہے۔ مولوی صاحب نے مطالعہ نہیں کیا۔ وہ تو خالی الذہن ہے۔ اس کو کیا پتہ کہ صبح میرے لیے یہ سوال ہونا ہے، میں مطالعہ کر کے جاؤں۔ اب وہ کیا کرے گا؟ یا تو ڈانٹ دے گا کہ فضول پروگرام کیوں سنتے ہو؟ یہی کرے گا، اور کیا کرے گا؟ یا جو بات وقتی طور پر ذہن میں آئی، وہ کہہ دے گا، لیکن وہ بات اسے اپیل نہیں کرے گی۔

آج کے دور میں سب سے بڑا فتنہ لوگوں کے ذہنوں میں شک پیدا کرنا اور علما کے اعتماد کو مجروح کرنا ہے۔ یہ سارے میڈیا والے، یہ کالم نگار بھی یہی کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے میں آپ حضرات سے بات کرنا چاہوں گا۔ چونکہ سارے اساتذہ ہیں، بات کرنے کا موقع مل گیا۔ باقی باتیں اپنی جگہ، لیکن اس نئی نسل کو اور شاگردوں کو جس جنگل میں پھینک رہے ہیں، ان کو ماحول سے واقف کرانا، مقابلے کی تیاری کروانا یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ اگر ہم توجہ دیں گے، وقت لگائیں گے، محنت کریں گے، کچھ وقت صرف کریں گے تو اپنی ذمہ داری سرانجام دے سکتے ہیں۔

میں نے پتہ نہیں کہاں کہاں کی کون کون سی باتیں کہہ دی ہیں، لیکن میرا جی چاہ رہا تھا باتیں کرنے کو۔ اس بہانے سے میں نے کچھ باتیں کہہ دیں۔ اللہ تعالیٰ صحیح باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور غلط باتوں کی اصلاح کی توفیق عطا فرمائے۔

اللھم صل علی سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اخروی زندگی کیلئے فائدہ مند کام

"6 مارچ 2009ء کو ہانگ کانگ کے علاقہ "شام شیو پو" کی جامع مسجد ختم نبوت میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب کا خلاصہ"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

زندگی میں پہلی بار ہانگ کانگ میں حاضری کا موقع ملا ہے، ہانگ کانگ کی مساجد کے بورڈ آف ٹرسٹیز کا شکرگزار ہوں جس کی دعوت پر یہ حاضری ہوئی ہے اور مولانا قاری محمد طیب کا شکرگزار ہوں جنہوں نے اپنے اس مرکز میں آپ حضرات کے ساتھ ملاقات اور گفتگو کا اعزاز بخشا ہے اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر سے نوازیں، ہمارا مل بیٹھنا قبول فرمائیں، کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق دیں اور دین کی جو بات علم اور سمجھ میں آئے اس پر عمل کی توفیق بھی عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

میں ابھی جب اس مسجد کے ہال میں داخل ہوا تو آپ کے خطیب مولانا قاری محمد طیب صاحب جو میرے پرانے دوستوں اور ساتھیوں میں سے ہیں آپ سے خطاب کر رہے تھے اور دینی مدارس کے حوالہ سے گفتگو فرما رہے تھے، میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی اسی موضوع پر آپ سے گفتگو کروں اس لئے کہ یہ آج کی دنیا کا ایک بڑا موضوع ہے جس پر ہر سطح

پر گفتگو ہو رہی ہے اور دینی مدرسہ کے کردار کے بارے میں دنیا بھر میں سوالات اٹھائے جا رہے ہیں کہ تعلیم کے اجتماعی دھارے سے ہٹ کر اس مدرسہ کی ضرورت کیا ہے، سوسائٹی میں اس کا کردار کیا ہے؟ اور ہماری عملی زندگی کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہے؟

یہ آج کی دنیا کا ایک اہم سوال ہے کہ دینی مدرسہ کی تعلیم کا ہماری پریکٹیکل لائف کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ میں اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس بات پر غور کی دعوت دینا چاہوں گا کہ "لائف" کیا ہے؟ اور ہمارے ذہنوں میں زندگی کا تصور کیا ہے؟ کیا زندگی اور لائف دنیا میں پیدا ہو جانے سے لے کر مر جانے تک کا نام ہے؟ کیا یہ پچاس ساٹھ یا ستر برس کی زندگی ہی صرف زندگی ہے یا اس سے آگے پیچھے کسی اور زندگی کا وجود بھی ہے؟ اگر تو زندگی صرف اتنے پیریڈ کا نام ہے جو کہ آج کی بہت سی اقوام یا افراد کا خیال ہے تو ان کا یہ سوال کسی حد تک درست ہے لیکن ہمارا عقیدہ یہ نہیں ہے، ہمارا یقین اور عقیدہ کے مطابق تو زندگی کا اصل اور بڑا مرحلہ اس سے آگے کا ہے، ہمارے نزدیک موت فنا ہونے کا نام نہیں بلکہ ایک جہاں سے دوسرے جہاں کی طرف منتقل ہو جانے کا نام ہے اور دنیا کا باڈر کراس کر کے آخرت کے دور میں داخل ہونے کا نام ہے، اسی لئے ہم مرنے والے کیلئے یہ نہیں کہتے کہ وہ ختم ہو گئے ہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ وہ انتقال فرما گئے ہیں یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہیں اور عارضی زندگی سے مستقل زندگی کی طرف رحلت کر گئے ہیں۔

دنیا میں بہت سے لوگوں نے اسی دنیا کی زندگی کو اصل زندگی سمجھ رکھا ہے اور اپنی تمام تر سرگرمیوں کو اسی کے دائرے میں محصور کر لیا ہے لیکن ہمارے عقیدہ میں یہ زندگی عارضی ہے ناپائیدار ہے اور اصل زندگی وہ ہے جو مرنے کے بعد شروع ہو گی، اس کا ایک مرحلہ قبر کی زندگی کا ہے، برزخ کی زندگی کا ہے جو نہ جانے سینکڑوں سال کا ہے یا ہزاروں سال کا ہے، دوسرا پیریڈ حشر کے دن کا ہے جو پچاس ہزار سال کا ہے اور تیسرا پیریڈ اس سے آگے کا ہے جو ان لمیٹڈ ہے، غیر محدود ہے، ادھر گئے تو "خالدین فیہا" اور ادھر گئے

تب بھی ''خالدین فیھا''

دنیا کی زندگی کیا ہے یہی چالیس، پچاس، ساٹھ، ستر اور اسی برس ہیں اس کے بعد کوئی نوے تک پہنچ بھی گیا تو اس کی زندگی کیا زندگی ہے اور اس زندگی کے بارے میں قرآن کریم نے کیا خوبصورت تبصرہ کیا ہے اور اس کے مختلف مراحل کا کیا عجیب تجزیہ کیا ہے۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ دنیا کی اس زندگی کے پانچ مراحل ہیں وہ بھی اس کے لئے جسے طبعی زندگی کے پچاس ساٹھ سال مل جائیں پہلا مرحلہ لعب کا ہے یعنی بچپن کا دور ہے جو کھلونوں کا دور ہے، دوسرا مرحلہ لہو کا ہے یعنی کھیل تماشہ یہ لڑکپن کا دور ہے، جس میں سب سے بڑا شوق گھومنے پھرنے اور کھیل تماشے دیکھنے کا ہوتا ہے، تیسرا مرحلہ زینت کا ہے یعنی بننے سنورنے کا دور، نوجوانی کا دور جو میک اپ کا دور ہے، بیوٹی پارلر کا دور ہے اور کنگھی شیشے کا دور ہے، چوتھا مرحلہ ''تفاخر بینکم'' کا ہے یعنی زندگی کے باہمی مقابلہ کا دور، بھرپور جوانی کا دور اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا دور جس میں ریس ہی زندگی کا سب سے بڑا ہدف ہوتا ہے، زندگی کے وسائل حاصل کرنے، قوت حاصل کرنے، دولت میں اضافہ کرنے اور ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی فکر ہوتی ہے جبکہ زندگی کا پانچواں اور آخری دور قرآن کریم نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ''وَتَكَاثُرٌ بَيْنَكُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ'' ریس میں تھک جانے اور ریٹائر ہو جانے کے بعد اپنی کمائی کو شمار کرنے کا دور جس میں انسان اپنی اولاد اور اموال کو گن گن کر اور ایک دوسرے پر کثرت جتا کر خوش ہوتا رہتا ہے، بس یہی زندگی ہے، اسی کا نام دنیا ہے اور قرآن کریم اسے دھوکے کا سامان کہہ کر ہم سے یہ فرماتا ہے کہ اصل زندگی آگے کی ہے اور عقلمند انسان وہی ہے جو اس دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی کی بہتری کے لئے استعمال کرے۔

دوسرا سوال جس کی طرف میں توجہ دلانا چاہوں گا یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی کا اس آخرت کی زندگی کے ساتھ تناسب کیا ہے؟ دنیا کی زندگی اگر کسی کی لمبی بھی ہو گئی تو اسی نوے

سے آگے کیا بڑھے گی جبکہ قبر کی زندگی ہزاروں یا سینکڑوں سال کی ہو سکتی ہے، حشر کا پیریڈ پچاس ہزار سال کا ہے اور اس کے آگے توان لمیٹڈ زندگی ہے غیر محدود زندگی ہے پھر دنیا کی زندگی کے یہ ساٹھ ستر سال ہمیں اس دنیا میں ہی ساٹھ ستر سال نظر آتے ہیں آخرت کے مقابلہ میں اس کی حیثیت کا اندازہ قرآن کریم کے اس ارشاد کی روشنی میں کر لیں کہ ''وَاِنَّ یَوْماً عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ'' اور تیرے رب کا ایک دن ان ایک ہزار سال کی طرح ہے جو تم شمار کرتے ہو۔

اور اللہ تعالیٰ کے ایک ہزار سال والے ایک دن میں اپنے ان ساٹھ ستر سال کا حساب کر لو کہ کتنے بنتے ہیں اور اوران کا کیا تناسب ٹھرتا ہے، قرآن کریم نے اسے بھی ایک جگہ بیان فرمایا ہے کہ تمہیں دنیا میں یہ ساٹھ ستر اور اسی سال دکھائی دیتے ہیں لیکن جب آخرت میں جا کر پیچھے مڑ کر دیکھو گے کہ کتنا رہ کر آئے ہو تو خود تمہارا کہنا یہ ہو گا کہ ''كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا'' دنیا میں دن کا پہلا پہر یا پچھلا پہر رہ کر آئے ہیں، اس سے زیادہ اس زندگی کی کوئی حقیقت نہیں ہے اسی لئے بزرگان دین اور صوفیاء کرامؒ یہ فرماتے ہیں کہ دنیا کی زندگی کے لئے بھی اسباب فراہم کرو اور ضرور کرو لیکن صرف اتنے جتنا یہاں رہنا ہے لیکن جتنا عرصہ قبر میں رہنا ہے، حشر میں رہنا ہے اور اس سے آگے جانا ہے اس کے لئے بھی اسباب فراہم کرو، وسائل تلاش کرو اور اس کی تیاری کرو۔

سیدھی سی بات ہے مجھے کسی شہر میں تین دن رہنا ہے تو اس کے مطابق انتظام کروں گا ایک سال رہنا ہے تو اس کے لئے تین دن والی تیاری نہیں ہو گی اور اگر کہیں مستقل رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اس کے لئے ایک سال والے انتظامات کافی نہیں ہوں گے، ہمارے تبلیغی دوست جماعت کے ساتھ جاتے ہیں، سہ روزہ والوں کی تیاری اور ہوتی ہے، چلہ والوں کا بندوبست اس سے مختلف ہوتا ہے اور سال والوں کا اہتمام اس سے بھی مختلف ہوتا ہے یہ کامن سینس کی بات ہے اور اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

ان گزارشات کے بعد میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ سکول، کالج، اور یونیورسٹی کی تعلیم کی ضرورت سے ہمیں انکار نہیں ہے، ان اداروں میں جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں وہ ہماری ضرورت ہیں اور ہم ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے، انگلش اور مختلف دیگر زبانیں ہماری ضرورت ہے، لکھنا پڑھنا ہماری ضرورت ہے، حساب اور ریاضی ہماری ضرورت ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی ہماری ضرورت ہے، انجینیئرنگ اور میڈیکل سائنس ہماری ضرورت ہے، سوشیالوجی اور بیالوجی ہماری ضرورت ہے، ان میں سے کسی مضمون کی ضرورت و اہمیت سے کوئی عقلمند انکار نہیں کر سکتا اور ان علوم وفنون کو حاصل کیے بغیر ہم اپنی زندگی کو صحیح طریقے سے نہیں گزار سکتے لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ سارے علوم وفنون صرف اس دنیا کی زندگی کے لئے ہیں ان میں سے کوئی علم بھی اگلی زندگی میں ہمارے کام نہیں آئے گا، یہ سب کچھ اس وقت تک ہے جب تک سانس چل رہا ہے، سانس بند ہو جانے کے بعد ہمیں نہ سائنس کی ضرورت رہے گی، نہ ٹیکنالوجی کی کوئی اہمیت باقی رہے گی اور نہ ہی انجینئرنگ اور ریاضی ہمارے کام آئے گی وہاں صرف ایمان، نیک اعمال اور قرآن کریم کام آئے گا جن کی تعلیم یہ مدرسہ دیتا ہے۔

ایک چھوٹی سی بات سے اندازہ کر لیجئے، سانس ختم ہونے سے قبل مریض کے گرد ڈاکٹروں کا ہجوم ہوتا ہے، مشینیں لگی ہوتی ہیں اور زندگی بچانے کیلئے ہر ممکن اسباب اختیار کیے جاتے ہیں جو منع نہیں ہیں بلکہ زندگی کے تحفظ کے تمام ممکنہ اسباب و ذرائع اختیار کرنے کا شریعت نے حکم دیا ہے لیکن جونہی سانس ختم ہوا ڈاکٹر صاحبان وہاں سے اٹھ جاتے ہیں، مشینیں ہٹالی جاتی ہیں اور کہہ دیا جاتا ہے کہ ہمارا کام یہیں تک تھا اب ہمارا کام ختم ہوا، اب مولوی صاحب کو بلاؤ کہ ان کا کام اب شروع ہو گیا ہے۔

اس لئے ہم سکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم سے نہیں روکتے بلکہ اسے حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ آنے والی زندگی کے لئے بھی تیاری کرو جو

اصل اور دائمی زندگی ہے اور وہاں قرآن کریم کام آئے گا یا جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کام آئے گی، آخرت کی زندگی کی کامیابی کا مدار ایمان اور اعمال صالحہ پر ہے، وہاں اس کے ساتھ سفارش اور شفاعت بھی ہوگی اور قرآن کریم اور جناب نبی اکرم ﷺ کی شفاعت سب سے زیادہ مؤثر ہوگی۔

جناب نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ قیامت کے دن دو سفارشی سب سے زیادہ مضبوط سفارشی ہوں گے جو اصرار اور مان کے ساتھ سفارش کریں گے، قرآن کریم کی دو سورتوں کے بارے میں تو فرمایا کہ ''لجو جتان'' وہ دونوں جھگڑالو سورتیں ہیں اور اپنے پڑھنے والے کے لئے سفارش پر اللہ تعالیٰ سے ضد اور اصرار بھی کریں گی یہ ایسے ہی سمجھ لیں جیسے دنیا میں بھی کوئی مان والا سفارشی کہہ دیتا ہے کہ اب تو میں آ گیا ہوں کام کر کے ہی جاؤں گا، قرآن کریم کی یہ دو سورتیں بھی بڑے مان کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اصرار کریں گی کہ ہم تو اس شخص کو بخشوا کر ہی ہٹیں گی، یہ دو سورتیں قرآن کریم کی سب سے لمبی سورتیں ہیں سورۃ البقرۃ اور آل عمران لیکن جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق جھگڑالو سورتیں ہیں جن کا ترجمہ میں نے یہ کیا ہے کہ مان والی سورتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ سے اپنی سفارش منوا کر ہی ہٹیں گی جبکہ خود اپنے بارے میں جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں اس وقت تک سجدے میں پڑا رہوں گا اور سفارشیں کرتا رہوں گا جب تک میری امت کا آخری آدمی بھی جہنم سے نجات حاصل کر کے جنت میں نہیں چلا جائے گا۔

اس لئے قبر میں اور حشر کے دن ایمان کی ضرورت ہوگی، اعمال صالحہ کی ضرورت ہوگی اور قرآن کریم اور جناب نبی اکرم ﷺ کی شفاعت وسفارش کی ضرورت ہوگی، ان باتوں کی تعلیم یہ مدرسہ دیتا ہے اور ان کی تیاری صرف اس مدرسہ میں کرائی جاتی ہے جن افراد کا اور قوموں کا آخرت کی زندگی پر یقین نہیں ہے اور وہ اس دنیا کی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھے بیٹھے ہیں ان کے نزدیک دینی مدرسہ کی تعلیم کی اہمیت نہیں ہوگی لیکن جن کا آخرت

پر ایمان ہے قبر و حشر پر ایمان ہے اور جنت و دوزخ پر ایمان ہے وہ دینی مدرسہ کی اس تعلیم کے بغیر نہیں رہ سکتے، ان کے نزدیک اس تعلیم کی ضرورت سکول و کالج کی تعلیم سے کہیں زیادہ ہے اور وہ سکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے ساتھ دینی مدرسہ کی تعلیم کو بھی اپنی پریکٹیکل لائف کا لازمی حصہ سمجھتے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بات عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ دینی مدرسہ کی یہ تعلیم ہماری صرف آخرت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ دنیا کی بھی ضرورت ہے اور دنیا کی زندگی میں بھی ہم ان تعلیمات کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو یہ مدرسہ ہمیں فراہم کرتا ہے، ہماری دنیا کی زندگی کی وہ بیسیوں ضروریات ہیں جو دینی مدرسہ کی تعلیم پورا کرتی ہے ان میں سے مثال کے طور پر صرف ایک کا بات سمجھانے کیلئے ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

ہمارے معاشرے کی ایک عام سی شکایت ہے کہ گھروں میں سکون نہیں رہا، باہمی اعتماد اور بھروسہ کم ہوتا جا رہا ہے، جھگڑے اور تنازعات بڑھ رہے ہیں، رشتوں اور کاروبار میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی ہیں اور برکت ختم ہو کر رہ گئی ہے ہم نے اس کا ایک حل سوچ رکھا ہے کہ کسی نے کچھ کر دیا ہے، جادو ہو گیا ہے، کسی نے کالا علم کر دیا ہے، اور بند باندھ دیا ہے، شریکوں نے کچھ کیا ہے، پڑوسیوں نے کر دیا ہے، ہم یہ سوچ کر مولوی صاحب کے پاس بھاگتے ہیں کہ مولوی صاحب یہ دیکھو کہ کس نے کیا ہے اور کیا کر دیا ہے؟ اس کا کچھ علاج کرو، مولوی صاحب غریب کچھ نہ کچھ کرتا ہے، مجھے اس سے انکار نہیں کہ ہمارے گھروں میں یہ شکایات پائی جاتی ہیں اور کرنے والے کرتے بھی ہیں، ان کے اثرات بھی ہوتے ہیں اور ان کا علاج بھی ضرور ہونا چاہیے لیکن کیا یہ سب کچھ اسی وجہ سے ہو رہا ہے مجھے اس میں کلام ہے اور میں اس بات کو نہیں مانتا کہ یہ سارا کچھ کسی کے کرنے سے ہو رہا ہے، میرا خیال ہے کہ اصل بات کچھ اور ہے جس کی طرف ہماری توجہ نہیں ہے۔

تھوڑی دیر کیلئے غور فرمائیں کہ ہمارے گھروں میں اگر نماز کا ماحول ہو، قرآن کریم کی

تلاوت ہوتی ہو، اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہو، جناب نبی اکرم ﷺ پر درود پڑھا جاتا ہو اور نیکی کی باتیں ہوتی ہوں تو اس پر کوئی غیبی مخلوق آتی ہے یا نہیں؟ یقیناً فرشتے آتے ہیں اسی طرح ہمارے گھروں میں آج کل جو کچھ ہو رہا ہے، میں اس کی تفصیل میں نہیں جاتا، آپ بخوبی سمجھتے ہیں لیکن جو کچھ بھی ہوتا ہے کیا اس پر بھی کوئی غیبی مخلوق آتی ہے یا نہیں؟ یقیناً اس پر جنات آتے ہیں شیاطین آتے ہیں، اب دیکھیں کہ جو بھی آئے گا وہ اپنے اثرات چھوڑ کر جائے گا، فرشتے آئیں گے تو رحمت و برکت ہوگی، شیاطین آئیں گے تو نحوست اور بے برکتی ہوگی سوال یہ ہے کہ انہیں کون بھیجتا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ میں خود بلاتا ہوں، میں اپنے گھر کا ماحول فرشتوں والا بناؤں گا تو وہ آئیں گے اور جب وہ آئیں گے تو برکتیں اور رحمتیں ساتھ لے کر آئیں گے لیکن اگر میں نے اپنا گھر شیاطین اور جنات کی دلچسپی والا بنا رکھا ہے تو وہی آئیں گے اور اپنے اثرات لے کر آئیں گے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جنات اور شیاطین تو میرے گھر میں آئیں اور اپنے اثرات لے کر نہ آئیں اور پھر واپس جائیں تو اپنے اثرات میرے گھر میں چھوڑ کر نہ جائیں۔

میں ایک چھوٹی سی مثال سے بات سمجھانا چاہوں گا کہ اگر میرا گھر صاف ستھرا ہے، غسل خانہ اور نالیاں صاف ہیں، گھر کے صحن میں پھولوں کی کیاریاں ہیں اس پر تتلیاں آئیں گی، جگنو آئیں گے، بلبلیں آئیں گی لیکن اگر میرا گھر صاف نہیں ہے، نالیاں گندی ہیں اور غسل خانہ گندا ہے تو ظاہر بات ہے کہ مکھیاں آئیں گی، مچھر آئیں گے اور کاکروچ آئیں گے، سوال یہ ہے کہ یہ کس نے بھیجے ہیں کسی نے نہیں بھیجے بلکہ میں نے خود انہیں بلوایا ہے اس لئے کہ میں گھر میں تتلیوں اور جگنوؤں کا ماحول بناؤں گا تو وہ آئیں گے اور اگر مکھیوں اور مچھروں والا ماحول رکھوں گا تو وہی آئیں گے نہ تتلیاں اور جگنو کوئی بھیجتا ہے اور نہ ہی مچھر اور مکھیاں کسی کے بھیجنے سے آتے ہیں، میرا گھر مکھیوں، مچھروں اور کاکروچوں سے بھرا ہوا اور میں گھر کی صفائی کرنے کی بجائے پڑوسیوں کو کوستا رہوں کہ انہوں نے ان سب کو میرے گھر میں

دھکیل دیا ہے تو یہ بے وقوفی کی بات ہوگی مجھے ان سے نجات حاصل کرنے کیلئے گھر کی صفائی کرنا ہوگی اور گندگی کو باہر نکالنا ہوگا بلکہ اسی طرح اگر میں اپنے گھر کو نحوست اور بے برکتی سے پاک کرنا چاہتا ہوں تو مجھے جنات اور شیاطین کے ماحول سے نکلنا ہوگا اور فرشتوں کا ماحول پیدا کرنا ہوگا اس لئے کہ فرشتوں کا آنا جانا ہوگا تو رحمتیں نازل ہوں گی، برکتوں کا ڈیرہ ہوگا اور بے برکتی اور نحوستوں سے چھٹکارا حاصل ہوگا۔

فرشتوں کا ماحول ہمیں قرآن کریم کی تلاوت سے ملے گا، نماز سے ملے گا، اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ملے گا اور جناب نبی اکرم ﷺ پر درود کی کثرت سے ملے گا اور یہ باتیں ہمیں یہ دینی مدرسہ سکھاتا ہے اور ان کی تعلیم ہمیں اس مدرسہ سے ملتی ہے۔

اس لئے ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ دینی مدرسہ ہماری صرف آخرت کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا بلکہ دنیا کی ضروریات بھی پوری کرتا ہے اور اگر ہم دنیا کی اس زندگی میں سکون چاہتے ہیں، اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں، رحمت و برکت کا نزول چاہتے ہیں اور باہمی اعتماد و محبت کی زندگی کے طلبگار ہیں تو دینی مدارس کے ساتھ تعلق جوڑنا ہوگا، دینی مدارس قائم کرنا ہوں گے، انہیں آباد کرنا ہوگا اور ان کی تعلیمات سے استفادہ کرنا ہوگا، اللہ رب العزت ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

انسانی حقوق اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

''مجلس صوت الاسلام کے زیر اہتمام 7-8-9 مارچ 2011ء کو اسلام آباد میں منعقد ہونے والی سیرت کانفرنس سے خطاب''

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ اَجْمَعِيْنَ

امابعد!

آج کا دور انسانی حقوق کا دور کہلاتا ہے اور مغرب کا دعویٰ ہے کہ اس نے دنیا کو انسانی اقدار اور انسانی حقوق سے متعارف کیا اور نسل انسانی کے مختلف طبقات بالخصوص کمزور طبقوں کو حقوق کا شعور بخشا ہے۔ اس سے قبل انسانی معاشرہ جہالت، جبر، ظلم اور تشدد و بربریت کی ظلمتوں اور تاریکیوں کا شکار تھا اور مغرب نے اس تاریکی اور ظلمت سے نسل انسانی کو نجات دلا کر روشن خیالی اور علم کے نئے دور کا آغاز کیا ہے۔ مغرب کے معاشرتی اور ثقافتی انقلاب سے پہلے کا دور تاریکی، جبر اور جہالت کا دور تھا اور انقلاب فرانس کے بعد سے شروع ہونے والا دور روشنی، انصاف اور علم کا دور ہے۔ مغرب اس دعوے کے ساتھ پوری دنیا کو مسخر کرنے میں مصروف ہے اور نسل انسانی کی مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں کو اپنی ہمہ گیر یلغار کا نشانہ بنائے ہوئے ہے۔ آج کی محفل میں ہم مغرب کے اس دعوے کا ایک نظر میں جائزہ لینا چاہتے ہیں اور یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مغرب، دنیا کو تہذیب وثقافت اور انسانی حقوق سے متعارف کرانے کے اس دعوے میں کہاں تک صداقت رکھتا ہے؟

جہاں تک مغربی ممالک کے اپنے پس منظر کا تعلق ہے، یہ بات تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ یورپ میں بادشاہت، جاگیرداری اور پاپائیت کی تکون نے صدیوں تک عام انسانی آبادی کو انسانی عزت ووقار اور بنیادی حقوق سے محروم کیے رکھا ہے۔ اس دور میں مغربی معاشرہ میں انسانی شرف اور شہری حقوق کا تصور کرنا بھی جرم سمجھا جاتا تھا اور عام انسان کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر دکھائی دیتی تھی، چنانچہ اس تکون کے خلاف عوامی بغاوت کے شعلے بھڑکے تو بادشاہت، جاگیرداری اور پاپائیت کے تینوں اداروں کو پسپائی کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے خلاف نفرت کی بنیاد پر جس انقلاب نے مغربی معاشرے کو اپنے دامن میں سمیٹا، اس نے بادشاہت، جاگیرداری اور پاپائیت کو کارنر ہونے پر مجبور کر دیا۔ صدیوں کو محیط اس زمانے میں، جسے تاریک صدیوں (Dark Ages) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اگر عام آدمی کی زندگی اور اس کی بے بسی اور مجبوری کو دیکھا جائے تو ان میں کسی ایک کا نام لینے پر بھی مغربی باشندوں پر اضطراب اور بے چینی کی جو کیفیت دکھائی دینے لگتی ہے، اس کی وجہ سمجھنا مشکل نہیں ہے اور اس حوالے سے مغربی دنیا کا ماضی بلاشبہ قابل رحم ہے، لیکن کیا باقی دنیا کا پس منظر بھی یہی تھا اور بالخصوص عالم اسلام کی صورت حال بھی کیا اسی طرح کی تھی جسے مغرب تاریک دور قرار دے کر اپنے رد عمل کی لاٹھی سے اسے بھی ہانکنا چاہتا ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ تاریخ اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں دیتی اور اس پہلو سے دیکھا جائے تو مغرب کا یہ طرز عمل سراسر دھاندلی نظر آنے لگتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص پس منظر کو پوری دنیا کا پس منظر قرار دے کر اس کے رد عمل میں اپنے اقدامات کو پوری دنیا پر مسلط کرنے کے درپے ہے اور خاص طور پر امت مسلمہ کا گزشتہ ڈیڑھ ہزار سالہ دور تو قطعی طور پر اس سے مختلف بلکہ متضاد ہے۔

اس موضوع پر بات کو آگے بڑھانے سے قبل ایک اور پہلو کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ مغرب کو چونکہ تاریک صدیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اور شدید کرب ومجبوری کے طویل

دور سے گزرنا پڑا ہے، اس لیے اس کا ردعمل بھی انتہائی شدید ہے جس میں وہ اعتدال اور توازن کا دامن ہاتھ میں نہیں رکھ سکا اور جبر کے مقابلے میں آزادی کی اس انتہا تک نسل انسانی کے ایک بڑے حصے کو لے جا کر اب پچھتانے پر مجبور نظر آتا ہے جس انتہا نے انسانی معاشرے کی بنیادی اقدار کو بھی پامال کر کے رکھ دیا ہے اور فرد کی آزادی اور انڈوجول ازم (Individualism) کے ہاتھوں خاندانی سسٹم کی تباہی مغربی معاشرے کا المیہ بن کر رہ گئی ہے۔ جبکہ اس سے ایک ہزار سال قبل اسلام نے جبر و ظلم اور وحشت و بربریت کی نفی کرتے ہوئے انسانی معاشرے کے ہر طبقے اور ہر فرد کو اس کے جائز حقوق سے نہ صرف روشناس کرایا بلکہ عملاً وہ حقوق حق داروں کو دے کر اس کا عملی نمونہ بھی پیش کر دیا۔

مثال کے طور پر عورت کے حقوق کو ہی دیکھ لیجیے کہ جاہلیت کے دور میں عورت پر ہونے والے مظالم کا سدباب کر کے اسلام نے اسے انصاف اور حقوق سے بہرہ ور کیا لیکن خاندانی نظام کے ناگزیر تقاضوں کو کراس کرنے کی بجائے مرد اور عورت دونوں کو اس فطری دائرے میں رکھتے ہوئے خاندانی نظام کا تحفظ بھی کیا۔ اس سلسلے میں دور نبوی کے دو واقعات کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا جو امام بخاری نے بخاری شریف میں روایت کیے ہیں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم قریش کے لوگ جاہلیت کے دور میں عورت کو کسی معاملے میں رائے کا حق نہیں دیتے تھے۔ مگر جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو انصار کی عورتوں میں رائے دینے اور کسی بات پر خاوند کو ٹوک دینے کا ماحول پایا جاتا تھا جس سے ہماری عورتوں نے بھی رنگ پکڑا۔ ایک روز کسی بات پر میری بیوی نے مجھے ٹوک دیا تو مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے اسے ڈانٹ دیا کہ تم عورتوں کا ان کاموں میں کیا دخل ہے؟ اس نے مجھ سے کہا کہ مجھ پر ناراض ہونے کی بجائے اپنی بیٹی کی خبر لو کہ وہ بھی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سوال جواب کرتی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم کی ازواج مطہرات میں عام طور پر ایسا ہوتا رہتا ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں فوری طور پر اپنی بیٹی حفصہؓ کے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ کیا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں کسی بات پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روک ٹوک کرتی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں، اس طرح ہوتا ہے اور بسا اوقات بطور میاں بیوی ہمارے درمیان ناراضگی بھی ہو جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ میں نے حفصہ کو سختی سے منع کیا کہ کم از کم تم تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس طرح نہ کیا کرو۔ جو ضرورت ہو، مجھ سے کہہ دیا کرو مگر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی سوال جواب نہ کیا کرو۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ حفصہؓ سے بات کرنے کے بعد میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور زوجہ محترمہ ام المومنین ام سلمہؓ کے پاس گیا جو رشتے میں حضرت عمرؓ کی کزن لگتی تھیں۔ ان سے بھی وہی بات کی تو ام المومنین ام سلمہؓ نے ناراضگی کا اظہار کیا اور الٹا حضرت عمرؓ کو ڈانٹ دیا کہ آپ ہر معاملے میں مداخلت کرتے ہیں اور اب میاں بیوی کے معاملات میں بھی دخل اندازی کے لیے آگئے ہیں! حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ام سلمہ کی بات سن کر میرا حوصلہ ٹوٹ گیا اور میں کسی اور سے بات کرنے کی بجائے سیدھا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور سارے واقعے کی رپورٹ دی۔ جب میں نے ام سلمہؓ کی بات کا ذکر کیا تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا کہ "ہی ام سلمۃ" وہ آخر ام سلمہ ہے۔ یہ واقعہ بیان کر کے حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم جاہلیت کے دور میں عورتوں کو کسی درجے میں شمار نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ان کا کوئی حق سمجھتے تھے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر ہمیں عورت کے مقام و مرتبہ اور حقوق سے آگاہ کیا اور ہم نے عورتوں کو اہمیت دینا شروع کیا۔

اس کے ساتھ بخاری شریف میں مذکورہ ایک اور واقعہ پر نظر ڈال لیجیے کہ بریرہؓ نامی ایک صحابیہ جو لونڈی تھی اور مغیث نامی نوجوان کے نکاح میں تھی، اس لونڈی کو حضرت عائشہؓ

نے خرید کر آزاد کر دیا تو آزاد ہونے کے بعد اس عورت نے اپنا ایک حق استعمال کرتے ہوئے مغیثؓ کی بیوی کے طور پر اس کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا۔ مغیثؓ بہت پریشان ہوئے اور مختلف لوگوں سے سفارشیں کروائیں مگر بریرہؓ نے کسی کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن مدینہ منورہ کی گلیوں میں مغیثؓ کو گھومتے دیکھا کہ وہ باقاعدہ روتے ہوئے جارہے ہیں اور یہ آوازیں دے رہے ہیں کہ کوئی ہے جو بریرہؓ کو منادے اور وہ مجھ سے الگ نہ ہو! یہ کیفیت دیکھ کر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بریرہؓ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اس سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر سکتی ہے؟ بریرہؓ نے صرف اتنا پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ مجھے حکم دے رہے ہیں یا بطور مشورہ یہ بات فرما رہے ہیں؟ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری یہ بات حکم نہیں بلکہ صرف مشورہ ہے تو بریرہؓ نے بے ساختہ کہہ دیا کہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ وہ مغیثؓ کے پاس واپس نہیں گئیں اور آزادی کے بعد حاصل ہونے والا اپنا حق پوری آزادی کے ساتھ استعمال کیا۔

یہ دو واقعات میں نے اس لیے عرض کیے ہیں کہ عورت کے حقوق کا تصور مغربی دنیا نے شروع نہیں کیا بلکہ اس سے بارہ سو سال قبل جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے حقوق اور ظلم و جبر سے اس کی آزادی کی بات کی اور معاشرے میں عورت کی عزت و وقار کو بحال کیا۔ عورت کے حقوق اور آزادی کے حوالے سے اس نوعیت کے بیسیوں واقعات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جو دور نبوی اور خلافت راشدہ کے دور میں پیش آئے جن کی تفصیلات کا موقع نہیں ہے، مگر یہ بات تاریخی طور پر طے شدہ ہے کہ معاشرے کے پسے ہوئے طبقات اور عام شہریوں کے حقوق اور ان کی بنیادی ضروریات کی بات مغرب کے معاشرتی انقلاب سے صدیوں پہلے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی اور عورتوں، غلاموں، بچوں اور ماتحتوں کے حقوق کی نشان دہی کر کے ان کی ادائیگی اور بحالی کو اسلام

کے عادلانہ نظام کا حصہ بنا دیا۔

انسانی اور شہری حقوق کے حوالے سے مغرب کے اس یک طرفہ دعوے کا چند اور حوالوں سے بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

☆...... حکومت کا قیام جبر کی بجائے عوام کی رائے پر ہو، اس کا عملی نمونہ سب سے پہلے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا کہ اپنا جانشین نامزد کرنے کی بجائے امت کی اجتماعی رائے پر اعتماد کیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مدینہ منورہ کے لوگوں نے عوامی بحث و مباحثہ کے ذریعے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ اول کے طور پر منتخب کیا۔

☆...... حاکم وقت کے رائے عامہ کے سامنے جواب دہ ہونے کا تصور بھی اسلام نے دیا کہ خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبے میں عوام کو یہ حق دینے کا اعلان کیا کہ اگر میں صحیح طریقے سے حکومت کروں تو میرا ساتھ دو اور اگر غلط رخ پر چلنے لگوں تو مجھے پکڑ کر سیدھا کر دو۔ چنانچہ دنیا نے یہ مناظر دیکھے کہ حضرت عمرؓ جیسے بارعب حکمران کو بھی ایک عام آدمی خطبہ جمعہ کے دوران ٹوک دیا کرتا تھا۔

☆...... شخصی حکومت کی بجائے دلیل اور قانون کی حکومت کا تصور بھی ہمیں خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ صدیق کے اس اعلان میں ملتا ہے کہ میں قرآن وسنت کے مطابق حکومت کروں گا۔ اگر میں اس دستور و قانون کا پابند رہوں تو تم پر میری اطاعت واجب ہے اور اگر میں قرآن وسنت کی خلاف ورزی کروں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں ہے۔ شخصی حکمرانی کی بجائے قانون اور دستور کی حکمرانی کے لیے حضرت ابوبکرؓ کا یہ تاریخی اعلان اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام دلیل اور قانون کی حکمرانی کا قائل ہے اور مغرب میں دستوری حکومتوں کا آغاز ہونے سے ایک ہزار سال قبل دنیا نے اس کا مشاہدہ کیا۔

☆...... قانون کے سامنے سب کے برابر ہونے اور حکمرانوں کے عدالتی نظام کا پابند ہونے

کی بات بھی بڑے فخر کے ساتھ ذکر کی جاتی ہے. مگر یہ خوشگوار منظر بھی تاریخ کم و بیش ڈیڑھ ہزار سال قبل دیکھ چکی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ امیر المومنین ہونے کے باوجود قاضی شریح کی عدالت میں ایک فریق کے طور پر پیش ہیں اور گواہی مکمل نہ ہونے کی وجہ سے مقدمہ ہار گئے ہیں۔

☆...... حکمرانوں اور عوام کے مل کر رہنے اور ان کے معیار زندگی میں یکسانیت کی بات بھی کی جاتی ہے اور اس سلسلے میں اسلامی خلافت کو سبقت حاصل ہے کہ خلیفہ منتخب ہونے کے بعد جب بیت المال سے حضرت ابوبکرؓ کا وظیفہ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو یہ طے پایا کہ مدینہ منورہ کے ایک متوسط شہری کے معیار زندگی کو سامنے رکھ کر ان کا وظیفہ مقرر کیا جائے. چنانچہ انھوں نے پوری خلافت کے دوران اسی وظیفے پر گزارا کیا، جبکہ حضرت عمرؓ نے خلافت سنبھالتے ہی اعلان کیا کہ ان کا کوئی افسر باریک لباس نہیں پہنے گا. چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھائے گا، ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوگا اور گھر کے دروازے پر ڈیوڑھی نہیں بنائے گا۔ یہ باتیں اس دور میں معاشرتی امتیاز کی علامت اور اسٹیٹس سمبل سمجھی جاتی تھیں اور حضرت عمرؓ نے یہ اعلان کر کے اصول بنا دیا کہ ایک اسلامی ریاست کے حکمران عام شہریوں سے امتیاز رکھنے والا معیار زندگی اختیار نہیں کریں گے اور عام لوگوں جیسی زندگی گزاریں گے۔

یہ چند مثالیں اس لیے میں نے عرض کی ہیں کہ مغرب کا یہ کہنا کہ انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کے تصور کا آغاز وہاں سے ہوا ہے، اسے مغربی ممالک کی حد تک تسلیم کیا جا سکتا ہے، لیکن دنیا کی باقی اقوام بالخصوص عالم اسلام پر اس پس منظر کا اطلاق کرنا اور تاریک صدیوں کے رد عمل میں تشکیل پانے والے مغربی فلسفے کو عالم اسلام پر مسلط کرنے کی مہم سراسر ناانصافی ہے. اس لیے کہ اسلام اس سے بہت پہلے سے انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کی بات کر رہا ہے، حتیٰ کہ امت مسلمہ کی تاریخ میں جن حکمرانوں کو خلافت کی بجائے

ملوکیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ان کے ادوار حکومت میں بھی عوام کو ان کے حقوق عام طور پر حاصل رہے ہیں۔ بالخصوص عدلیہ کا آزادانہ کردار تو بدنام ترین مسلم حکمرانوں کے دور میں بھی پورے وقار اور اعتماد کے ساتھ جاری رہا ہے اور انقلاب فرانس سے پہلے مغربی معاشرے میں عورتوں، مزدوروں، کسانوں اور عام شہریوں کو جس اندوہ ناک صورت حال کا صدیوں تک سامنا رہا ہے، وہ صورت حال مسلم خلافت کے کسی دور میں اس درجے میں نظر نہیں آتی۔ پھر یہ امتیاز بھی اسلامی تاریخ کا حصہ ہے کہ ملت اسلامیہ میں مذہبی قیادت کا ادارہ بحیثیت ادارہ ہمیشہ عوام کے ساتھ رہا ہے اور ظلم و جبر کے خلاف مسلم علماء کی قربانیاں تاریخ کے ایک اہم باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس لیے مغرب کی تاریک صدیوں کے حوالے سے مغرب کے پس منظر اور ردعمل کو مغرب کی حد تک تسلیم کرتے ہوئے ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مغرب کے پس منظر کو عالم اسلام کے ساتھ نتھی نہ کیا جائے اور اس کا ردعمل مسلم امہ پر مسلط کرنے کی روش پر نظر ثانی کی جائے، کیونکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے مغرب کے انقلاب سے بارہ سو سال قبل نسل انسانی کو حقوق، انصاف اور علم کی شاہراہ پر گامزن کر دیا تھا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

انسانی حقوق کا مغربی فلسفہ اور
اسلامی تعلیمات

24 مارچ 2011ء کو جامعہ عثمانیہ آسٹریلیا مسجد بالمقابل ریلوے سٹیشن لاہور میں پاکستان شریعت کونسل کے زیر اہتمام ”انسانی حقوق کا مغربی فلسفہ اور اسلامی تعلیمات“ کے عنوان پر منعقد کیے جانے والے کورس کی اختتامی نشست سے خطاب جس میں شریک ہونے والے حضرات کو شیلڈ تقسیم کی گئیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

میں جامعہ عثمانیہ کے منتظمین مولانا حافظ محمد سلیم صاحب، مولانا شاہد خان اور ان کے رفقاء بالخصوص اپنے پرانے بزرگ دوست مولانا عبد الرؤف ملک (فاضل نصرۃ العلوم) کا شکر گزار ہوں جن کی وجہ سے آپ دوستوں کے ساتھ مختلف نشستوں میں انسانی حقوق اور اسلامی تعلیمات کے عنوان پر کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا۔

گزشتہ سات نشستوں میں ہم نے انسانی حقوق کے حوالہ سے جن پہلوؤں پر بات کی ہے ان میں انسانی حقوق کا مغربی فلسفہ، انسانی حقوق کا اسلامی فلسفہ، انسانی حقوق کا بین الاقوامی چارٹر، اسلامی احکام وقوانین پر انسانی حقوق کے حوالہ سے اعتراضات کا پس

منظر، موجودہ عالمی تہذیبی کشمکش میں اسلامی شریعت اور مغرب کے فلسفہ، انسانی حقوق کے درمیان محاذ آرائی کے مختلف محاذ اور قادیانیت، تحفظ ناموس رسالت ﷺ، خاندانی نظام، آزادی رائے اور مذہبی آزادی کے بارے میں مغربی لابیوں کی یلغار کے عنوانات بطور خاص قابل ذکر ہیں جبکہ آج کی نشست میں جو اس موضوع پر ہماری اس سلسلہ کی آخری نشست ہے. اسلامی تعلیمات اور سنت نبوی ﷺ میں انسانی حقوق کی پاسداری کے حوالہ سے کچھ واقعات عرض کرنا چاہوں گا تاکہ مغرب کے اس پروپیگنڈہ اور عنوان کی حقیقت واضح ہو سکے کہ دنیا کو اس نے حقوق کا شعور عطا کیا ہے اور انسانی حقوق کی پاسداری کا دور مغرب کے تہذیبی انقلاب سے شروع ہوا ہے۔

حالانکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ انسانی سوسائٹی میں انسانی حقوق کے شعور اور ان حقوق کی عملداری کا علم چودہ صدیاں قبل اسلام نے سربلند کیا تھا اور جناب نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات اس سلسلہ میں بنیادی سرچشمے کی حیثیت رکھتی ہیں، اس موضوع پر تفصیلی گفتگو اور طویل مباحثہ کی بجائے چند واقعاتی شہادتوں کی طرف اشارہ کروں گا کیونکہ اس سے زیادہ کے لئے وقت متحمل نہیں ہے جبکہ ہر پہلو تفصیل کے ساتھ گفتگو کا متقاضی ہے۔

مثلاً بچوں کے حقوق کے سلسلہ میں دیکھئے کہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم ﷺ ایک بار مجلس میں تشریف فرما تھے، آپ کے دائیں جانب حضرت عبد اللہ بن عباسؓ بیٹھے تھے جو اس وقت تیرہ چودہ سال کے لڑکے تھے جبکہ بائیں جانب حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دوسرے بزرگ خالد بن ولیدؓ اور صحابہ کرامؓ مجلس میں تھے، کسی صاحب نے اس دوران جناب نبی اکرم ﷺ کو مشروب پیش کیا جو آپ ﷺ نے نوش فرمایا اور چند گھونٹ پیالے میں بچ گئے، نبی اکرم ﷺ کی خواہش یہ پیالہ بائیں طرف حضرت ابوبکرؓ کو دینے کی تھی مگر حق دائیں طرف عبد اللہ بن عباسؓ کا بنتا تھا، جناب نبی اکرم ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے باقاعدہ دریافت کیا کہ اگر تمہاری اجازت ہو تو

یہ پیالہ بائیں طرف دے دوں؟ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے کہہ کر اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ میں آپ ﷺ کے تبرک کے بارے میں کسی کو اپنے اوپر ترجیح نہیں دیتا، بخاری شریف کی روایت کے مطابق اس پر جناب نبی اکرم ﷺ نے قدرے ناگواری کے ساتھ ''فتله فی یدہ'' زور سے پیالہ عبد اللہ بن عباسؓ کے ہاتھ میں تھما دیا یعنی عبد اللہ بن عباسؓ کے انکار پر اگرچہ نبی اکرم ﷺ کو قدرے ناگواری ہوئی مگر اس کے باوجود پیالہ اسی کو دیا جس کا حق بنتا تھا۔

اسی طرح عورتوں کے حقوق کی بات کی جاتی ہے اور اکثر اوقات یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام عورت کو رائے کا حق نہیں دیتا اور اظہار رائے کی آزادی نہیں دیتا، اس عنوان سے اسلام کے خلاف ایک عرصہ سے مسلسل پروپیگنڈہ جاری ہے جبکہ حقائق یہ ہیں کہ مجھ سے بعض دوست پوچھتے ہیں کہ کیا اسلام عورت کو رائے کا حق دیتا ہے؟ تو میں عرض کرتا ہوں کہ اسلام عورت کو صرف رائے کا نہیں بلکہ مجادلہ کا حق دیتا ہے اور ''المجادلة'' کے نام سے قران کریم کی ایک پوری سورت اس کی گواہ ہے، عورت کا مزاج ونفسیات یہ ہے کہ وہ صرف رائے پیش نہیں کرتی بلکہ اس کے لئے مجادلہ بھی کرتی ہے اس لئے اس کے ساتھ قرآن کریم نے مجادلہ کا ذکر کیا ہے کہ ایک عورت نے مجادلہ کیا اور مجادلہ بھی جناب نبی اکرم ﷺ سے کیا، اللہ تعالیٰ نے اس کی بات سنی اور اسی کے حق میں قرآن کریم میں فیصلہ صادر کر دیا۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم جاہلیت کے دور میں عورتوں کو کوئی مقام وحیثیت نہیں دیتے تھے بلکہ انہیں کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے اور اس بات کا ہمارے ہاں تصور بھی نہیں تھا کہ عورت اپنے خاوند یا باپ کو کسی بات پر ٹوک سکتی ہے، جب اسلام آیا تو ہمیں پتہ چلا کہ معاشرہ میں عورتوں کی بھی ایک حیثیت ہے اور انہیں بھی رائے دینے کا حق حاصل ہے۔

حضرت عمرؓ اسی روایت میں فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں ایک روز میں نے گھر

میں کوئی بات کی تو میری بیوی نے مجھے ٹوک دیا جس پر مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے اسے ڈانٹ دیا کہ تمہارا کیا کام ہے کہ تم میرے معاملات میں روک ٹوک کرو اور کوئی رائے دو، اس نے کہا کہ مجھے ڈانٹنے کی بجائے اپنی بیٹی حفصہؓ کی خبر لو کہ جناب نبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات بھی گھر میں روک ٹوک کرتی ہیں اور بعض معاملات پر ناراضگی کا اظہار بھی کرتی ہیں، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں یہ سن کر فوراً اٹھا اور سیدھا ام المومنین حضرت حفصہؓ کے گھر گیا جو حضرت عمرؓ کی بیٹی اور جناب نبی اکرمؐ کی زوجہ محترمہ تھیں، ان سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ہاں ہمارے گھر میں میاں بیوی کے درمیان روک ٹوک ہوتی ہے اور ہم آپس میں کبھی ناراضگی کا اظہار بھی کر لیا کرتے ہیں جیسا عام طور پر میاں بیوی میں ہو جایا کرتا ہے، حضرت عمرؓ نے حضرت حفصہؓ کو ڈانٹا کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے ساتھ روک ٹوک اور ناراضگی کا معاملہ مت کیا کرو، جس چیز کی ضرورت ہو مجھے بتا دیا کرو مگر نبی اکرم ﷺ کو ناراض مت کرو، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں حفصہؓ کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے پھر اُم المومنین حضرت ام سلمہؓ کے گھر گیا اور ان سے بات کی وہ حضرت عمرؓ کی کزن تھیں انہوں نے الٹا حضرت عمرؓ کو ڈانٹ دیا اور کہا کہ آپ ہمارے معاملہ میں دخل دیتے ہیں اور اب میاں بیوی کے معاملہ میں بھی دخل دینے آ گئے ہیں، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ''فکسرتنی'' اس نے تو میرا حوصلہ ہی توڑ دیا۔

اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا قصہ سنا دیا وہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے حضرت ام سلمہؓ کا ذکر کیا تو ''فتبسم وقال هي ام سلمة'' جناب نبی اکرم ﷺ مسکرائے اور فرمایا کہ ''وہ اُم سلمہؓ ہے۔''

اس واقعہ کے ساتھ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اب مجھے پتہ چلا کہ عورت کی بھی رائے ہوتی ہے اور اس کا مقام و مرتبہ اور اس کی کوئی معاشرتی حیثیت ہے۔

حضرت بریرہؓ کا واقعہ بھی مشہور ہے جو امام بخاریؒ نے مختلف حوالوں سے بیان کیا

ہے اور حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ''حدیث بریرہؓ'' سے فقہاء نے سینکڑوں مسائل مستنبط کیے ہیں، وہ لونڈی تھیں مگر جب حضرت عائشہؓ کی مہربانی سے آزاد ہوئیں تو انہیں ''خیارِ عتق'' حاصل ہو گیا کہ وہ اپنے خاوند حضرت مغیثؓ کے نکاح میں رہنا چاہتی ہیں یا نہیں؟ اور اگر وہ ان کے نکاح میں نہیں رہنا چاہتیں تو انہیں الگ ہونے کا حق حاصل ہے، یہ حق استعمال کرتے ہوئے انہوں نے اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کر لی جس پر حضرت مغیثؓ بہت پریشان ہو گئے، انہوں نے بریرہؓ کی بہت منت سماجت کی کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لے مگر وہ تیار نہ ہوئی، ایک دن جناب نبی اکرم ﷺ نے دیکھا کہ مغیثؓ مدینہ منورہ کی گلیوں میں گھوم رہے ہیں، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ''کوئی ہے جو بریرہؓ کو منا دے؟'' یہ کیفیت دیکھ کر جناب نبی اکرم ﷺ نے خود بریرہؓ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور بریرہؓ کو بلا کر فرمایا کہ مغیثؓ بہت ہی پریشان ہے کیا تم اپنا فیصلہ واپس نہیں لے سکتی؟ بریرہؓ نے صرف اتنا پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ؟ سمجھدار لڑکی تھی یہ سمجھتی تھی کہ حکم کی صورت میں تو کسی مسلمان کی مجال نہیں ہے کہ وہ جناب نبی اکرم ﷺ کے حکم سے سرتابی کر سکے اس لئے اس نے پوچھ لیا لیکن جب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ حکم نہیں ہے بلکہ صرف مشورہ ہے تو اس نے بے ساختہ جواب دیا کہ ''لا حاجۃ لی بہا'' مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہاں خیال فرمائیے کہ ایک آزاد شدہ لونڈی ہے مگر اپنا حق ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ نے اس کے بعد نہ اسے دوسری بار فرمایا اور نہ ہی کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار کیا۔

یہ واقعات میں نے اس لئے عرض کئے ہیں کہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ نسل انسانی و حقوق کا شعور اسلام نے دیا اور آسمانی تعلیمات نے انسان کو بتایا کہ اس کے ذمہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کیا ہیں اور جن انسانوں کے ساتھ وہ زندگی گزار رہا ہے اس کے ذمہ ان کے حقوق کیا ہیں؟ محنت کشوں اور مزدوروں کے بارے میں دیکھ لیجیے، اس زمانہ میں غلام

ہوتے تھے جو اب نہیں رہے لیکن ہاری، مزدور، انسان، پانڈی اور دوسرے نوکر ہمارے معاشرہ میں وہی درجہ رکھتے ہیں اور جناب نبی اکرم ﷺ نے ان کے ساتھ مہربانی اور حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔

حضرت ابو مسعود انصاریؓ کی ایک لونڈی ان کی بکریاں چرا رہی تھی کہ اس کی غفلت کی وجہ سے ایک بھیڑیا اس کے ریوڑ سے ایک بکری لے گیا، حضرت ابو مسعودؓ نے اسے غصہ میں تھپڑ مار دیا، جناب نبی اکرم ﷺ دیکھ رہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے ابو مسعودؓ، اللہ تعالیٰ تم پر اس سے کہیں قدرت رکھتا ہے، جتنا تم اس لونڈی پر طاقت رکھتے ہو، حضرت ابو مسعودؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کیا میں اسے اس زیادتی کے کفارے میں آزاد نہ کر دوں؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اسے آزاد نہیں کرو گے تو ''لَلَفَحَتكَ النَّارُ'' آگ تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لے گی، چنانچہ ابو مسعودؓ نے اس لونڈی کو آزاد کر دیا۔

اس طرح حضرت ابو ذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ جو تمہارے غلام اور ماتحت لوگ ہیں یہ بھی تمہارے بھائی ہیں، یہ تقدیر سے تمہارے ماتحت ہو گئے ہیں، اس لئے کسی شخص کے ہاتھ میں یعنی اس کے ماتحت کوئی نوکر، خادم یا غلام ہو تو اسے وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے، وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے اور اس کے ذمہ کوئی ایسا کام نہ لگائے جو اس کی ہمت سے زیادہ ہو اور اگر کوئی ایسا کام اس کے ذمہ لگا دیا ہے تو خود اس کی معاونت کرے۔

بیسیوں ارشادات میں جناب نبی اکرم ﷺ نے ماتحتوں اور غلاموں کے بارے میں حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور ان کے حقوق بیان فرمائے ہیں جن میں سے صرف ایک دو کا ذکر کر سکا ہوں، میری گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ انسانی حقوق کے بارے میں جناب نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات اور اسلامی احکام و قوانین مغرب میں انسانی حقوق کی طرف پیش

رفت سے کم از کم بارہ سو سال قبل انسانی سوسائٹی میں اپنی عملداری قائم کر چکے تھے، مگر مغرب اس کو نظر انداز کر کے خود اس بات کے لئے چیمپئن بننے کی کوشش کر رہا ہے کہ اس نے نسل انسانی کو حقوق کا شعور بخشا ہے اور حقوق انسانی کے دور کا آغاز کیا ہے۔

اس سلسلہ میں علماء کرام، خطباء و ائمہ اور مدرسین و اساتذہ سے میں بطور خاص عرض کروں گا کہ وہ اپنے شاندار ماضی سے واقفیت حاصل کریں، خلافت راشدہ کے نظام اور روایات کا بطور خاص مطالعہ کریں، اور آج کے حالات و مسائل اور ضروریات و مشکلات کو سامنے رکھ کر قرآن و سنت سے ان کے لئے راہ نمائی تلاش کریں اور قرآن و سنت کی روشنی میں نسل انسانی کی راہ نمائی کریں، میں پورے اعتماد اور شرح صدر کے ساتھ کہتا ہوں کہ قرآن و سنت اور خلافت راشدہ کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں آج کے کسی انفرادی یا اجتماعی مسئلہ کا حل تلاش کرنے میں مایوسی نہیں ہوگی، تھوڑی دماغ سوزی اور جگر سوزی کرنا پڑے گی اور ہر مسئلہ کا حل مل جائے گا۔

ہم نے آج کے مسائل کا حل یہ سمجھا ہوا ہے کہ انہیں نظر انداز کر دیا جائے اور آنکھیں بند کرتے ہوئے ان کے پاس سے گزر جایا جائے، یہ حل نہیں بلکہ فرار ہے اسلام فرار کی اجازت نہیں دیتا بلکہ مسائل کا سامنا کرنے اور انہیں حل کرنے کی ہدایت دیتا ہے جس کی ذمہ داری سب سے زیادہ علماء کرام بالخصوص دینی مدارس کے اساتذہ پر عائد ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح رخ پر کام کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اسلامی معیشت

''23 مئی 2102ء کو جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن نارتھ کراچی میں تخصص فی الفقہ کی کلاس سے خطاب کا خلاصہ''

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

آپ کے ساتھ آج کی گفتگو کے لئے ''اسلامی معیشت'' کے عنوان کے بارے میں مشاورت ہوئی ہے لیکن وقت چونکہ مختصر ہے اور صرف ایک ہی نشست کی گنجائش ہے اس لئے میں نے صرف تعارفی گفتگو کا ارادہ کیا ہے اور آپ حضرات سے اس حوالہ سے کچھ عرض کرنا چاہوں گا کہ قرآن کریم اور حدیث وسنت میں زندگی کے دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ معاشیات پر بھی بات کی گئی ہے، قرآن کریم نے سینکڑوں آیات مقدسہ میں معاشیات کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کیا ہے، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سینکڑوں احادیث میں معیشت کے مختلف شعبوں کے بارے میں ہدایات دی ہیں اور حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کے بیسیوں فیصلوں میں معیشت کے مسائل واحکام کو واضح کیا گیا ہے اور جس طرح نماز، روزہ، حج اور دیگر احکام ومسائل کے ہر پہلو کی وضاحت قرآن وسنت میں موجود ہے اسی طرح انفرادی واجتماعی معیشت کے ہر پہلو کے بارے میں بھی واضح ہدایات قرآن وسنت اور خلفاء راشدینؓ کے فیصلوں میں موجود ہیں اور امت کے ہر دور

میں علماء فقہاء نے ان کی روشنی میں امت مسلمہ کی فقہی وقانونی راہ نمائی کی ہے۔

اس موضوع کا ذوق اور اس سے دلچسپی رکھنے والے علماء کرام اور دانشوروں کے لئے عرض کر رہا ہوں کہ میرے طالب علمانہ مطالعہ میں قدیم اور جدید دور میں اس موضوع پر باقاعدہ لکھی گئی کتابوں میں چار پانچ کتابیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور علماء وطلبہ کے لئے ان کا مطالعہ ضروری ہے:

(1) امام ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج (2) امام محمدؒ کی کتاب الکسب (3) امام ابو عبید قاسم بن سلامؒ کی کتاب الاموال (4) اردو میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی "اسلامی معاشیات" (5) حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ کی "اسلام کا اقتصادی نظام"۔

معیشت واقتصادیات کا ذوق رکھنے والوں کے لئے یہ کتابیں راہ نما کتب کا درجہ رکھتی ہیں، ان کے علاوہ اور کتابیں بھی موجود ہیں لیکن میری طالب علمانہ ترجیحات میں ان پانچ کتابوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، اس کے بعد میں قرآن پاک، حدیث وسنت اور خلفاء راشدینؓ کے فیصلوں میں سے نمونہ کے طور پر چند باتوں کا تذکرہ کروں گا صرف یہ بتانے کے لئے کہ اسلامی تعلیمات واحکام کے ان بنیادی مآخذ میں انفرادی، خاندانی اور اجتماعی معیشت کے شعبوں کے بارے میں مکمل راہ نمائی موجود ہے اور معیشت بھی اسلامی احکام میں ایک بنیادی شعبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

انسانی ضرورت کی تمام چیزیں دینے کا خدائی وعدہ:

مثلاً قرآن کریم میں سورۃ بقرہ کی آیت نمبر 36 میں بتایا گیا ہے، کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو جنت سے زمین پر اتارا تو فرمایا کہ "وَلَكُمْ فِى الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ" تمہارے لئے زمین میں ایک مقررہ وقت تک رہنے کی جگہ کے ساتھ ساتھ زندگی کے اسباب بھی مہیا کیے جائیں گے، یہ "متاع الی حین" اللہ تعالیٰ کی طرف

سے نسل انسانی کو معیشت کے اسباب مہیا کرنے کا وعدہ ہے جو اللہ رب العزت کے نظام کے مطابق پورا ہوتا آرہا ہے اور قیامت تک ہوتا رہے گا۔

قرآن کریم میں سورۃ حم السجدۃ کی ایک آیت نمبر 10 میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جب زمین کو اللہ تعالیٰ نے بنایا تو ’’وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ‘‘ زمین میں اللہ تعالیٰ نے اس پر رہنے والوں کی خوراک مقرر اور اس کے خزانے پوشیدہ کر دیے ہیں جو ضرورت مندوں کے لئے برابر ہیں، یہاں ’’سائلین‘‘ کا معنیٰ جستجو کرنے والے بھی کیا گیا ہے اور ضرورت مند بھی کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر جتنی مخلوقات کو بسانے کا پروگرام بنایا تھا ان سب کو سامنے رکھ کر ان کی ضرورت کے اسباب بھی زمین میں پیدا کر دیے تھے جو ہر دور میں اس دور کی ضرورت کے مطابق نکالے جا رہے ہیں۔

آبادی اور وسائل:

یہاں ایک مسئلہ کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ آج کی دنیا میں ایک اہم مسئلہ یہ زیر بحث ہے کہ انسانی آبادی بڑھتی جا رہی ہے مگر زندگی اور معیشت کے اسباب و وسائل کم ہوتے جا رہے ہیں جس سے آبادی اور وسائل کا توازن بگڑتا جا رہا ہے، آبادی اور وسائل کے اس توازن کو اپنی حدود میں رکھنے کے لئے آبادی پر کنٹرول اور اس میں اضافے کو روکنا ضروری سمجھا جا رہا ہے اور برتھ کنٹرول کی عالمی مہم کے پیچھے یہی تصور کارفرما ہے، مگر قرآن کریم کی تعلیمات اور فلسفہ اس کی تائید نہیں کرتے اس لئے اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ وہ کس قدر آبادی پیدا کر رہے ہیں اور اس کے لئے کتنے وسائل کی ضرورت ہے، وہ یہ نہیں کرتے کہ مخلوق تو پیدا کر دیں لیکن اس کے لئے وسائل پیدا نہ کریں، انسانی حکومتوں میں تو یہ کام ہو سکتا ہے کہ آبادی اور وسائل کے تناسب کے اندازے غلط ہو جائیں لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ ممکن نہیں ہے، اس لئے اس وقت جس بات کو آبادی اور وسائل میں توازن و تناسب بگڑنے سے تعبیر کیا جا رہا ہے، اس کی وجہ آبادی اور وسائل کی تخلیق و پیدائش میں

عدم توازن نہیں بلکہ وسائل کی تقسیم کے نظام میں گڑبڑ ہے، جو انسانوں کی اپنی پیدا کردہ ہے اور اس کو صحیح کرنا ضروری ہے ورنہ جوں جوں آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے وسائل بھی بڑھتے جا رہے ہیں، اگر انسانی حکومتوں کا بنایا ہوا معاشی نظام اور وسائل کی تقسیم کا سسٹم صحیح ہو جائے تو آبادی اور وسائل میں عدم توازن کی کوئی شکایت باقی نہیں رہے گی اس لئے اسلامی نظام معیشت کی بنیادی وسائل و اسباب کی متوازن تقسیم پر ہے۔

قرآن کریم میں خرچ کرنے کے اصول:

قرآن کریم نے دولت اور مال کو خرچ کرنے کے جو اصول بیان فرمائے ہیں ان میں چند باتیں واضح طور پر کہہ دی گئی ہیں مثلاً یہ کہ تم جو کچھ خرچ کرتے ہو ہمارے دیے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے ہو ''وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْن'' یا تمہارے پاس جو مال ہے وہ تمہاری ملکیت تو ہے مگر مکمل طور پر تمہارے اختیار میں نہیں ہے، اس کے خرچ کرنے میں تمہیں حلال و حرام کی حدود کو ملحوظ رکھنا ہوگا، اور حلال و حرام کا تعین کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، آج کی دنیا کے معاشی فلسفہ کے ساتھ ہمارا ایک بنیادی تنازعہ یہ بھی ہے کہ ''فری اکانومی'' کے عنوان سے یہ بنیادی اصول طے کر لیا گیا ہے کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز ہونے کا فیصلہ کرنا سوسائٹی کا کام ہے اور مارکیٹ کی رسد اور طلب ہی جائز و ناجائز ہونے کا معیار ہے مگر اسلام اس بات کو تسلیم نہیں کرتا اور اسلام کا اصول یہ ہے کہ حلال و حرام کے دائرے متعین کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، اور وہ وحی الٰہی کے ذریعے طے شدہ ہیں، کیونکہ اس نے انسانوں اور اشیاء دونوں کو پیدا کیا ہے اور اسی کو معلوم ہے کہ کون سی چیز انسان کے لئے فائدہ مند ہے یا نقصان دہ ہے، اس لئے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے فیصلے بھی اسی کے نافذ ہوں گے، انسانوں کو اپنے لئے حلال و حرام کے فیصلے کرنے کا اختیار نہیں ہے اور انہیں معیشت کے ہر باب میں وحی الٰہی کے مطابق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ حلال و حرام کے دائرے میں پابند رہنا ہوگا۔

اسلامی اصول مال جمع نہ کرنا بلکہ حقداروں میں تقسیم کرنا ہے:

اس طرح یہ فرمایا گیا ہے کہ جو مال و دولت تمہارے پاس ہے اس میں دوسروں کے بھی حقوق ہیں، یہ سارے کا سارا مال صرف تمہارا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ’’وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ‘‘ ان کے مالوں میں سائل اور محروم دونوں کا حق ہے اس کی تشریح مفسرین کرامؒ یہ کرتے ہیں کہ سائل اسے کہتے ہیں جو ضرورت مند ہے اور اپنی ضرورت کا اظہار بھی کرتا ہے جبکہ محروم وہ ضرورت مند ہے جو اپنی ضرورت کو ظاہر بھی نہیں کرتا اور سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے، دولت مند کے مال میں ان دونوں کا حق ہے، جو ضرورت مند اپنی ضرورت کا اظہار کرتا ہے، اس کا حق تو سمجھ میں آتا ہے لیکن جو سفید پوش ضرورت مند اپنی ضرورت کا اظہار تک نہیں کرتا اس کا حق بھی دولت والے نے ادا کرنا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ دولت مند شخص کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ سوسائٹی میں سفید پوش ضرورت مندوں کو تلاش کر کے ان تک ان کا حق پہنچائے پھر قرآن کریم نے اسے ’’حقوق‘‘ میں شمار کیا ہے کہ کوئی دولت مند شخص سوسائٹی کے مستحقین پر اپنا مال خرچ کر کے ان پر احسان نہیں کر رہا ہے بلکہ ان کو ان کا اپنا حق دے رہا ہے حتیٰ کہ قرآن کریم نے کسی ضرورت مند اور مستحق پر مال خرچ کرنے کے بعد اس پر احسان جتلانے کو نیکی برباد ہو جانے کا باعث قرار دیا ہے، اسی طرح قرآن کریم نے سوسائٹی میں دولت کی گردش کا اصول اور فلسفہ بیان کیا ہے کہ ’’کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ ‘‘ دولت کی گردش کو صرف مالداروں میں محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ سوسائٹی کے نیچے کے طبقوں اور غریب افراد تک بھی دولت کی گردش کو آنا چاہیے، زکوٰۃ کا اصول یہی ہے اور وراثت کی تقسیم کی حکمت بھی یہی ہے، زکوٰۃ دولت کی گردش کو اوپر سے نیچے لاتی ہے اور وراثت کا نظام قائم ہو تو بڑی سے بڑی دولت بھی تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزر کر تیسری چوتھی پشت میں عام آدمی کے دائرہ اختیار میں آجاتی ہے، اسلام کا اصول دولت کو جمع کرنا نہیں بلکہ اسے تقسیم کر کے

اس کی گردش کو سوسائٹی کے تمام طبقات تک وسیع کرنا ہے اور زکوٰۃ اور وراثت کا نظام سوسائٹی میں یہی کام کرتا ہے، حضرت امام غزالیؒ نے سوسائٹی میں دولت کی گردش کو انسانی جسم میں خون کی گردش کی مانند قرار دیا ہے، انسان کے جسم میں خون گردش کرتا ہے تو جسمانی صحت قائم رہتی ہے، اگر کسی عضو کو اس کی ضرورت کا خون نہ ملے تو فالج پیدا ہوتا ہے اور اگر کسی عضو میں خون پہنچ کر رک جائے یا ضرورت سے زیادہ خون پہنچ جائے تو خون فاسد ہونا شروع ہو جاتا ہے، پھوڑے پھنسی پیدا ہوتے ہیں، خون پیپ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور خرابی پیدا ہوتی ہے، اسی طرح سوسائٹی کے کسی طبقے تک دولت کی گردش نہ پہنچے تو فقر و محتاجی پیدا ہوتی ہے، محرومی جنم لیتی ہے، زندگی میں تعطل آ جاتا ہے جبکہ کسی طبقہ میں دولت حد سے زیادہ آ جائے یا دولت وہاں آ کر رک جائے اور اس میں گردش نہ رہے تو تعیش اور آرام طلبی پیدا ہوتی ہے جسے قرآن کریم نے ''مترفین'' سے تعبیر کیا ہے اور اس سے سوسائٹی کا نظام بگڑ کر رہ جاتا ہے۔

زکوٰۃ اور سود میں فرق:

سود کے نظام اور زکوٰۃ کے نظام میں یہی فرق ہے کہ زکوٰۃ دولت کو اوپر سے نیچے لاتی ہے اور سود دولت کو نیچے سے اوپر لے جاتا ہے اور پھر دولت اوپر کے طبقات سے بھی گردش کرنے لگتی ہے جسے سورۃ حشر کی آیت نمبر 7 میں ''دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ'' کے عنوان سے بیان فرمایا ہے اور سود کی شدید درجہ کی حرمت کی ایک حکمت یہ بھی بیان کی جاتی ہے، اسی طرح قرآن کریم نے معیشت کے ایک اور اہم مسئلہ کی بھی وضاحت فرمائی ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے پوچھا مَاذَا يُنْفِقُوْنَ؟ وہ اپنے مال میں سے کتنا حصہ خرچ کریں، اس سوال کے جواب میں قرآن کریم نے ایک آیت میں تو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ کیا خرچ کریں کے ساتھ ساتھ کہاں خرچ کریں؟ کا سوال بھی ضروری ہے اور اس سوال کے جواب میں خرچ کے مصارف کا ذکر کیا ہے قرآن مجید سورۃ بقرۃ آیت

نمبر 215 میں فرمایا کہ

''مَا اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ فَلِلۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ''

جو بھی خرچ کرو اس کے اولین مستحق ماں باپ، قریبی رشتہ دار، یتامیٰ، مساکین اور مسافر ہیں اور دوسری آیت میں فرمایا کہ ''العفو'' ضرورت سے زائد مال خرچ کر دو، اس آیت میں اپنی روزمرہ ضروریات سے زائد مال و دولت کو جمع کرنے اور ذخیرہ کرنے کی بجائے اسے سوسائٹی کے ضرورت مند افراد پر خرچ کر دینے کی تلقین کی گئی ہے، اسے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، فرضیت اور وجوب کے درجہ میں بیان کرتے ہیں اور ضرورت سے زائد مال ذخیرہ کرنے کو حرام کہتے ہیں مگر حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور جمہور صحابہ کرامؓ اس حکم کو استحباب پر محمول کرتے ہیں کہ، زکوٰۃ و عشر اور دیگر صدقات واجبہ کی ادائیگی کے بعد زائد از ضرورت مال کو جمع رکھنا جائز اور مباح تو ہے مگر بہتر یہی ہے کہ زائد از ضرورت مال کو خرچ کر دیا جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیان کردہ اہم معاشی اصول:

اسی طرح جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ معاشی اصولوں میں سے ایک اہم اصول کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا، بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا کہ جو شخص مال و دولت چھوڑ کر فوت ہوا اس کا مال اس کے وارثوں کو ملے گا لیکن ''وَمَنۡ تَرَكَ كَلًّا اَوۡ ضِيَاعًا فَاِلَيَّ وَعَلَيَّ'' جو شخص قرض کا بوجھ اور بے سہارا خاندان اولاد چھوڑ کر مرا وہ میری طرف سے اور مجھ پر ہے یعنی اس کی کفالت کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور بیت المال اس کا ذمہ دار ہے، اسلامی ریاست میں بیت المال کے ادارے اور اس کی ذمہ داری کی بنیاد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے

اسی جملے "کَلاَّ وَ علیّ" پر ہے اور اسی کی ایک صورت کو امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا کہ اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی کتا بھوک سے مرجائے تو اس کی ذمہ داری عمرؓ پر ہوگی یعنی حکومت وقت پر ہوگی۔

بیمہ اور انشورنس:

آج کل انشورنس اور بیمہ کے بارے میں بحث عام ہے، میں اس کی فقہی بحث میں نہیں پڑوں گا کہ یہ مفتیان کرام کا حق ہے لیکن اس کی اصولی حیثیت کے بارے میں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں، ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ اسلامی نظام میں انشورنس اور بیمے کی کیا حیثیت ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ایک اسلامی ریاست اور اسلامی سوسائٹی میں پرائیویٹ انشورنس اور بیمے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں ہے، اس لئے کہ جب بیت المال معاشرے کے ہر ضرورت مند، معذور، بے سہارا اور مصیبت زدہ شخص کی ضروریات کا ذمہ دار اور کفیل ہے تو پھر کسی بے سہارا اور ضرورت مند کو الگ سے انشورنس فراہم کرنے کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اور یہی اسلامی نظام معیشت کی سب سے نمایاں خوبی ہے۔

یہ چند باتیں میں نے آپ حضرات کو اور علماء وطلبہ کو توجہ اور شوق دلانے کے لئے عرض کی ہیں کہ معاشیات بھی قرآن وسنت کا اہم موضوع ہیں جن کا سینکڑوں آیات واحادیث میں تذکرہ موجود ہے، ہمیں ان کا بھی اہتمام سے مطالعہ کرنا چاہیے اور آج کے دور میں ان کی روشنی میں امت کی راہ نمائی کرنی چاہیے۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مکالمہ بین المذاہب کے اہداف اور تقاضے

''وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی کے شعبہ عربی کے زیر اہتمام قومی سیرت النبی ﷺ کانفرنس میں 12 جون 2011ء کو ظہر کے بعد کی نشست سے خطاب''

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اما بعد!

تمہیدی کلمات:

موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے قومی سیرت کانفرنس کے انعقاد اور ایک اہم موضوع پر اصحابِ فکر ونظر کو جمع کرنے پر وفاقی اردو یونیورسٹی کے شعبہ عربی کا شکریہ ادا کروں گا کہ اس سے مجھے اور بہت سے اربابِ دانش کو مل بیٹھنے اور ایک اہم دینی اور قومی مسئلہ پر ایک دوسرے کے خیالات سننے کا موقع فراہم ہوا۔

آج صبح جب میں ملتان سے کراچی آرہا تھا تو جہاز میں ہی روزنامہ نوائے وقت کے سنڈے ایڈیشن پر نظر پڑی اس میں ملک کے ایک معروف دانشور کے طویل انٹرویو کی سرخی یہ ہے کہ ''ملک کے نظام تعلیم سے عربی اور فارسی تو رخصت ہو ہی چکی ہیں اب اردو بھی رخصت ہونے جا رہی ہے۔''

یہ بات عربی اور فارسی کے ساتھ عام حکومتی رویہ کی صحیح عکاسی کرتی ہے لیکن اس فضا میں

یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ اس قومی سیرت کانفرنس کا اہتمام وفاقی اردو یونیورسٹی کے شعبہ عربی نے ''انجمن اساتذہ علوم اسلامیہ کالجز کراچی'' کے اشتراک وتعاون سے کیا ہے اور مزید خوشی کی بات یہ ہے کہ ''ہائر ایجوکیشن کمیشن'' بھی ان کے ساتھ اس کار خیر میں شریک ہے اوران کی پشت پناہی کر رہا ہے میں اس پر ہائر ایجوکیشن کمیشن، انجمن اساتذہ علوم اسلامیہ اور وفاقی اردو یونیورسٹی کے شعبہ عربی تینوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اوراس میں فعال کردار ادا کرنے پر انجمن اساتذہ کے صدر ڈاکٹر صلاح الدین ثانی اور وفاقی اردو یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے سربراہ ڈاکٹر قاری بدرالدین کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

خوشی کا پہلو:

میرے لئے خوشی اور تسلی کا پہلو یہ ہے کہ عربی اور اردو ابھی مکمل طور پر لاوارث نہیں ہوئیں اوران کی بات کرنے والے لوگ اعلیٰ تعلیمی حلقوں میں موجود ہیں، اس کے بعد میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں کہ ''مکالمہ بین المذاہب'' پر اس وقت دنیا میں مختلف سطحوں پر ہونے والی گفتگو کا پس منظر کیا ہے؟ اوراس میں ہمارا کردار کیا ہونا چاہیے؟

گفتگو کے تین حصے:

میں اسے تین حصوں میں تقسیم کروں گا ایک یہ کہ مکالمہ بین المذاہب کا دائرہ کیا ہے؟ دوسرا یہ کہ موجودہ عالمی تناظر میں اس کے اہداف ومقاصد کیا ہیں؟ اور تیسرا یہ کہ اسلامی نقطہ نظر سے اس کے معروضی تقاضے کیا ہیں؟

مکالمہ بین المذاہب کا ایک دائرہ یہ ہے کہ سرے سے مذہب کی کوئی ضرورت انسان کو فرد یا معاشرے کی سطح پر ہے بھی یا نہیں؟ دنیا میں ایسے لوگ اور طبقات کثیر تعداد میں موجود ہیں جو مذہب کو سرے سے انسان کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے بلکہ اس کی نفی کرتے ہیں، اسے انسان کے لئے نقصان دہ تصور کرتے ہیں اوراس کا مذاق اڑاتے ہیں،

ان کے ساتھ مختلف دائروں میں مکالمہ جاری ہے مگر یہ مکالمہ مذاہب کے درمیان نہیں بلکہ مذہبیت اور لا مذہبیت کے درمیان ہے لیکن کچھ مخصوص مقاصد کے لئے اسے مکالمہ بین المذاہب کے عنوان کے دائرے میں لایا جارہا ہے۔

دوسرا دائرہ یہ ہے کہ مذہب اگر انسان کے لئے ضروری اور فائدہ مند ہے تو کیا یہ صرف فرد کے فائدہ یا ضرورت کی چیز ہے یا انسانی سوسائٹی اور معاشرہ کے لئے بھی اس کی افادیت وضرورت موجود ہے؟ موجودہ انسانی سوسائٹی میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو فرد کے لئے تو مذہب کی ضرورت و افادیت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن سوسائٹی اور معاشرے سے اس کو لاتعلق رکھنا چاہتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ فرد کے لئے مذہب فائدے اور ضرورت کی چیز ہو سکتی ہے لیکن مذہب کو سوسائٹی اور معاشرے کے اجتماعی معاملات میں دخیل نہیں ہونا چاہیے، آج کے تمام تر مغربی فلسفے کی بنیاد اسی تصور پر ہے، انقلاب فرانس کے ساتھ مذہب کے معاشرتی کردار کی نفی کی گئی تھی اور مغرب نہ صرف خود مذہب کو سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے بے دخل کئے ہوئے ہے، بلکہ ہم سے بھی تقاضہ کر رہا ہے کہ ہم مذہب کے معاشرتی کردار سے دست بردار ہو جائیں، چند سال قبل واشنگٹن میں میرے قیام کے دوران کچھ دوست مجھے ملے جنہوں نے اپنا تعلق اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے کسی شعبہ سے بتایا اور کہا کہ دنیا بھر کے انسانی معاشروں میں مذہب کی واپسی کا رجحان بڑھ رہا ہے اور ہم بعض حلقوں کی اس تشویش پر کام کر رہے ہیں کہ سوسائٹی میں واپس آ کر مذہب کہیں پھر سے اجتماعی معاملات میں لازماً دخیل تو نہیں ہو جائے گا؟ اس سلسلہ میں آپ کا کیا خیال ہے، میں نے عرض کیا کہ اگر وہ واقعتاً مذہب ہوا تو دخیل ہوگا اس لئے کہ مذہب صرف فرد کی راہنمائی نہیں کرتا بلکہ سوسائٹی کی راہنمائی بھی اس کے کردار کا حصہ ہے۔

یہ مکالمہ بھی اصلاً مذاہب کے درمیان نہیں بلکہ مذہب کے معاشرتی کردار کے

حوالہ سے دو بڑے طبقوں کے درمیان ہے اور رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہا ہے۔

مکالمہ بین المذاہب کا تیسرہ دائرہ یہ ہے کہ موجودہ معروضی حالات میں انسانی سوسائٹی کی راہنمائی کے لئے کون سا مذہب زیادہ صلاحیت اور قوت رکھتا ہے اور اس وقت انسانی سوسائٹی میں موجود مذاہب میں سے کس کے بارے میں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ مستقبل میں انسانی سوسائٹی کی قیادت کرے گا؟

میں اس سلسلہ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ نظری بات نہیں بلکہ عملی مسئلہ ہے، مذاہب کو انسانی سوسائٹی میں اپنا اپنا کردار ادا کرنے کی آزادی دی جائے، ان کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے اور کھلے مقابلہ کا ماحول بحال کر دیا جائے جس مذہب کے پاس وحی آسمانی کی اورئجنل تعلیمات موجود ہوں گی اور جو انسانی فطرت کے زیادہ قریب ہوگا وہ اس مقابلہ میں آگے بڑھے گا اور انسانی سوسائٹی کی قیادت سنبھال لے گا، بہرحال مکالمہ بین المذاہب کا ایک دائرہ یہ بھی ہے کہ مروجہ مذاہب میں سے کون سا مذہب انسانی سوسائٹی میں مؤثر قیادت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

یہ تو وہ چند دائرے ہیں جن میں ''مکالمہ بین المذاہب'' کے عنوان سے اس وقت گفتگو جاری ہے اب اس بات پر ایک نظر ڈال لی جائے کہ اس مکالمہ کے اہداف و مقاصد کیا ہیں ؟ اسے بھی مختلف حصوں میں تقسیم کرنا ہوگا اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ تمام مذاہب کی مشترکہ باتوں کو جمع کر کے ایک متحدہ مذہب تشکیل دیا جائے اسے بعض حلقوں میں ''اتحاد بین المذاہب'' کا عنوان دیا جاتا ہے اور اس پر مختلف سطحوں پر کام ہو رہا ہے، اس سلسلہ میں میری گزارش یہ ہے کہ ہم یہ تجربہ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے دور میں کر چکے ہیں، اکبر بادشاہ نے ''دین الٰہی'' کے عنوان سے اسی قسم کا ملغوبہ بنایا تھا جسے امت مسلمہ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور آج بھی اس نوعیت کی کوئی کھچڑی مسلم امہ کے ہاضمہ کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ سب مذاہب کو اپنی اپنی جگہ حق مذہب تسلیم کرتے ہوئے انہیں ایک دوسرے کا وجود تسلیم کرنے پر آمادہ کیا جائے، ایک دوسرے کی نفی کرنے سے روکا جائے اور مشترکہ طور پر کام کرنے کا ماحول پیدا کیا جائے، اس کا عملی مظاہرہ میں نے حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ کے ہمراہ شکاگو میں دیکھا تھا کہ بہائی مذہب کے ایک بڑے سنٹر کے وسیع حال میں ایک چھت کے نیچے مسجد، مندر، چرچ، گوردوارہ، یہودیوں کا معبد سینی گاگ اور بدھوں کا عبادت خانہ بنائے گئے ہیں اور ہر مذہب کے پیروکاروں کو اجازت ہے کہ وہ اپنی عبادت گاہ میں آ کر اپنے طریقہ سے عبادت کریں، اسے تمام مذاہب کو سچا تسلیم کرنے اور مذاہب کے درمیان اشتراک واتحاد سے تعبیر کیا گیا ہے مگر میرے ذہن میں اسی وقت یہ سوال کھڑا ہو گیا تھا کہ توحید اور شرک کو ایک چھت کے نیچے جمع کرنے کی کوشش کس حد تک خود فریبی کی بات ہے۔

آج ہم سے بھی اس حوالہ سے تقاضہ کیا جا رہا ہے کہ ہم اسلام پر ضرور قائم رہیں، اس پر عمل بھی کریں اور اسے سچا مذہب قرار دیں لیکن دوسرے مذاہب کو غلط نہ کہیں، ان کی نفی نہ کریں اور انہیں باطل سے تعبیر نہ کریں، یہ بات قرآنی تعلیمات کے حوالہ سے کس حد تک قابل قبول ہے، آپ حضرات اہل دانش ہیں اس کا خود فیصلہ کر سکتے ہیں، مکالمہ بین المذاہب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ بات تسلسل سے کہی جا رہی ہے کہ اس وقت مبینہ دہشت گردی کے خلاف جو جنگ عالمی سطح پر لڑی جا رہی ہے، اس میں مبینہ دہشت گردی کے لئے مذہب کا ٹائیٹل استعمال ہو رہا ہے اور مذہب کے نام پر مبینہ طور پر دہشت گردی کی جا رہی ہے، اسے مذہب کے غلط استعمال کا عنوان دیا جا رہا ہے اور یہ تقاضہ کیا جا رہا ہے کہ اسے روکنے کے لئے مسلمان علماء کرام عالمی برادری کا ساتھ دیں اور اس کے ساتھ تعاون کریں۔

مجھے بھی چند سال قبل اس قسم کے ایک مکالمہ میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی جو مختلف مذاہب کے ارباب علم کے درمیان تھا میں نے اس موقع پر عرض کیا کہ ہمیں

مذہب کے غلط استعمال کو روکنے کے عنوان پر گفتگو سے انکار نہیں ہے اور ہم کسی بھی سطح پر اس کے لئے تیار ہیں، ہم نہ صرف اس پر گفتگو کریں گے بلکہ اگر باہمی مباحثہ میں ہماری کوئی غلطی ثابت ہوگئی تو ہم اس کا کھلے بندوں اعتراف بھی کریں گے، لیکن یہ ایجنڈا ادھورا اور یکطرفہ ہے پہلے اسے متوازن بنایا جائے، ہمارے ہاں مناظروں میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ دو فریق باہمی مناظرہ کرتے ہیں تو دونوں کی طرف سے ایک ایک موضوع کا تعین ہوتا ہے اور دونوں عنوانات پر مناظرہ اور مکالمہ ہوتا ہے، ہم مذہب کے مبینہ طور پر غلط استعمال پر گفتگو کے لئے تیار ہیں لیکن اس کے ساتھ ہماری طرف سے یہ موضوع مکالمہ میں شامل کرنا ہوگا کہ سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے مذہب کی بے دخلی کے نتائج کیا نکلے ہیں اور اس عمل نے انسانی سوسائٹی کو فائدہ دیا ہے یا نقصان پہنچایا ہے؟ اس کے ساتھ ہماری طرف سے دوسری شرط یہ ہے کہ مکالمہ اصل فریقوں کے درمیان ہو چند سال قبل مسیحیوں کے پروٹسٹنٹ فرقہ کے عالمی سربراہ آرچ بشپ آف کنٹربری ڈاکٹر اوون ولیمز اسلام آباد تشریف لائے تو ان سے مذاکرات کے لئے اس وقت کے وزیر اعظم پاکستان جناب شوکت عزیز ان کے سامنے بیٹھے تھے میں نے اس وقت یہ سوال اٹھایا تھا کہ آرچ بشپ آف کنٹربری تو مسیحی دنیا کے ایک بڑے مذہبی فرقہ کی نمائندگی کرتے ہیں یہ شوکت عزیز صاحب کس کی نمائندگی کر رہے ہیں؟ مسٹر ٹونی بلیئر تشریف لائیں یا ڈیوڈ کیمرون برطانیہ سے آئیں تو شوکت عزیز یا یوسف رضا گیلانی ہی پاکستان کی نمائندگی کا حق رکھتے ہیں لیکن اگر پاپائے روم تشریف لائیں یا آرچ بشپ آف کنٹربری مذاکرات کی میز پر بیٹھے ہوں تو مسلمانوں کی نمائندگی کا حق ان کے مذہبی راہ نماؤں کو ہے اور وہی مذاکرات حقیقی مذاکرات کہلائیں گے جو اصل فریقوں کے درمیان ہوں گے۔

مکالمہ بین المذاہب کے اہداف و اغراض کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسانی سوسائٹی گلوبل ولیج کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے، باہمی میل جول بڑھ رہا ہے اور مشترکہ سوسائٹیاں

تشکیل پا رہی ہیں، ان مشترک سوسائٹیوں میں مختلف مذاہب کے لوگوں کو کس طرح مل جل کر رہنا چاہیے اور ایک دوسرے سے احترام اور باہمی حقوق و آداب کی پاسداری کا ماحول کیا ہونا چاہیے، تاکہ وہ باہمی تصادم بدامنی سے بچتے ہوئے اکٹھے رہ سکیں، میرے نزدیک مکالمہ بین المذاہب کا اصل ہدف یہی ہونا چاہیے، یہ آج کی دنیا کی ضرورت ہے اور دعوت و تبلیغ کے حوالہ سے مسلمانوں کی بھی ایک بڑی ضرورت ہے کہ دعوت امن وسکون کے ماحول میں ہی صحیح نتائج دے سکتی ہے، اب آخر میں اس طرف آنا چاہوں گا کہ مکالمہ بین المذاہب کے مختلف دائروں اور اسکے مقاصد و اہداف کے مختلف پہلوؤں کے تناظر میں ہماری ذمہ داری کیا ہے اور ہم کس طرح اس سلسلہ میں صحیح کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ہمارا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ہم صورت حال کا صحیح ادراک کریں اور مکالمہ بین المذاہب کے عمومی تناظر اور اس کے اہداف ومقاصد کے مختلف دائروں کو سمجھنے کی کوشش کریں کیونکہ اس حوالہ سے اس وقت معاملات بہت کچھ گڈ مڈ ہو کر رہ گئے ہیں اور یہ بات سمجھنا مشکل ہوتا جا رہا ہے کہ کون کس دائرے میں کام کر رہا ہے اور کس مقصد کے لئے کام کر رہا ہے۔

عمومی صورت حال کے صحیح ادراک کے بعد پھر اس کے لئے صحیح طور پر تیاری ہماری ذمہ داری ہے، مطالعہ، تحقیق، تجزیہ، لابنگ اور مکالمہ کے جدید اسلوب پر مہارت ضروری ہے اور ابلاغ کے جدید ذرائع کا استعمال بھی ایک ناگزیر ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے۔

اگر ہم مجموعی صورت حال کے حقیقت پسندانہ جائزہ اور صحیح ادراک کے ساتھ اپنی ضروریات اور ترجیحات کا تعین کر سکیں تو ہم اس پوزیشن میں ہوں گے کہ ”مکالمہ بین المذاہب“ کے عالمگیر مکالمہ میں اسلام اور ملت اسلامیہ کی صحیح طور پر نمائندگی کر سکیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

خطابت اس کے دائرے اور ضروریات

"3 جولائی کو مرکزی جامع مسجد کورنگ ٹاؤن اسلام آباد میں بیس روزہ خطابت کورس سے خطاب کا خلاصہ"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ

وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

بیس روزہ خطابت کورس کے منتظم مرکزی جامع مسجد کورنگ ٹاؤن اسلام آباد کے خطیب مولانا شبیر احمد عباسی کا شکر گزار ہوں کہ علماء وخطباء کے اس اجتماع میں کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع عطا کیا، اللہ تعالیٰ ہمارے اس مل بیٹھنے کو ہم سب کے لئے بامقصد اور بابرکت بنائیں، آمین یارب العالمین

''نطق'' انسان کے امتیازات اور خواص میں سے ہے جس کی وجہ سے مناطقہ کے ہاں انسان کو ''حیوان ناطق'' کہہ کر دوسرے حیوانات سے ممتاز کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوت گویائی سی نوازا ہے جس کے مختلف مدارج ہیں اور ایک انسان جب بہت سی انسانوں کو خطاب کر کے اپنے جذبات واحساسات اور مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے تو اسے خطابت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس خطابت میں جس قدر فصاحت ہوگی اور مخاطبین کو سمجھانے کا بہتر انداز ہوگا اسی قدر وہ کمال کی حامل ہوگی۔

خطابت زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح دین کی ضروریات میں بھی بہت زیادہ

اہمیت رکھتی ہے۔ جس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ رب العزت نے مدین سے واپسی پر کوہ طور پر بلا کر نبوت و رسالت سے سرفراز کیا اور انہیں فرعون کے پاس جانے کی ہدایت دے کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اظہار اور فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کی آزادی کو ان کی نبوی ذمہ داری قرار دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبی بنانے اور اپنے معاون و مددگار کا درجہ دینے کی درخواست کی جسے بارگاہ ایزدی میں قبول کر لیا گیا، اس کی ایک وجہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ بیان فرمائی کہ "ھو افصح منی لسانا" وہ زبان اور گفتگو میں مجھ سے زیادہ فصیح ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں قدرے لکنت تھی جسے دور کرنے کی انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آمد اور دعوت کے بعد اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو طعن و اعتراض کیے ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ "ولا یکاد یبین" وہ تو اپنی بات بھی پوری طرح بیان نہیں کر سکتے۔

جناب نبی اکرم ﷺ کو مشرکین عرب اور مشرکین مکہ نے "ساحر" کا جو خطاب دیا تھا، اس کی وجہ قرآن کریم کے اعجاز کے ساتھ ساتھ خود جناب نبی اکرم ﷺ کی فصاحت و بلاغت کا کمال بھی تھا، کہ اللہ رب العزت نے آنحضرت ﷺ کو خطابت و فصاحت کے اس اعلیٰ ترین مقام و معیار سے نوازا تھا جسے اپنے الفاظ میں تعبیر کرنے کے لئے منکرین کے پاس "جادو" کے علاوہ کوئی اور لفظ موجود ہی نہیں تھا۔

دینی حوالہ سے خطابت کی ضرورت کے تین بڑے دائرے ہیں، پہلا دائرہ "دعوت" کا ہے کہ دنیا بھر کے انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید و بندگی، جناب رسالت مآب ﷺ کی رسالت و نبوت اور قرآن کریم کا ہدایت و دعوت کا پیغام پہنچانا ہم مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، اس وقت دنیا کی آبادی سات ارب سے زیادہ بیان کی جاتی ہے جس میں سے پونے دو ارب کے لگ بھگ مسلمانوں کو الگ کر لیا جائے تو کم و بیش سوا پانچ ارب انسان دنیا میں

ایسے بستے ہیں جو جناب نبی اکرم ﷺ کی امت دعوت کا حصہ ہیں مگر اسلام، قرآن کریم اور جناب نبی اکرم ﷺ سے متعارف نہیں ہیں، ظاہر بات ہے کہ ان تک توحید، رسالت اور قرآن کریم پہنچانے اور انہیں اسلام سے متعارف کرانے کے لئے آسمان سے فرشتے نہیں اتریں گے، یہ کام اس وقت موجودہ پونے دو ارب کے لگ بھگ مسلمانوں نے ہی کرنا ہے، انہی پر اس کی ذمہ داری ہے اور وہی اس کے بارے میں عنداللہ مسئول ہوں گے۔ جب کہ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ سرکاری یا غیر سرکاری طور پر دنیا میں کوئی ایسا عالمی نظام موجود نہیں ہے جو اس فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے محنت کر رہا ہو، بعض علاقوں میں مقامی طور پر ایسے افراد اور حلقے ضرور پائے جاتے ہیں جو یہ کام کر رہے ہیں لیکن جس طرح مسیحیوں کے مشنری ادارے ایک بین الاقوامی نظم کے تحت دنیا بھر میں غیر عیسائیوں کو عیسائی بنانے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں سرگرم عمل ہیں اسی طرح کا کوئی ادارہ یا نظام مسلمانوں کی طرف سے متحرک نہیں ہے۔

مسیحی مشنریوں کی کارکردگی کا اس بات سے اندازہ کر لیجئے کہ گزشتہ پون صدی کے دوران انہوں نے افریقہ میں رقبہ کے لحاظ سے مسلمانوں کے سب سے بڑے ملک سوڈان کے جنوب میں بت پرست قبائل کو عیسائی بنا کر اس خطہ میں عیسائی اکثریت قائم کی ہے اور اس کی بنیاد پر اقوام متحدہ کے زیر اہتمام جنوبی سوڈان میں ریفرنڈم کرا کے جنوبی سوڈان کے نام سے ایک آزاد مسیحی ریاست قائم کر لی ہے، اسی طرح کی محنت کر کے وہ انڈونیشیاء کے صوبہ تیمور کے ایک حصہ کو ''ایسٹ تیمور'' کے نام سے انڈونیشیاء سے الگ کر چکے ہیں اور اب بین الاقوامی رپورٹوں کے مطابق پاکستان میں بھی خدانخواستہ ایک آزاد مسیحی ریاست قائم کرنے کے منصوبے پر کام جاری ہے، جنوبی سوڈان اور مشرقی تیمور کو جس طرح مسیحی ریاستوں کی شکل دی گئی ہے اور فلسطین کے ایک بڑے حصے کی آبادی کو یہودی اکثریت میں تبدیل کر کے جس طرح اسرائیل قائم کیا گیا ہے اس کے پیش نظر پاکستان کے کسی حصے

میں کسی آزاد مسیحی ریاست کے قیام کی بات کو ناقابل عمل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مگر ہمارا المیہ یہ ہے کہ دینی حلقوں میں سے کسی کی سرے سے اس طرف توجہ ہی نہیں ہے۔

خیر میں خطابت کی اہمیت و ضرورت کے بڑے دائرے کا تذکرہ کر رہا تھا کہ ہمیں دنیا میں مسلمانوں کے علاوہ بسنے والے پانچ ارب سے زیادہ انسانوں تک اسلام کی دعوت اور پیغام پہنچانے کے لئے ابلاغ کے دوسرے ذرائع کے ساتھ ساتھ خطابت کی بھی ضرورت ہے اور اس کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنا ہماری دینی ذمہ داری ہے۔

خطابت کی اہمیت و ضرورت کا دوسرا دائرہ ''امت کی اصلاح'' اور اسے دین کے اعمال اور ماحول کی طرف واپس لانا ہے، ہم سب یہ سمجھتے ہیں اور بار بار اس کا اظہار کرتے ہیں کہ امت مسلمہ کی موجودہ زبوں حالی اور کسمپرسی کا سب سے بڑا سبب امت کا عمومی طور پر دین سے دور ہونا ہے، امت کی اکثریت دین کے اعمال پر نہیں ہے اور مسلم معاشروں کا عمومی ماحول دینی نہیں ہے، امت کی اکثریت کی دین کے اعمال و احکام کی طرف واپسی اور مسلم معاشروں میں دینی ماحول دوبارہ قائم کیے بغیر ہم زوال، ذلت اور مشکلات و مسائل کی اس دلدل سے نجات حاصل نہیں کر سکتے، اس دائرہ میں اگرچہ ''تبلیغی جماعت'' کے نام سے ہمارا ایک بین الاقوامی نظام موجود اور متحرک ہے اور لاکھوں حضرات امت کو دین کے اعمال پر واپس لانے کے لئے دنیا بھر میں محنت کر رہے ہیں جس کے ثمرات و نتائج بھی حوصلہ افزا ہیں لیکن اس دائرہ کی ضروریات کی مختلف سطحوں اور دائروں کو سامنے رکھتے ہوئے اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ اس کام کو کہاں کہاں اور کس کس سطح پر منظم و متحرک کرنے کی ضرورت ہے اور کہاں کہاں اس سلسلہ میں خلاء اور کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔

ہمارے دینی مدارس اور مساجد بھی علاقائی سطح پر یہی کام کر رہے ہیں اور خوب کر رہے ہیں، لیکن جب بات عالمی سطح پر، اور امت کی مجموعی ضروریات کے حوالہ سے ہو رہی

ہے تو اس کام کی ترجیحات اور ترتیب کو اس کے مطابق منظم کرنا بھی اس کی اہم ترین ضرورت ہے۔

خطابت کی ضرورت کا تیسرا دائرہ ''دفاع'' کا ہے کہ اسلام پر، قرآن کریم پر، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی پر اور شریعت کے احکام وقوانین پر جو اعتراضات ہو رہے ہیں ان کا جواب دینا اور شکوک وشبہات کو علمی وتحقیقی طور پر رد کرنا بھی ہماری دینی ذمہ داری ہے اور ''خطابت'' اس کا اہم ذریعہ ہے۔

دفاع کو میں دو حصوں میں تقسیم کروں گا ایک حصہ عالمی سطح پر دوسری اقوام، مذاہب اور فکری وتہذیبی تحریکات کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات ہیں جن کے ذریعہ قرآن کریم کی حقانیت وصداقت کو چیلنج کیا جا رہا ہے، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کو (نعوذ باللہ) طعن واعتراض کا ہدف بنایا جا رہا ہے اور خلافت کے اسلامی نظام اور شرعی احکام وقوانین پر شدید تنقید کی جا رہی ہے، یہ ایک مستقل میدان کار ہے، جو آج کی عالمی فکری وتہذیبی کشمکش کے ماحول میں بہت زیادہ بلکہ میری طالب علمانہ رائے میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جب کہ دوسرا حصہ امت مسلمہ کے اندر اسلامی احکام وقوانین کے حوالہ سے پائے جانے والے اور پیدا کیے جانے والے شکوک وشبہات ہیں جن کا دائرہ مسلسل پھیلتا جا رہا ہے اور ہماری ہی عدم توجہ کی وجہ سے دن بدن سنگین سے سنگین تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے شیخ محترم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ؒ اسے ''فکری ارتداد'' سے تعبیر کرتے تھے۔

ان تین دائروں میں سے آج کی نشست میں اس آخری دائرے کے حوالہ سے کچھ ضروری باتیں عرض کرنا چاہوں گا اور آپ علماء کرام سے جو خطابت کے محاذ پر موجود ہیں یا اس طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، ان امور کی طرف سنجیدہ توجہ کی درخواست کروں گا، اسلام، قرآن کریم، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، شرعی احکام وقوانین اور اسلام کے معاشرتی وسیاسی

نظام پر اعتراضات اور ان کے جوابات کا سلسلہ اسلام کے آغاز سے جاری ہے اور ہر دور کے علمائے کرام اس دور کے تقاضوں اور ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اس محنت میں مصروف چلے آرہے ہیں، اس پس منظر میں ہمیں آج کے عصری تقاضوں اور ضروریات کو پیش نظر رکھنا ہوگا تاکہ ہم یہ ذمہ داری اچھے طریقہ سے نباہ سکیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں یہ کام چیلنج سمجھ کر کرنا ہوگا اور پوری ذمہ داری اور حوصلہ سے کرنا ہوگا، اسلام کے دفاع کے حوالہ سے خطابت اور شاعری ہمارے لئے جناب نبی اکرم ﷺ کے دور میں بھی چیلنج رہی ہے، جس کی دو شہادتیں آپ حضرات کو یاد دلانا چاہتا ہوں۔

غزوۂ احزاب کے موقع پر جب قریش اور ان کے اتحادی قبائل مدینہ منورہ کے محاصرہ میں ناکام ہو کر خائب و خاسر واپس لوٹے جسے قرآن کریم نے "لم ینالوا خیراً" سے تعبیر کیا ہے۔ تو جناب نبی اکرم ﷺ نے مسجد نبوی میں صحابہ کرامؓ سے خطاب کرتے ہوئے دو تاریخی اعلان کیے، ایک یہ کہ اب قریش کو مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں ہو گی۔ اب ان کے ساتھ جنگ کے لئے ہم ہی ان کی طرف جائیں گے اور دوسرا یہ کہ اب قریش اور ان کے حلیف قبائل ہمارے خلاف تلوار اور ہتھیار کی جنگ نہیں لڑیں گے، بلکہ زبان کی جنگ لڑیں گے، جس میں خطابت اور شاعری ان کا بڑا ہتھیار ہوگی، وہ عرب قبائل کو تمہارے خلاف بھڑکائیں گے، تمہارے خلاف نفرت پھیلائیں گے اور انہیں تمہارے قریب آنے سے روکیں گے۔ میں اسے "میڈیا وار" سے تعبیر کیا کرتا ہوں اُس وقت کا "میڈیا" یہی تھا اور عرب قبائل نے مسلمانوں کے خلاف یہی "میڈیا وار" چھیڑ دی تھی جس کا ذکر جناب نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے سامنے کیا اور ان سے پوچھا کہ کیا وہ اس جنگ کے لئے تیار ہیں؟ روایات میں آتا ہے کہ اس پر تین شاعر صحابی سامنے آئے اور اعلان کیا کہ یہ جنگ ہم لڑیں گے۔ (1) حضرت حسان بن ثابتؓ (2) حضرت عبداللہ بن رواحہؓ (3) حضرت کعب بن مالکؓ (4) ان کے ساتھ ایک بزرگ حضرت قیس بن

ثابت بن شماس ؓ کو بھی شامل کر لیں جنہوں نے خطابت کے میدان میں وہی خدمات سرانجام دیں جو پہلے تین بزرگوں نے شاعری کے محاذ پر سرانجام دیں۔ انہیں ''خطیب الانصار'' کہا جاتا تھا اور سب سے پہلے ''خطیب الاسلام'' کا خطاب انہی کو ملا تھا۔

ان شعراء اور خطیب اسلام نے اس محاذ کو کس شان اور ذوق کے ساتھ سنبھالا اس کی دو تین جھلکیاں آپ دوستوں کو یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں، بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت حسان بن ثابت ؓ مسجد نبوی میں منبر رسول ﷺ پر کھڑے ہو کر جناب نبی اکرم ﷺ کی مدح کرتے تھے اور کافروں کی طرف سے کی گئی ہجو کا جواب دیتے تھے جب کہ نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام ؓ کے سامنے بیٹھ کر انہیں داد اور دعا دیا کرتے تھے۔

جناب نبی اکرم ﷺ جب عمرۃ القضاء پر ڈیڑھ ہزار صحابہ کرام ؓ کے ہمراہ تشریف لے گئے تو مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے ہوئے آپ ﷺ کی اونٹنی کی مہار حضرت عبد اللہ بن رواحہ ؓ کے ہاتھ میں تھی، وہ بھی احرام کی حالت میں تھے اور عمرہ کے لئے آئے تھے، لیکن ان کی زبان پر تلبیہ کی بجائے رجزیہ اشعار تھے اور وہ جنگی ترانوں کے لہجے میں رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے حالت احرام میں عمرہ کے لئے مکہ مکرمہ میں داخل ہو رہے تھے، حضرت عمر بن خطاب ؓ نے انہیں ایسا کرتے دیکھ کر اشارے سے بیت اللہ کی طرف توجہ دلائی اور رجزیہ اشعار پڑھنے سے روکا تو جناب نبی اکرم ﷺ کی نظر پڑ گئی، جناب نبی اکرم ﷺ نے ''دعہ یا عمر'' کہہ کر حضرت عمر ؓ کو منع کرنے سے روک دیا اور فرمایا کہ اسے پڑھنے دو اس کے اشعار کافروں کے سینوں میں تمہارے تیروں سے زیادہ نشانے پر لگ رہے ہیں۔

بنو تمیم عرب کا ایک بھنّے خان قبیلہ تھا جنہیں اپنی خطابت، شاعری اور فصاحت و بلاغت پر بہت ناز تھا، ان کا وفد مدینہ منورہ آیا تو جناب نبی اکرم ﷺ سے ملاقات کر کے خطابت و شاعری میں مقابلہ کا چیلنج دے دیا، جناب نبی اکرم ﷺ نے چیلنج قبول کیا اور مقابلہ کی باقاعدہ مجلس منعقد کی جس میں بنو تمیم کے شاعر و خطیب نے اپنی فصاحت، شاعری اور خطابت

کے جوہر دکھائے جس کے جواب میں حضرت حسان بن ثابتؓ اور حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ نے شاعری اور خطاب کے ذریعہ اسلام کے محاسن اور جناب نبی اکرم ﷺ کے خصائل ومحامد کا تذکرہ کیا، بنو تمیم کے سردار حضرت اقرع بن حابسؓ نے اس بات کا اعتراف کیا کہ مسلمانوں کا شاعر اور خطیب دونوں ہمارے شاعر اور خطیب سے برتر ہیں اور پھر بنو تمیم نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔

میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ آج بھی یہ "میڈیا وار" ہمارے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے اور ہمیں اسے چیلنج سمجھ کر ہی اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

دوسری بات آپ حضرات سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خطابت وفصاحت کے معیار، دور کے بدلنے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں، ہم درس نظامی میں حریری اور ہمدانیؒ کے مقامات درساً پڑھتے ہیں اور ان کے کلام اور خطبات سے محظوظ ہوتے ہیں، یہ ماضی کے ادبی ماحول سے شناسائی اور قدیم لٹریچر تک رسائی کے لئے تو بہت مفید ہیں لیکن آج آپ اس اسلوب میں خطبہ دیں گے تو آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے سامعین یہ سوچ کر آنکھیں بند کر لیں گے کہ مولوی صاحب شاید کوئی وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔

آج سے پون صدی پہلے خطابت کا معیار مولانا ابو الکلام آزادؒ تھے اور ان کا اسلوب خطابت کی دنیا کا حکمران تھا، نادر الفاظ اور مشکل تراکیب کے ساتھ بلند آہنگ لہجہ اور بلند پایہ محاورے، خطابت کے ضروری عناصر شمار ہوتے تھے۔ آج وہ دور نہیں ہے آج کے دور میں آپ جتنے سادہ الفاظ، سہل تراکیب اور عام فہم اسلوب میں بات کر سکیں اتنے ہی آپ کامیاب خطیب سمجھے جائیں گے۔

ہمارے ایک مخدوم ومحترم بزرگ حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ خطابت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ سامنے بیٹھے ہوئے لوگ اگر تمہاری بات سمجھ رہے ہیں تو

تم خطیب ہو ورنہ کچھ بھی نہیں ہو۔

اسی طرح اب سے پون صدی قبل خطابت پر امیر سید شریعت عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی حکمرانی تھی اور ان کی خطابت کا نقطۂ عروج یہ تھا کہ وہ ہزاروں کے اجتماع میں عشاء کے بعد خطاب کے لئے بیٹھتے تو صبح کی اذانیں سن کر لوگوں کو احساس ہوتا تھا کہ رات بیت چکی ہے اور امیر شریعتؒ کی خطابت کے سحر نے انہیں پوری رات جگائے رکھا ہے، آج خطابت کا کمال یہ نہیں ہے، آج اگر آپ مختصر وقت میں مکمل اور جامع بات کہنے اور سمجھا دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو آپ کامیاب خطیب ہیں ورنہ لوگوں کے پاس اب اتنا وقت نہیں رہا اور نہ ہی انہیں اتنی دلچسپی ہے کہ وہ زیادہ دیر بیٹھے آپ کا خطاب سنتے رہیں۔

تیسری بات اس حوالہ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری زبان اور خطابت میں ابھی تک مناظرے اور فتوے کا اسلوب غالب ہے، ہم دارالافتاء، مسند تدریس اور خطابت کے ممبر میں کوئی فرق نہیں کر پا رہے، ہمارے ہاں عمومی طور پر یہ ذوق پایا جاتا ہے کہ جس انداز میں ہم مسند تدریس پر گفتگو کرتے ہیں، عوامی خطابت اور درس میں بھی کم و بیش ہمارا وہی انداز ہوتا ہے اور جو اسلوب کسی شرعی سوال کا جواب دیتے ہوئے ہم فتویٰ نویسی میں اختیار کرتے ہیں، اسی اسلوب میں ہم عام مسلمانوں کو خطبہ اور درس میں مسائل سمجھانے کے درپے ہو جاتے ہیں، مجھے فتویٰ اور تدریس کی اہمیت میں سے کسی کا انکار نہیں ہے، لیکن خطابت کا دائرہ بہرحال ان سے مختلف اور اس کی ضروریات الگ ہیں کیونکہ خطابت میں کسی پر حکم لگانے کی بجائے اسے حکم سمجھانے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

چوتھی بات اس ضمن میں آپ دوستوں سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آج کی دنیا معلومات کی دنیا کہلاتی ہے، معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے، دینی حوالہ سے اب سے نصف صدی قبل لوگوں کے پاس معلومات کا ذریعہ صرف ہم ہوتے تھے، ہم کسی دینی مسئلہ میں انہیں جو معلومات مہیا کرتے تھے وہی ان کا مبلغ علم ہوتا تھا اور اسی پر انحصار کر کے وہ

ہماری رائے اور فتووں کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لیتے تھے، آج یہ صورتحال نہیں ہے، اخبارات، جرائد، کتابوں کے اردو تراجم اور سب سے بڑھ کر انٹرنیٹ کی صورت میں ان کے پاس معلومات کے متبادل ذرائع موجود ہیں، وہ ان سے معلومات حاصل کرتے ہیں، ہماری مہیا کردہ معلومات کے ساتھ ان کا تقابل بھی کرتے ہیں اور اس تقابل میں جو بات ان کے ذہن کے قریب ہو وہ اسے قبول کر لیتے ہیں، یہ صورتحال آئیڈیل نہیں ہے بلکہ میں علم کے بغیر معلومات کی وسعت کو فتنہ کا باعث سمجھتا ہوں، لیکن ہم اس صورتحال کو تبدیل نہیں کر سکتے، یہ اسی طرح جاری رہے گی اور اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگ خصوصاً نوجوان حضرات جب دوسرے ذرائع سے حاصل کردہ معلومات کے مقابلہ میں ہماری مہیا کردہ معلومات کو کمزور پاتے ہیں تو ان کے ذہنوں میں ہماری ثقاہت مشکوک ہو جاتی ہے، جو صرف ہمارا نہیں بلکہ دین کا بھی نقصان ہے، ہمیں اس تبدیلی پر نظر رکھنا ہو گی اور اس مشکل کا حل اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ ہم اپنے خطبوں میں لوگوں کو مستند مواد فراہم کریں۔ ہمارے سامعین اب ہم سے لفاظی کی بجائے مواد اور معلومات کا تقاضا کرتے ہیں اور ان کے ذہنوں میں اس مواد کے لئے حوالہ اور استناد کا سوال بھی ضرور ہوتا ہے، اس لئے ایک کامیاب خطیب کو زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنا چاہیے اور مستند معلومات کو اس انداز سے پیش کرنے کی مشق کرنی چاہیے کہ اس کے سامعین اس سے وہی نتائج اخذ کریں جو نتائج وہ ان کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے، یہ ایک مستقل فن ہے جو خطابت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس حوالہ سے دین کی خدمت کرنے اور اپنی ذمہ داریاں صحیح طریقہ سے سرانجام دینے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

توبہ اور استغفار کی ضرورت

"مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں مولانا زاہد الراشدی مدظلہ کا درس نماز فجر کے بعد تسلسل سے جاری ہے ہفتہ میں تین دن قرآن کریم اور تین دن حدیث نبوی ﷺ کا درس ہوتا ہے اور ان دنوں امام بخاری کی "الادب المفرد" کا درس چل رہا ہے، قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے 15 اگست 2011ء کو دیا جانے والا سورۃ التوبہ آیت نمبر 75 تا 77 کا درس پیش کیا جا رہا ہے"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ آتَانَا مِنْ فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ الصَّالِحِيْنَ o فَلَمَّا آتَاهُمْ مِنْ فَضْلِهِ بَخِلُوا بِهِ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُعْرِضُوْنَ o فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ إِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ o

"اور بعض ان میں سے وہ ہیں کہ عہد کیا اللہ سے اگر دے گا ہم کو فضل اپنے سے البتہ خیرات دیں گے ہم اور البتہ ہوں گے صالحوں سے پس جب دیا ان کو فضل اپنے سے بخیلی کی ساتھ اس کے اور پھر گئے اور وہ منہ پھیرنے والے ہیں پس اثر دے گیا ان کو نفاق بیچ دلوں ان کے اس دن تک کہ ملاقات کریں گے

اس سے بسبب اس کے کہ خلاف کیا تھا اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اور بسبب اس کے کہ تھے جھوٹ بولتے۔“ (ترجمہ: حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ)

غزوۂ تبوک کے موقع پر منافقین نے جہاد میں شرکت سے گریز کرنے اور پیچھے رہ جانے کے ساتھ ساتھ جو مختلف حرکتیں کی تھیں سورۃ التوبہ میں انہیں ایک ایک کر کے بیان کیا گیا ہے اور ان آیات میں بھی اسی تسلسل میں ایک اہم بات بیان فرمائی گئی ہے۔

بعض مفسرین کرامؒ نے ان آیات کے ضمن میں ثعلبہ بن حاطب نامی ایک صاحب کا واقعہ بیان کیا ہے اور محققین نے اس کے ساتھ یہ وضاحت فرمائی ہے کہ ثعلبہ بن حاطبؓ نامی معروف بزرگ بدری صحابی ہیں بدری صحابہؓ میں سے کسی بزرگ کے ساتھ نفاق کی نسبت درست نہیں ہے اس لئے یہ ثعلبہ وہ بدری صحابی نہیں ہیں بلکہ کوئی اور صاحب ہیں جنہیں منافقین میں شمار کیا جاتا ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے واقعہ بیان کیا ہے کہ ثعلبہ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کریں کہ مجھے بہت سا مال ملے تاکہ میں اس میں سے صدقہ خیرات کرسکوں اور فراغت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف ہو جاؤں۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال پر قناعت کرو اور زیادہ مال کی تمنا نہ کرو اس لئے کہ زیادہ مال بسا اوقات فتنہ بھی بن جایا کرتا ہے لیکن ثعلبہ کا اصرار جاری رہا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لئے کثرت مال کی دعا کر دی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی، اس کا بھیڑ بکریوں کا کاروبار تھا، چند ہی دنوں میں مدینہ منورہ کی گلیوں میں ہر طرف اس کی بھیڑیں نظر آنے لگیں حتیٰ کہ مدینہ منورہ کی گلیاں تنگ پڑ گئیں اور اس نے کچھ فاصلے پر جگہ لے کر اپنا کاروبار وہاں منتقل کر لیا، بھیڑوں میں مسلسل مصروفیت

کی وجہ سے نماز کے لئے مسجد میں حاضری متاثر ہونے لگی حتیٰ کہ عام نمازوں کے علاوہ جمعہ کی حاضری بھی کم ہوگئی اور کاروبار میں مگن ہونے کی وجہ سے مسجد نبوی ﷺ کی حاضری بالآخر بالکل ہی منقطع ہو کر رہ گئی۔

کچھ عرصہ کے بعد جناب نبی اکرم ﷺ کی طرف سے مقرر کردہ عاملین نے لوگوں سے سالانہ زکوٰۃ وصول کرنا شروع کی تو ایک نمائندہ ثعلبہ کے پاس بھی گیا اور اسے نبی اکرم ﷺ کا پیغام دیا کہ وہ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرے جس پر اس کا فوری تبصرہ یہ تھا کہ ''یہ جزیہ تو کافروں پر لگایا جاتا ہے'' یہ کہہ کر اس نے زکوٰۃ دینے سے گریز کیا، جناب نبی اکرم ﷺ کو رپورٹ ملی آپ ﷺ کی زبان مبارک سے تین مرتبہ یہ جملہ نکلا ''ویح ثعلبة'' ثعلبہ کے لیے بربادی ہے، بعد میں ثعلبہ کو اپنی حرکت کا احساس ہوا تو جناب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور معذرت کر کے زکوٰۃ ادا کرنے کی پیش کش کی مگر نبی اکرم ﷺ نے معذرت اور زکوٰۃ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جناب نبی اکرم ﷺ کے وصال کے بعد ثعلبہ اپنی زکوٰۃ لے کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور زکوٰۃ پیش کی، خلیفہ اولؓ نے بھی یہ کہہ کر اس کی زکوٰۃ لینے سے انکار فرما دیا کہ جب نبی اکرم ﷺ نے یہ زکوٰۃ نہیں لی تو میں کیسے وصول کر سکتا ہوں؟ حضرت صدیق اکبرؓ کی وفات کے بعد ثعلبہ نے حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضری دی مگر وہاں سے بھی وہی جواب ملا، ان کے بعد حضرت عثمانؓ نے بھی اس کی زکوٰۃ وصول نہیں کی اور ان کے دورِ خلافت میں ثعلبہ کا اسی حالت میں انتقال ہو گیا، اس واقعہ کی روایت پر بعض محدثین نے کلام بھی کیا ہے لیکن اس کے باوجود بہت سے مفسرین کرامؒ نے ان آیات کے ضمن میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

مگر میں اس سے قطع نظر ان آیات کے عمومی مفہوم کے حوالہ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کر کے اور اس وعدہ کے ساتھ دعا کر کے مال حاصل کیا کہ وہ اس مال کے ذریعہ نیکی کا راستہ اختیار کریں گے اور صدقہ خیرات کرتے رہیں گے

لیکن بعد میں بخل سے کام لیا اور اپنے وعدہ کو پورا کرنے سے اعراض کر کے منہ پھیر لیا ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس سزا کا اعلان کیا ہے کہ ان کے دلوں میں نفاق پیدا ہو گا جو مرتے دم تک رہے گا، اس نفاق کے دو سبب اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو عہد کیا تھا وہ انہوں نے توڑ دیا اور دوسرا سبب یہ ذکر کیا ہے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے۔

یہ جرم اور اس کی یہ سزا اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ کے ان منافقین کے حوالہ سے بیان فرمائی ہے جو تبوک کے غزوہ میں جھوٹے بہانے کر کے پیچھے رہ گئے تھے اور نہ صرف یہ کہ خود نہیں گئے تھے بلکہ جہاد میں مال خرچ کرنے میں بھی انہوں نے بخل سے کام لیا تھا۔

لیکن آیات کریمہ کا عمومی مفہوم سامنے رکھ کر میں آج کے حالات کے بارے میں توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ کل ہی ہم نے پاکستان کا یوم آزادی منایا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ بھی کچھ اس طرح کا معاملہ ہی ہو گیا ہے۔

ہم نے قومی طور پر اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ ہندوؤں سے الگ آزاد ریاست مل جائے تو ہم اللہ تعالیٰ کا قانون اور نظام نافذ کریں گے اور شریعت مطہرہ کے مطابق ملک و حکومت کا نظام چلائیں گے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں الگ ملک دے دیا اور وسائل بھی عطا فرمائے مگر ہم نے اس عہد کی پاسداری نہیں کی اور قرآن و سنت کا نظام نافذ کرنے سے مسلسل گریز کر رہے ہیں پھر ہم اس حوالہ سے اور دیگر بہت سے حوالوں سے بھی مسلسل جھوٹ بولتے جا رہے ہیں، ہم قومی سیاست میں جھوٹے وعدے کرتے ہیں، توڑ دیتے ہیں اور لگاتار جھوٹ بولتے جا رہے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم قومی سطح پر منافقت اور کرپشن کا شکار ہو چکے ہیں۔

بد دیانتی، دھوکہ، فریب کاری، جھوٹ اور دھوکہ بازی ہمارا معاشرتی اور قومی مزاج

بن چکا ہے اور اس صورت حال میں اصلاح کا کوئی ظاہری راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔

آج کرپشن، منافقت اور بد دیانتی کا ہر طرف دور دورہ ہے اور نیچے سے اوپر تک ہم اس کا شکار ہیں، اس کا اعتراف بھی ہر شخص کر رہا ہے مگر اصلاح کے لئے کوئی عملی طور پر تیار نہیں ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمہ جہتی کرپشن اور منافقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا ہے اور ہماری اس اجتماعی بدعہدی کا نتیجہ ہے جو ہم نے پاکستان کے قیام اور اس کے بعد اسلامی نظام کے نفاذ کے حوالہ سے کی ہے اور اس سے نجات کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اس اجتماعی اور قومی بدعہدی سے توبہ کریں اور جھوٹ بولنا ترک کر کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہوا وعدہ عملی طور پر پورا کریں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اجتماعی توبہ اور استغفار کے ساتھ اصلاح احوال کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

تذکرہ حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ اور حسنین رضی اللہ عنہما

"17 دسمبر 2011ء بروز ہفتہ بعد نماز عشاء جامعہ حنفیہ قادریہ باغبانپورہ لاہور کی شاخ جامع مسجد عمر فاروقؓ شمع پارک سلامت پورہ میں امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ اور سیدنا امام حسینؓ کی یاد میں منعقد ہونے والے جلسے سے خطاب کا خلاصہ"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

امابعد!

میرے لئے اور آپ سب حضرات کے لئے سعادت کی بات ہے کہ عالم اسلام کی دو بزرگ شخصیتوں سیدنا حضرت فاروق اعظمؓ اور سیدنا امام حسینؓ کے تذکرہ کے لئے منعقد ہونے والے اس جلسہ میں ہم شریک ہیں اور ہمیں ان دو عظیم ہستیوں کے تذکرہ اور ان کی تعلیمات وارشادات سے فیض یاب ہونے کا موقع مل رہا ہے، اللہ تعالیٰ ہمارا مل بیٹھنا قبول فرمائیں اور بزرگان دین کی برکات سے دنیا اور آخرت دونوں جگہ ہمیں مالا مال فرمائیں، آمین یارب العالمین

ہجری سال کے پہلے ماہ محرم الحرام کا آغاز عام طور پر انہی بزرگوں کے تذکرہ سے ہوتا ہے اور ان کی خدمات، قربانیوں اور فضائل کا ذکر کیا جاتا ہے، دونوں بزرگوں کی زندگیاں تاریخ کا حصہ ہیں اور ہر ایک کے تذکرہ کے بیسیوں پہلو ہیں جن کا احاطہ مختصر مجلس میں ممکن

نہیں ہے، اس لئے میں دونوں بزرگوں کی زندگیوں، خدمات اور قربانیوں کے بیسیوں پہلوؤں میں سے صرف ایک دو پہلوؤں پر کچھ عرض کرنا چاہوں گا اور ان کے ساتھ ایک تیسرے بزرگ کا تذکرہ بھی شامل کروں گا اور وہ سیدنا امام حسنؓ ہیں، جناب نبی اکرم ﷺ نے بعض ارشادات میں ان دونون کا اکٹھا ذکر فرمایا ہے مثلاً "سیدا شباب اھل الجنۃ" یا "ھما ریحا نتای" کہ یہ دونوں جنت میں نوجوانوں کے سردار ہوں گے اور یہ دونوں میرے چمنستان کے دو پھول ہیں، ہمارے ہاں عام طور پر نام بھی دونوں بھائیوں کا اکٹھے لیا جاتا ہے، مگر حضرت امام حسنؓ کا تذکرہ اہتمام کے ساتھ نہیں ہوتا اس لئے میرا جی چاہتا ہے کہ تینوں بزرگوں کا تھوڑا تھوڑا تذکرہ ہو جائے۔

سیدنا حضرت عمر فاروقؓ اور سیدنا امام حسینؓ کے تذکرہ میں ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ دونوں بزرگوں کی شہادت کا تعلق نماز سے ہے، حضرت عمرؓ پر نماز فجر کے دوران حملہ ہوا تھا، روایات میں آتا ہے کہ امیر المؤمنینؓ نے مسجد نبوی ﷺ میں فجر کی نماز پڑھائی، ابھی وہ اللہ اکبر کہہ پائے تھے کہ ابولؤلؤ مجوسی نے ان پر زہریلے خنجر سے وار کر دیا جس سے وہ گر پڑے لیکن فوراً ہی حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے ان کی جگہ کھڑے ہو کر نماز مکمل کی، صحابہ کرامؓ کے ہاں نماز کی اہمیت کیا تھی؟ اس کا اس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پچھلی صفوں والے کہتے ہیں کہ ہمیں صرف اتنا ہی پتا چل سکا کہ اللہ اکبر حضرت عمرؓ نے کہا تھا مگر قراۃ میں آواز بدل گئی تھی اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ فاتحہ کی قرأت کر رہے تھے، امیر المؤمنین کے زخمی ہو کر گر پڑنے کے باوجود پہلے نماز کی تکمیل کی گئی، اس حوالہ سے ایک اور واقعہ بھی مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ زخمی حالت میں بستر پر تھے اور طبیب حضرات مایوسی کا اظہار کر رہے تھے، اس موقع پر ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے زخمی والد محترم کو یاد دہانی کرائی کہ آپ کی فجر کی نماز ابھی باقی ہے، روایت میں ہے کہ دوبارہ حضرت عمرؓ کو ان کے کہنے پر تیمم کرایا گیا اور نماز شروع کرتے ہی وہ پھر بے ہوش

ہو گئے مگر بیٹے کو آخر وقت تک یہی فکر رہا کہ کہیں میرے والد محترمؓ کے ذمہ فجر کی نماز باقی نہ رہ جائے جب کہ حضرت امام حسینؓ کی تو شہادت ہی نماز کے دوران ہوئی ہے، ہم ان بزرگوں کا تذکرہ تو کرتے ہیں مگر ان کا یہ آخری سبق کس حد تک یاد ہے اور ہم نماز کی پابندی کے حوالہ سے ان کی کتنی پیروی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، حضرت عمرؓ کا تاریخ میں یہ اعزاز ہے کہ انہیں انصاف اور عدل کی علامت سمجھا جاتا ہے اور وہ فی الواقع عدل اور انصاف کا سمبل تھے، آج مغرب کے مؤرخ بھی عدل و انصاف، گڈ گورننس اور ویلفیئر اسٹیٹ کے حوالہ سے حضرت عمرؓ کے دور حکومت کا تذکرہ بطور آئیڈیل اور مثال کرتے ہیں اور متحدہ ہندوستان کے دور میں ایک الیکشن کے بعد جب بعض صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں قائم ہوئیں تو کانگریس کے سب سے بڑے سینئر مہاتما گاندھی نے اپنے اخبار ''ہریجن'' میں کانگرسی وزراء کے نام ہدایات تحریر کیں جن میں یہ بھی تھا کہ اگر انصاف اور عدل کے ساتھ حکومت کرنا چاہتے ہو تو ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی زندگیوں اور طرز حکومت کو سامنے رکھو اور ان کی پیروی کرو۔

برطانیہ کو ویلفیئر اسٹیٹ کی شکل دینے کے لئے ناداروں، مریضوں، کم آمدنی والوں، معذوروں اور دیگر کمزور افراد اور خاندانوں کو وظیفے دینے کا جو سسٹم وہاں شروع کیا گیا تھا، اور وہ ابھی تک جاری ہے، اس کے بارے میں خود برطانوی راہنماؤں کا کہنا ہے کہ اس کا بنیادی ڈھانچہ حضرت عمرؓ کے بیت المال کے نظام سے لیا گیا ہے۔ جبکہ ناروے کے بارے میں روایت ہے کہ وہاں بچوں کو دیے جانے والے سرکاری وظیفے کا نام ہی ''عمر الاؤنس'' ہے اور ان کا کہنا ہے کہ چونکہ یہ تصور حضرت عمرؓ سے لیا گیا ہے اس لئے وظیفے کا نام بھی وہی رکھا گیا ہے۔

حضرت عمرؓ بیت المال سے اپنے شہریوں کو جو وظیفے دیا کرتے تھے اس کے حوالہ سے حضرت عمرؓ اور حضرت حسینؓ کا بھی ایک دلچسپ واقعہ مؤرخین نے بیان کیا ہے، جس

سے ان دو بزرگوں کے جو چچا بھتیجا ہی لگتے تھے باہمی تعلقات اور محبت و ادب کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، حضرت عمرؓ نے وظائف میں درجہ بندی کر رکھی تھی، جب کہ حضرت ابوبکرؓ اس درجہ بندی اور گریڈ سسٹم کے قائل نہیں تھے اور وہ بڑے چھوٹے یا فضیلت کا لحاظ کئے بغیر سب کو برابر وظیفے دیا کرتے تھے مگر حضرت عمرؓ نے درجہ بندی کر کے گریڈ سسٹم بنا دیا اور فضیلت کے حساب سے پانچ چھ درجے کر کے ان کے مطابق وظیفے دیا کرتے تھے، اسی تقسیم میں انہوں نے حضرت حسینؓ کا وظیفہ اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے زیادہ رکھا تھا، جب کہ گریڈ سسٹم کے حوالہ سے وہ دونوں ایک ہی درجہ میں شمار ہوتے تھے، اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے والد محترم حضرت عمر فاروقؓ سے ایک موقع پر شکوہ کیا کہ آپ مجھے حسینؓ سے کم وظیفہ دیتے ہیں، حالانکہ ہم دونوں کو برابر وظیفہ ملنا چاہیے، روایات میں ہے حضرت عمرؓ نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ تم حسینؓ کے ساتھ برابری کی بات کیسے کر رہے ہو؟ تم عمرؓ کے بیٹے ہو اور وہ رسول اللہ ﷺ کا نواسہ ہے اور تمہارا باپ اگر آج امیر المؤمنین ہے تو حسینؓ کے نانا کی برکت سے ہے اس لئے اس سوچ کو ذہن سے نکال دو، سیدنا حضرت حسنؓ اور سیدنا حضرت حسینؓ جناب نبی اکرم ﷺ کے نواسے اور رسالت مآب ﷺ کی گود میں پرورش پانے والے نوجوان تھے اور ان دونوں کی عظیم قربانیاں ہیں۔

حضرت حسنؓ کی قربانی یہ ہے کہ انہوں نے امت میں وحدت پیدا کرنے کے لئے اقتدار اور حکومت سے دست برداری اختیار کی، وہ جب حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد خلیفہ بنے تو اس وقت کیفیت یہ تھی کہ ان کے پاس اور ان کے مقابل حضرت امیر معاویہؓ کے پاس بڑی بڑی فوجیں تھیں، دونوں طرف لڑائی کا جذبہ موجود تھا اور جنگ کے امکانات دن بدن بڑھتے جا رہے تھے، حضرت امیر معاویہؓ کے سامنے ان کے ایک دوست نے اس صورت حال کا ذکر کیا تو وہ بڑے متحمل مزاج بزرگ تھے فرمانے لگے کہ لڑائی کی باتیں نہ کرو

اگر خدانخواستہ جنگ ہوگئی تو ہزاروں کی تعداد میں بچوں اور بیواؤں کو سنبھالنے والا کون ہوگا؟ انہوں نے دانشمندی کا مظاہر کرتے ہوئے حضرت حسن ؓ کو صلح کا پیغام بھیجا اور پیشکش کی کہ وہ جو شرائط بھی عائد کریں گے وہ منظور کر لی جائے گی، ادھر حضرت حسن ؓ نے بھی کمال دانشمندی سے کام لیا اور مناسب شرائط منوانے کے بعد حضرت امیر معاویہ ؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے ٹوٹی ہوئی امت کو جوڑ دیا اور اپنے نانا جناب نبی اکرم ﷺ کی پیش گوئی پوری کر دی۔

حدیث میں ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے ایک موقع پر جمعۃ المبارک کے خطبہ کے دوران اپنے نواسے کو گود میں لے کر یہ ارشاد فرمایا تھا کہ

”ان ابنی ھذا سیدا وسیصلح اللہ بہ بین فئتین عظمتین من المسلمین“

میرا یہ بیٹا سردار ہے اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائیں گے، حضرت حسن ؓ نے اقتدار کی قربانی دے کر اور خلافت سے دست بردار ہو کر جناب نبی اکرم ﷺ کی اس پیشگوئی کی تکمیل کر دی، وہ کمزور نہیں تھے، اگر وہ لڑنا چاہتے تو بہت خوفناک جنگ بپا ہوتی، دوسری طرف حضرت معاویہ ؓ بھی کمزور نہیں تھے اور بہت بڑا لشکر رکھتے تھے لیکن دونوں بزرگوں نے تحمل، بردباری اور حوصلے سے کام لیا جس سے ٹوٹی ہوئی امت جڑ گئی اور مسلمانوں کو پھر سے وحدت نصیب ہوئی۔

سیدنا حضرت حسین ؓ کی قربانی بہت بڑی تھی اور بہت بڑے مقصد کے لئے تھی، انہوں نے صرف جان کا نذرانہ پیش نہیں کیا بلکہ اپنا خاندان ذبح کرا دیا کس لئے؟ اس لئے کہ وہ یزید کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھتے تھے جس پر اس سے پہلے حضرت ابو بکر صدیق ؓ، حضرت عمر ؓ، حضرت عثمان ؓ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ ؓ فائز رہ چکے تھے، حضرت حسین ؓ خلافت کے اس معیار کو قائم رکھنا چاہتے تھے اور اسی کے لئے میدان میں آئے تھے گویا حضرت عمر فاروق ؓ نے محنت، ایثار، قربانی اور جرأت و حوصلہ کے ساتھ حکومت میں

دیانت و اہلیت کا جو معیار قائم کیا تھا حضرت حسینؓ کو اس میں کمی گوارا نہ تھی اور اس طرزِ حکومت اور مزاجِ حکمرانی کو باقی رکھنے کے لئے اڑ گئے تھے، حتیٰ کہ انہیں اپنے خاندان سمیت جام شہادت نوش کرنا پڑا۔

آج ہمارے لیے تینوں بزرگوں کی زندگیوں اور خدمات میں سبق موجود ہے، حضرت عمرؓ کے بارے میں تو ہمارے چیف جسٹس صاحب بھی فرماتے ہیں کہ اگر ملک میں کرپشن کو ختم کرنا ہے اور گڈ گورننس کا قیام عمل میں لانا ہے تو ہمیں حضرت عمر فاروقؓ کی پیروی کرنا ہوگی اور ان کے طرز حکومت کو اپنانا ہوگا، جب کہ حضرت حسنؓ کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ امت کی وحدت کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیے اور مسلمانوں میں اتحاد کے لئے ہر وقت محنت کرنی چاہیے، اسی طرح سیدنا حضرت حسینؓ کی قربانی اور شہادت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ظلم و جبر کے خاتمہ اور عدل و انصاف کے قیام کے لئے ڈٹ جانا ہی اہل حق کی نشانی ہے، اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کے درجات بلند سے بلند فرمائیں اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

تحفظ سنّت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ

وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اما بعد!

حضرات علماء کرام، محترم بزرگو، دوستو، بھائیو اور ساتھیو!

ایک طویل عرصہ کے بعد ملتان میں کسی علمی اجتماع میں گفتگو کا موقع مل رہا ہے۔ میں ''تحفظِ سنت کانفرنس'' کے حوالہ سے اب تک ہونے والی ساری گفتگو کے پس منظر میں تین گزارشات اختصار سے پیش کروں گا۔

پہلی گزارش یہ ہے کہ سنت کا مقام اور مفہوم کیا ہے۔ دوسرے نمبر پر سابقہ گفتگو میں امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ کی عظمت، ان کی خدمات، علمی کارناموں ان کے اجتہادات کا تذکرہ ہوا، بالخصوص یہ بات کہ انہوں نے بہت سے فتنوں کا مقابلہ کیا۔ اس حوالہ سے ایک واقعہ عرض کرتا ہوں کہ انہوں نے فتنوں کا مقابلہ کس حوصلے اور جرأت کے ساتھ کیا۔ اور اس واقعہ میں آج ہمارے لیے بھی سبق ہے۔ تیسرے نمبر پر پورے دین کو بالخصوص ''سنت'' کو آج کن خطرات کا سامنا ہے۔ سنت کے مفہوم اور اس کی تعریف پر بہت سی باتیں ہو چکیں۔ میں بھی ایک چھوٹی سی بات عرض کروں گا۔

سنت کا مقام و حیثیت امام شافعیؒ کے حوالہ سے:

تفسیر قرطبی میں سورۃ الحشر آیت نمبر 7 ''وَمَا آتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ

فَانْتَهُوْا ‘‘ کی تفسیر میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ جو’’اہل سنت‘‘ کے جلیل القدر امام ہیں اور امت کے مقتدیٰ ہیں ۔تشریف فرماتھے اہل علم کی مجلس تھی ،گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: آج جو مسئلہ پوچھو گے قرآن کی روشنی میں جواب دوں گا۔ایک درویش نے پوچھا کہ حضرت! حالتِ احرام میں بھڑکو مارنا جائز ہے یا نہیں؟ (چونکہ حالتِ احرام میں شکار کرنا اور کسی جانور کو ذبح کرنا حرام ہے مگر یہ کہ وہ چیز موذی ہو اور اس سے جان کو خطرہ ہو تو اس کو مارنے کی اجازت ہے) فرمایا: جائز ہے ۔ پوچھا کہ کیا یہ قرآن میں ہے؟ (کیونکہ دعویٰ یہ کیا تھا کہ مسئلہ قرآن سے بتاؤں گا) فرمایا: ہاں ،قرآن میں ہے ،وہ اس طرح کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے’’وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ‘‘’’ کہ اللہ تعالیٰ کا رسول تمہیں جس کام کے کرنے کا حکم کرے وہ کرو اور جس سے روکے تو اس سے رک جاؤ‘‘ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے ہر ارشاد کو قران کی تعلیمات کا حصہ بنا دیا۔ چونکہ حضور اکرم ﷺ ، اللہ کے نمائندہ (رسول) ہیں ، اس لئے آپ ﷺ کی ہر بات اللہ تعالیٰ ہی کی ہو گی ۔ چونکہ یہ بات جب تسلیم ہو چکی کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے ہی نمائندہ ہیں تو اب جو ارشاد بھی فرمائیں گے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوگا۔

الغرض: امام شافعیؒ نے یہ آیت پڑھی (تو معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کے تمام اوامر اور نواہی بھی قرآنی تعلیمات کا حصہ ہیں) اور فرمایا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:’’ علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهديين ‘‘ کہ تم پر لازم ہے کہ میری سنت کو پکڑو اور میرے خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے پکڑو۔ پہلے قران میں (اللہ تعالیٰ نے) جناب نبی اکرم ﷺ کے جملہ ارشادات کو اپنی تعلیمات کا حصہ بتایا اور پھر جناب نبی کریم ﷺ نے خلفائے راشدینؓ کی سنت کو اپنی سنت قرار دیا۔ (اس کے بعد امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا) یہ فتویٰ حضرت عمرؓ نے دیا ہے کہ’’ حالتِ احرام‘‘ میں بھڑ کا مارنا جائز ہے ۔گویا کہ حضرت عمرؓ کا فتویٰ سنتِ رسول ﷺ ہے اور’’سنتِ رسول ﷺ‘‘ قرآنی تعلیمات کا حصہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ سنت رسول ﷺ اور سنتِ خلفائے راشدینؓ یہ سب قرآنی تعلیمات کا حصہ ہیں، جو بات اور جو مسئلہ ان سے ثابت ہوگا وہ قرآن سے سمجھا جائے گا۔

جیسا کہ علامہ خالد محمود صاحب مدظلہ نے اپنی تقریر میں (غیر مقلد عالم) مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ کے حوالہ سے ذکر فرمایا تھا کہ انہوں نے لکھا تھا کہ عراق میں فتنے پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان فکری اور اعتقادی فتنوں کے مقابلے کے لئے ایک ''مردِ آہن'' کھڑا کیا اور وہ مردِ آہن امام اعظم ابوحنیفہؒ تھے۔

امام اعظمؒ کے کارناموں کی ایک جھلک:

تفصیل کا وقت نہیں، صرف ایک جھلک سناتا ہوں کہ اس ''مردِ آہن'' نے ان تمام باطل فرقوں کا مقابلہ کس طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کیا۔ ''خارجی'' اس دور کا بڑا (خطرناک) مسلح اور طاقت ور فتنہ تھا، جس نے کئی علاقوں پر قبضہ کیا اور ہزاروں مسلمان شہید کئے، لاکھوں مسلمانوں کو بے گھر کیا اور اس زمانے میں ''کوفہ'' پر قبضہ کر لیا۔

ضحاک خارجی نے عبداللہ بن عمرؒ (جو کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے صاحبزادے ہیں) کو شکست دی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کو بنوامیہ نے کوفہ کا گورنر بنایا تھا۔

خارجیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر ہوتا ہے، اس لئے کبیرہ گناہ کرنے والے سب مسلمان کافر ہیں۔ وہ کافر قرار دے کر ان سے توبہ کرواتے تھے اور جو توبہ نہ کرتا تھا اس کو قتل کر دیتے تھے۔ ہزاروں لوگ قتل ہوئے اور ''بصرہ'' میں مقتولین کی لاشوں کے ڈھیر لگا دیے۔ اب کوفہ میں آئے یہاں بھی یہی پروگرام بنایا۔ کوفہ پر قبضہ کے بعد بڑے بڑے علماء کرام کو گرفتار کرنا شروع کیا، حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ایک دن آیا کہ ضحاک خارجی ہزاروں جنگ جو خارجیوں کے ساتھ ننگی تلواریں لیے مسجد کے صحن میں بیٹھا ہوا تھا اور امام اعظمؒ ایک ملزم کے طور پر اس کے سامنے پیش ہوئے۔ ضحاک نے کہا کہ ''یا شیخ تب من الکفر'' کہ باباجی! کفر سے توبہ کرو۔ امام صاحبؒ نے جواب

دیا: ’’تبت من کل کفر ‘‘ کہ میں نے ہر کفر سے توبہ کی۔ اس نے کہا کہ چھوڑ دو۔ امام صاحبؒ (رہا ہو کر) باہر نکلے تو کسی نے کہا کہ بابا کہہ کیا گیا ہے؟ ذرا غور تو کرو! لگتا یہ ہے کہ وہ تمہارے کفر سے توبہ کر گیا ہے۔ اس نے کہا اچھا! واپس لے آؤ، امام صاحبؒ پھر لائے گئے، پوچھا کہ آپ نے جو یہ کہا کہ ’’میں نے ہر کفر سے توبہ کی‘‘ اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟ امام صاحبؒ نے فرمایا: آپ کیا سمجھے ہیں؟ اس نے کہا کہ ہمیں یہ خیال ہوا ہے کہ شاید آپ نے ہمارے عمل کو کفر قرار دے کر اس سے توبہ کا اظہار کیا ہے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا: کہ تمہارا یہ خیال یقین کی بنیاد پر ہے یا گمان و شک کی بنیاد پر؟ اس نے کہا کہ گمان ہے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ قرآن میں ہے: ’’ان بعض الظن اثم ‘‘ کہ گمان پر فیصلے کرنا گناہ ہے تو تم خود کافر ہو گئے ہو، پہلے خود توبہ کرو، تم نے کبیرہ گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ اور مجھے بلاوجہ گرفتار کروایا ہے لہٰذا تم کافر ہو گئے اور کفر سے توبہ کرو، اب ضحاک نے کہا کہ میں نے توبہ کی، تم بھی توبہ کرو۔ پھر آپ نے فرمایا: کہ میں نے ہر کفر سے توبہ کی۔ ضحاک نے کہا: باباجی کو چھوڑ دو۔ امام صاحبؒ چلے گئے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ کوفہ کی جامع مسجد کے صحن میں ضحاک خارجی اور ہزاروں خارجی ننگی تلواریں لئے کھڑے ہیں اور کوفہ کی آبادی میں سراسیمگی اور خوف و ہراس ہے کہ نامعلوم آج ہمارے ساتھ کیا ہو گا۔ لوگوں نے کہا کہ اس ظالم بدبخت کے سامنے کسی کو بات کرنی چاہیے ورنہ یہ جس طرح بصرہ والوں کو قتل کروا چکا ہے اب کوفے والوں کو بھی مروا دے گا۔ اس دوران کچھ حضرات مشورہ کر کے امام اعظمؒ کے پاس گئے کہ حضرت! آپ نے اس سے پہلے گفتگو کی ہے۔ آپ ہی اب یہ کام کر سکتے ہیں خدا کے لئے کوفہ والوں کی طرف سے آپ ہی جائیں اور جان بخشی کی راہ نکالیں۔ آپؒ تشریف لے گئے۔ خارجی تلواریں لئے کھڑے ہیں اور ضحاک کرسی پر بیٹھا ہے۔ پوچھتا ہے: شیخ کیوں آئے ہو؟ فرمایا: ایک بات کرنے آیا ہوں کہ آپ جو توبہ کا حکم دے رہے ہیں اور توبہ نہ کرنے والوں کو

قتل کر رہے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا یہ مرتد ہو چکے ہیں، جس کی وجہ سے قتل ہو رہے ہیں؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپؒ نے فرمایا: مرتد کسے کہتے ہیں؟ اس نے کہا کہ جو دین کو چھوڑ دے وہ مرتد ہے۔ فرمایا: یہ لوگ جس دین پر پہلے قائم تھے کیا اس میں کوئی تبدیلی کر دی ہے یا پہلے دین پر ہی قائم ہیں؟ اس نے کہا ٹھہرو، مجھے سوچنے دو، دوبارہ سوال دہراؤ۔ آپ نے فرمایا کہ مرتد تو اسے کہتے ہیں جو اپنا دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کر لے اور یہ (غریب) تو جس دین پر پیدا ہوئے اسی دین پر قائم ہیں تو مرتد کیسے ہو گئے؟ ضحاک نے کہا: ''خطأنا'' ہم سے غلطی ہو گئی، بابا ٹھیک کہتا ہے۔ حکم دیا کہ تلواریں نیچی کر لو اور امام صاحبؒ کی اس دلیل پر ''اہل کوفہ'' کے قتل عام کا فیصلہ واپس لے لیا۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ ''کوفے والے تو سارے کے سارے امام ابو حنیفہؒ کے موالی (آزاد کردہ غلام) ہیں۔ ان کی گردنیں تو امام صاحبؒ کی اس جرأت کی وجہ سے چھوٹی ہیں''۔

تو یہ تھی ایک جھلک کہ امام صاحبؒ نے کفر، فتنوں اور الحاد کا مقابلہ کس جرأت اور حوصلے سے کیا صرف ایک جھلک آپ کو سنائی ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ کو اپنے دور کی تین سیاسی قوتوں کے مظالم کا نشانہ بننا پڑا۔ بنو امیہ کی طرف سے ابن ہبیرہ کوفہ کا گورنر تھا امام صاحبؒ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم و مفتی کی حیثیت سے پورے علاقے کے مقتدیٰ تھے۔ گورنر نے امام صاحبؒ کو قاضی بننے کی پیش کش کی۔ مقصد قاضی بنانا نہیں تھا، بلکہ مقصد تو یہ تھا کہ جب یہ قاضی بنیں گے تو مجھے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل ہوں گی، اور لوگوں کی جو ہم سے مخالفت ہے اس میں کمی آجائے گی۔ امام صاحبؒ نے انکار کر دیا۔ اس نے دباؤ ڈالا آپؒ نے انکار فرمایا: اس نے کہا کہ اگر قاضی نہ بنے تو میں آپ کو سزا دوں گا۔ آپؒ نے فرمایا جو مرضی ہو جائے میں قاضی نہیں بنوں گا۔ کوفہ کے علماء کا ایک بڑا وفد امام صاحبؒ کی خدمت میں گیا اور کہا کہ حضرت آپ کیا کر رہے ہیں؟ یہ تو آپ کو مروا دے گا، جیل میں ڈال دے گا اور کوڑے مارے جائیں گے، آپ

منصبِ قضاء کیوں قبول نہیں فرماتے؟ امام صاحبؒ نے ایک جواب دیا فرمایا: دیکھو! ان لوگوں کا حال تو تمہیں معلوم ہے۔ کل یہ (گورنر) کسی سیاسی مخالف کے قتل کا فیصلہ کر دے گا تو مُہر تو قاضی کی لگے گی۔ تو کیا تم مجھے اس پر مُہر لگانے کی اجازت دیتے ہو؟ اور فرمایا کہ میں اپنی جان تو دے دوں گا مگر یہ منصب قبول نہیں کروں گا۔ اس پر ابن ہبیرہ نے امام صاحبؒ کو ایک سو دس کوڑوں کی سزا دی، روزانہ بازار میں اعلان کر کے، لوگوں کو اکٹھا کر کے امام صاحبؒ کی کمر پر دس کوڑے مارے جاتے۔ یہ ہے امام صاحبؒ کی جرأت، شجاعت، استقامت سبحان اللہ۔

بنو عباس کے دور میں منصور نے تو ظلم کی انتہاء کر دی۔ اس کے دور میں امام صاحبؒ کو قاضی القضاۃ کے عہدے کی پیشکش کی گئی، اور کہا گیا کہ بیت المال کے انچارج آپ ہوں گے، آپ کی مرضی کے بغیر کوئی پیسہ خرچ نہ ہوگا، کوئی جج آپ کی مرضی کے بغیر مقرر نہ ہوگا، آپؒ نے قبول کرنے سے انکار فرما دیا۔ اس پر امام صاحبؒ کو پہلے کوڑے مروائے گئے، پھر جیل میں ڈالا گیا، اور پھر ظلم کی انتہاء یہ کی گئی کہ جیل میں ہی آپؒ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا (انا للہ وانا الیہ راجعون)

سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام دینی علوم کا سرچشمہ ہے:

یہ مجلس ''سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تحفظ'' کے لئے منعقد کی گئی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا کہ ''سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام دینی علوم کا سرچشمہ ہے''۔ اہلِ سنت والجماعت کے دلائل چار ہیں۔

(1) قرآن، (2) سنت، (3) اجماع، (4) قیاس

ان سب کا سرچشمہ سنت ہے۔ آج دنیا میں سنت کو کیا خطرات درپیش ہیں اور ہمیں ان خطرات سے بچنے کے لئے کیا کردار ادا کرنا ہے؟ اس سلسلہ میں صرف دو تین مثالیں عرض کروں گا۔

آج کل ایک مسئلہ اخبارات میں چل رہا ہے "حدود آرڈیننس"

کفریہ طاقتوں کے اسلام دشمنی پر مبنی تین بڑے مطالبات:

حدود کہتے ہیں "جرائم کی وہ سزائیں جو قرآنِ پاک اور سنت رسول ﷺ اور اجماع صحابہؓ نے طے کر دی ہوں"۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں علماء اور عوام کی طویل جدوجہد کے بعد برائے نام "حدود شریعہ" نافذ ہوئیں تھیں، اگرچہ عمل نہیں ہوتا رہا۔ اس وقت عالم استعمار کے جو آپ مسلمانوں سے مطالبات ہیں اور وہ تحریری طور پر لکھ کر دیئے گئے ہیں اور جن کے لئے بہت زیادہ سنجیدگی کے ساتھ ہر جگہ ورک (Work) ہو رہا ہے وہ تین بڑے مطالبات ہیں۔ جب ہمارے صدر محترم (جنرل مشرف صاحب) واشنگٹن تشریف لے گئے تھے تو وہاں ان کی موجودگی میں "امریکی کانگریس" نے قرارداد پاس کی تھی اور جب یہ واپس پہنچے تو فوراً ہی امریکہ کے نمائندے آگئے اور انہوں نے وہ مطالبات تحریری طور پر پیش کر دیئے۔

1) قادیانیوں کے غیر مسلم ہونے کا آرڈیننس:

ان تین مطالبات میں سے ایک یہ ہے کہ "قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا دستوری فیصلہ ختم کیا جائے اور ان کو مسلمان تسلیم کریں"۔ اس کو ہماری حکومت نے عملاً تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے، چونکہ ایک ہی جگہ تھی جہاں مسلمان اور قادیانی الگ الگ درج ہوتے تھے یعنی "ووٹروں کی فہرست" اب وہاں مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز ختم کر کے اور مسلم ووٹروں کے لئے "ختم نبوۃ کا حلف نامہ" ختم کر کے ہم نے یہ مطالبہ عملاً مان لیا ہے۔ اس وقت پاکستان کے سرکاری ریکارڈ میں 10 اپریل کے بعد سے قادیانیوں اور مسلمانوں کے درمیان فرق کی کوئی چیز نہیں رہی۔ اسی وجہ سے اب تک ہزاروں قادیانیوں نے اپنے نام مسلم ووٹرز کی فہرست میں درج کروا دیئے ہیں اور اب بہت سے قادیانی کئی حلقوں سے "مسلمان امیدوار" کی حیثیت سے الیکشن لڑنے کی تیاری کر رہے ہیں۔

2) توہین رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آرڈیننس:

"توہین رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر موت کی سزا کا قانون ختم کیا جائے۔" حالانکہ یہ قانون اور فیصلہ تو خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نافذ فرمودہ قانون ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "گستاخانِ رسول" کو حکماً قتل کروایا۔ درجنوں واقعات ہیں، اب تفصیل کا وقت نہیں، صرف ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

فتح مکہ کے موقعہ پر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر ایک کے لئے معافی کا اعلان کر دیا۔ بڑے بڑے کافروں کے لئے بھی معافی کا اعلان فرمایا لیکن تین چار "گستاخانِ رسول" کے بارے میں فرمایا: "اگر یہ خانہ کعبہ کے غلاف کو پکڑے ہوئے ملیں تو ان کو وہاں بھی قتل کر دو۔" چنانچہ عبداللہ بن خطل خانہ کعبہ کے غلاف کے پیچھے چھپا ہوا تھا اسے وہیں قتل کر دیا گیا، کیونکہ گستاخِ رسول کے لئے رعایت کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ ہے کہ گستاخِ رسول کی سزا صرف اور صرف قتل ہے، مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ "آزادیٔ رائے" اور "انسانی حقوق" کے خلاف اور منافی ہے لہٰذا اس قانون کو ختم کرو۔

3) حدود آرڈیننس:

چور کا ہاتھ کاٹنا، زانی کو سنگسار کرنا یا کوڑے مارنا، شرابی کو کوڑے مارنا، جھوٹی تہمت لگانے والے کو کوڑے لگانا، ڈاکو کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر سولی پر لٹکانا یہ سب حدود ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اب مطالبہ یہ ہے کہ یہ شرعی حدود ختم کرو، تاکہ یہ تمام برائیاں عام ہو جائیں۔ کوہاٹ کی ایک عدالت نے زنا ثابت ہونے پر ایک عورت کو سنگساری کی سزا سنا دی ہے۔ اس پر پوری این جی اوز حرکت میں آگئی ہیں اور پورے ملک میں کہرام مچ گیا ہے۔ وہ این جی اوز اور انسانی حقوق کے ادارے جن کو افغانستان پر برستے ہوئے امریکہ کے خوفناک بم نظر نہیں آئے، افغانستان کے مظلوم مسلمانوں اور نہتے شہریوں کے گوشت کے اڑتے ہوئے چیتھڑے نظر نہیں آئے اور ان کو افغانستان کے پچاس ہزار شہریوں کا ناحق قتل نظر نہیں آیا، ادھر وہ کوہاٹ کی ایک عورت کو سنگسار ہونے سے بچانے کے لئے بے چین ہیں۔ نہ معلوم کہ

یہ عورت سنگسار ہو گی بھی یا نہیں، مگر این جی اوز متحرک ہوئیں۔ ملک میں مظاہرے ہوئے، بین الاقوامی پریس (میڈیا) حرکت میں آیا اور ہمارے صدر محترم نے اعلان کر دیا کہ جناب! سزا نہیں دیں گے۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت آپ کا بنیادی ڈھانچہ خطرے میں ہے۔ آج کتاب اللہ کے فیصلے، سنت رسول ﷺ کے فیصلے اور اجتہاد خطرے میں ہے۔

سود پر ایک طویل عرصے کی جنگ کے بعد "سپریم کورٹ آف پاکستان" نے آخری فیصلہ صادر کیا تھا کہ "ملک میں سودی قوانین کو ختم کیا جائے"۔ اب اس فیصلہ کو دوبارہ "نظر ثانی" کے لئے سپریم کورٹ میں لایا جا رہا ہے اور اس بنیاد پر کہ جس کو سپریم کورٹ کے فیصلے میں "سود" قرار دیا جا رہا ہے، یہ سود نہیں ہے۔ یہ مولوی خواہ مخواہ ضد کرتے ہیں، "یہ تو تجارت کی قسمیں ہیں۔" خلاصہ یہ کہ سود کو جائز قرار دینے کا فیصلہ ہو چکا ہے اس لئے یہ کام ہو رہا ہے۔

4) پارلیمنٹ کو اجتہاد کا اختیار دیا جائے:

آج کل ایک اور مطالبہ بھی چل رہا ہے کہ اجتہاد کی ضرورت ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ اجتہاد کون کرے؟ تو کہتے ہیں کہ مولویوں کو تو اجتہاد کرنا آتا ہی نہیں، لہٰذا اجتہاد پارلیمنٹ کا حق ہے۔

جنرل ضیاء الحق (مرحوم) کے دور میں "شریعت بل" پر بحث چل رہی تھی تو ہمارے مذاکرات بھی ہو رہے تھے۔ اس وقت کے "وزیر قانون" وسیم سجاد صاحب تھے اور "مذہبی امور" کے وزیر جناب اقبال احمد خان (مرحوم) تھے۔ انہوں نے کہا کہ بات یہ ہے کہ ہم آپ کا "شریعت بل" سارا منظور کر لیتے ہیں۔ قرآن وسنت کی بالادستی بھی ہم قبول کرنے کو تیار ہیں مگر ایک بات آپ مان لیں کہ "قرآن وسنت کی تشریح کا حق پارلیمنٹ کو دے دیں۔" یعنی جو کام حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، حضرت حسن بصریؒ وغیرہ کے درجے کے لوگ کرتے تھے اب وہ کام ہمارے (گوجرانولہ کے)

حاجی غلام دستگیر صاحب اور آپ کے (ملتان کے) حاجی بوٹا صاحب کریں گے۔ یعنی ائمہ اربعہؒ اور حضرات مجتہدینؒ کی صف میں ان جیسے لوگ بھی کھڑے ہوں گے، لہٰذا پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دے دو۔

اسی زمانے میں ''نوائے وقت فورم'' میں کسی نے سوال کیا کہ مولوی صاحب! کیا آپ پارلیمنٹ کو اجتہاد کرنے کا حق دینے کو تیار ہیں؟ میں نے کہا کہ میں تیار ہوں۔ (لوگ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے کہ مولوی کیا کرتا ہے، جیسا کہ آپ بھی حیران ہوں گے) میں پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے کو تیار ہوں، مگر ایک شرط کے ساتھ، اور وہ یہ ہے کہ ''اجتہاد کی اہلیت کی جو شرائط ہیں کہ ان شرائط کا حامل آدمی اجتہاد کرسکتا ہے۔'' وہ شرائط ''الیکشن رولز'' میں ترمیم کر کے ایم-این-اے بننے کے لئے لازمی قرار دے دو کہ ان شرائط کا حامل آدمی اسمبلی کا رکن منتخب ہوسکتا ہے۔ اگر آپ یہ تسلیم کرلیں تو پھر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مزید یہ کہ اجتہاد کی اہلیت کی شرائط بھی میں طے نہیں کرتا بلکہ تم سپریم کورٹ سے طے کروالو، اور سپریم کورٹ آف پاکستان اجتہاد کی جو شرائط طے کرے وہ شرطیں الیکشن رولز میں ترمیم کر کے سینیٹر اور ایم-این-اے کے لئے لازمی قرار دے دو اور پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دے دو۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو مشکل اور ناممکن ہے۔ میں نے کہا جس پارلیمنٹ کے ممبر کے لئے سورۃ فاتحہ کا ترجمہ جاننا ضروری نہیں اس پارلیمنٹ کو اجتہاد اور دین کی تعبیر وتشریح کا حق دے دیا جائے تو پھر کیا ہوگا؟ اس پر میں نے ایک واقعہ بھی سنا دیا۔

واقعہ:

مولانا رومؒ نے مثنوی میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک زمانے میں ایک صاحب نے کسی دوست خوش نویس سے کہا کہ مجھے قرآن پاک کا نسخہ (قلم سے) لکھ دو، اور کہا کہ ذرا دھیان سے لکھنا کہ کہیں غلطی نہ ہو۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، دھیان سے لکھوں گا۔ امید ہے

غلطی نہ ہوگی۔ پانچ چھ ماہ گزرے تو اس نے قرآنِ پاک لکھ کر دے دیا۔ پوچھا کہ توجہ سے لکھا ہے ناں! اور غلطی تو نہیں ہوگی؟ اس کاتب نے کہا کہ ہاں توجہ سے لکھا ہے، بس دو تین جگہ غلطیاں تھیں وہ میں نے ٹھیک کر دی ہیں۔ اس نے پوچھا کہ وہ کون سی غلطیاں تھیں؟ اس نے کہا کہ جس قرآن کو دیکھ کر میں لکھ رہا تھا ناں! اس میں لکھا تھا

1) فَعَصىٰ اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوىٰ حالانکہ عصا تو موسیٰ علیہ السلام کا تھا نہ کہ آدم علیہ السلام کا۔ (حالانکہ عصیٰ کا معنی اور ہے اور عصا جو موسیٰ علیہ السلام کا تھا وہ اور ہے) لہٰذا میں نے یہ غلطی درست کر دی اور لکھ دیا فَعَصىٰ مُوسىٰ الخ۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

2) ایک غلطی اور بھی درست کی۔ وہ اس طرح کہ قرآن میں لکھا تھا: وَلَقَدْ نَادَانَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ... نَادَانَا (ہمیں پکارا) نوح علیہ السلام تو پیغمبر تھے، کیا پیغمبر بھی "نادان" ہوتا ہے، وہ تو "دانا" ہوتا ہے لہٰذا میں نے یہ بھی صحیح کر دیا ہے اور لکھا "وَلَقَدْ دَانَانُوْحٌ" (حالانکہ نَادَانَا اور لفظ ہے اور دَانَا اور ہے)

3) ایک غلطی اور بھی تھی۔ قرآن میں لکھا تھا: "فَخَرَّ مُوسىٰ صَعِقًا" (کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے) حالانکہ "خر" (گدھا) تو موسیٰ علیہ السلام کا نہیں تھا بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تھا۔ اس لئے میں نے یہ ٹھیک کر دیا۔ "فَخَرَّ عِيْسىٰ"

4) اس نے کاتب سے پوچھا کہ کوئی اور غلطی بھی تھی؟ اس نے کہا کہ یار! ایک غلطی اور بھی تھی، مجھے بہت شرم آئی مگر وہ بھی میں نے صحیح کر ہی دی۔ اس نے کہا کہ قرآنِ پاک میں جگہ جگہ فرعون اور شیطان کا نام لکھا تھا۔ بھائی! ان کا قرآن میں کیا کام ہے؟ اور پھر یہ نام ہم نماز میں پڑھیں؟ (حالانکہ قرآن میں یہ نام موجود ہیں اور نماز میں بھی یہ نام تلاوۃً پڑھے جاتے ہیں اور ان ناموں پر بھی ہر حرف پر ایک سو نیکی ملتی ہے) میں نے ساری جگہ یہ نام بدل دیئے۔ کہیں تو تمہارے باپ کا نام لکھ دیا اور کہیں اپنے باپ کا نام لکھ دیا۔

یہ واقعہ سنا کر میں نے کہا بھائی! پھر پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دے دو، البتہ نام بتا دو

کہ کس کس کے لکھے جائیں گے۔

خیر! میں عرض یہ کر رہا تھا کہ آج کے عمومی ماحول کے تناظر میں جہاں ”وحدتِ امت کے درس“ کی ضرورت ہے، جہاں اجتہاد کی تلقین کی ضرورت ہے، وہاں امت کو یہ بتانے کی بھی (سخت) ضرورت ہے کہ قرآنِ پاک، سنتِ رسول ﷺ، اجماع اور اجتہاد کے فیصلے جو فقہاء نے کئے اور تسلسل کے ساتھ چلے آرہے ہیں، ان فیصلوں کو آج (دنیا میں) کیا خطرات درپیش ہیں اور آج کی دنیا ان کو کس نظر سے دیکھ رہی ہے اور ہم نے جو تھوڑی بہت کمائی پچاس سال میں جمع کی تھی (اسلامی دستور، حدود آرڈیننس، قادیانیت کا مسئلہ، توہین رسالت کا قانون وغیرہ) کی موجودہ چند دفعات ہمارے علمائے دیوبند کی پچاس سال کی محنت کا نتیجہ ہیں۔

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ سے لے کر حضرت مولانا مفتی محمود ؒ تک جملہ اکابر کی کمائی ہے۔ آج اس پر ”ڈاکہ“ ڈالا جا رہا ہے اور طے ہو چکا ہے کہ آپ کی یہ ”کمائی“ لوٹ کر ملک کو ”سیکولر اسٹیٹ“ بنایا جائے گا۔

اس لئے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ہم آج ”تحفظِ سنت کانفرنس“ کے عنوان سے جمع ہیں۔ ہمیں، علماء کرام کو، دینی جماعتوں اور دینی افراد کو اس سنگین مسئلہ اور سنگین صورت حال پر خصوصی توجہ دے کر اپنا فرض ادا کرنا چاہئے اور اس کے لئے جو قربانی بھی ممکن ہو ضرور کرنی چاہئے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے اور خدا اس ”روزِ بد“ سے بچائے کہ ہم اپنے اس ملک عزیز میں اپنے اکابر کی پچاس سالہ کمائی اور اس کے نتائج سے محروم ہو جائیں، آمین یارب العالمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(بشکریہ: ناظم ماہنامہ الخیر ملتان)

لائبریری
الشریعہ اکادمی
۳۸۰۷

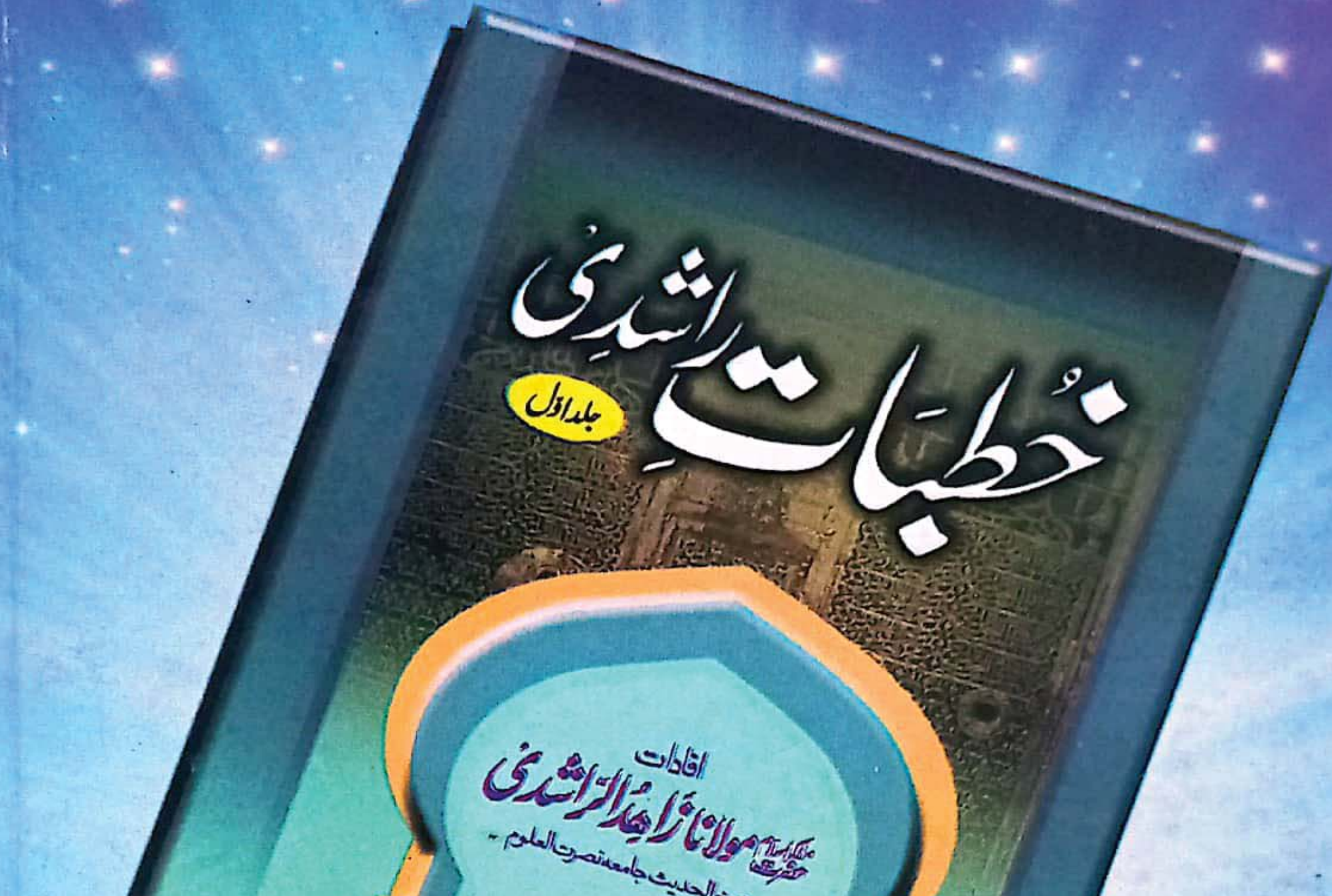

اسٹاکسٹ

انجمن خدام الاسلام رجسٹرڈ حنفیہ قادریہ

285۔ جی ٹی روڈ، باغبانپورہ، لاہور

042-6862816, 0300-9496702